جالب بیتی
حبیب جالب

طاہر اصغر

جالب بیتی کے اوراق

برصغیر کی تقسیم سے قبل اردو شعروادب میں سب سے نمایاں اور توانا کردار ایک ایسے ''آوارہ'' کا ملتا ہے جو عملی زندگی میں ان تمام اقدار اور رویوں کے خلاف بغاوت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جو اس کے آدرشوں اور خوابوں کی تکمیل میں رکاوٹ ثابت ہوتے تھے۔ یہ آدرش ''نئی دنیا'' کا خواب تھا اور غلامی کا جوا اتار کر آزادی کی تمام مسرتوں سے فیض یاب ہونے کی آرزو تھی۔ مجاز' جذبی' مخدوم محی الدین' علی سردار جعفری' کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی کی شاعری میں یہ ''آوارہ'' منفرد انداز و اسلوب کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ افسانے کی دنیا میں بھی یہی ''آوارہ'' متحرک ہے۔ یہ ''آوارہ گرد'' فٹ پاتھوں' سیوریج پائپوں' کٹڑوں' کھولیوں اور چالوں (نشیبی علاقوں کی بستیاں) میں بسنے والے انسانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے ہوئے دیکھتا ہے' ان کے درمیان جا کر زندگی گزارتا ہے اور پھر حیرت سے ان محلوں' چوباروں اور عالی شان بنگلوں کے خوشحال انسانوں کی پرآسائش زندگی کو بھی دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ تضاد نا قابل فہم ہونے کے ساتھ ساتھ نا قابل قبول ہے' مٹھی بھر لوگوں کی خوشیاں' ان کی لوٹ کھسوٹ' ناانصافی اور ظلم و جبر اس آوارہ کو بغاوت پر اکساتے ہیں اور ''نئی دنیا'' کا خواب دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ دنیا جس میں انسانوں کے درمیان کوئی فرق نہ رہے' محبت کے لیے کوئی شرط نہ ہو' زندگی کے لیے بار بار مرنا نہ پڑے اور روٹی کے لیے بھیک نہ مانگنی پڑے۔ اردو شعروادب کا یہ ''آوارہ'' اس نئی دنیا کی تلاش کے سفر پر نکلا اور پرانی اقدار کو مٹاتا ہوا نئی اقدار کو تشکیل کرتا چلا گیا۔ حبیب جالب نے جب ''برگ آوارہ'' کی پہلی غزل لکھی تو ۱۹۳۶ء کی تحریک اپنا سفر طے کر چکی تھی۔ حبیب جالب کے پہلے شعری مجموعہ ''برگ آوارہ'' کا ''آوارہ'' بھی اپنے منفرد انداز و اسلوب کے ساتھ اسی نئی دنیا کی جستجو میں ہے۔ جس کا خواب ان کے پیش رووں نے دیکھا تھا۔

حبیب جالب کی ''آوارگی'' میں تلاش' امید اور جستجو کا جذبہ کارفرما ہے' جبکہ ان کے عشق میں نشاط کم' غم و اداسی اور حسرت و یاس کی گہری فضا ہے لیکن عشق میں ناکامی اور جی کی اداسی کے باوجود' مہربان راہوں کو چھوڑ آنے کی باوقار خو بھی موجود ہے۔ عشق میں اپنی انا اور وقار کو قائم رکھنے کا جذبہ جالب کی شاعری میں جا بجا ہے۔ وہ تمام تر دکھ چپ چاپ اور خاموشی سے سہنے کی روایت پر کاربند ہیں۔

عشق پر نادم ہونا' ہجر میں جی کے زیاں اور خود کو نہیں کھونا چاہتے ہیں۔ محبوب کی یادوں سے لو لگا کر اس کی راہ گزر کو یاد کرنا شیوۂ عشق ہے۔ جالب کا عشق محبوب سے وصال کے نشاط انگیز لمحوں سے باز یاب ہوتا دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اسی لیے ان کی رومانی شاعری میں ناکامی' غم اور یاد ہے' نشاط نہیں ہے۔ جالب کی رومانی شاعری سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ ایسے سماج میں جہاں انسان کی حیثیت کا تعین روپے پیسے ہوتا ہے وہاں کامیاب عشق مفلس عاشق کے لیے بہت دشوار ہوتا ہے۔ وہ سماج جو محبت کو بھی ذاتوں پاتوں' اعلیٰ جاہ و منصب اور دولت کے ترازو میں تولے وہاں عشق قدر نہیں بن سکتا۔ جالب ایک ایسا شاعر تھا جو سچے اور اعلیٰ انسانی جذبوں کا خوگر تھا اس لیے اس کا عشق بھی باوقار تھا۔ اس نے محبت کو تفریح نہیں سمجھا اور نہ ہی اس صداقت کو کسی کھیل کا حصہ بننے دیا اگر چہ اسے اس بات کا ملال ہے کہ وہ جس کے لیے چاندنی راتوں میں شعر کہتا ہے اس کی زلفوں کے سائے میں کوئی غیر سوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے عشق سے حاصل تمام دکھ اور درد سہہ جانے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ حبیب جالب کی رومانی شاعری میں ایک ایسا ہی عاشق دکھائی دیتا ہے اس لیے اس کا عشق بجائے خود ایک قدر بن جاتا ہے۔ وہ محبوب سے جدا ہو کر بھی زندگی کے حرکی عمل سے اپنا ناطہ نہیں توڑتا بلکہ اس آتش نہاں سے کئی چراغ روشن کرتا ہے اور جن کی تابناک روشنی میں ایک جہان معنی سامنے آتا ہے۔

''برگ آوارہ'' کا رومانی شاعر حبیب جالب علامت و استعارے کو تج کر شعر کو ہتھیار بنانے پر اس وقت آمادہ ہوا جب اس نے سیاست کی خارزار میں پہلا قدم رکھا تھا۔ یہ پہلی قیمت تھی جو حبیب جالب نے چکائی۔ حبیب جالب کے جسم و جاں اور ادبی مرتبے کے لیے یہ سودا بے حد مہنگا ثابت ہوا۔ لیکن جالب نے شعوری طور پر اپنا ناطہ لوگوں سے جوڑنے کا فیصلہ کیا تھا' وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ گل و بلبل اور صید و صیاد کی شاعری کر کے وہ بے حد محفوظ اور آسان زندگی گزار سکتے ہیں' جس میں وہ اور ان کا کنبہ کم از کم پولیس کے چھاپوں' تنگ دستی اور بدحالی' قید و بند کی صعوبتوں اور طویل مقدمات کے دوران سہنے والے عذابوں سے بچ جاتے۔ حکومت کے کسی ابلاغی ادارے میں معقول مشاہرے پر ان کی اچھی طرح گزر بسر ہو سکتی تھی۔ ان کی اولاد کا مستقبل بھی روشن ہوتا اور وہ اعلیٰ تعلیم سے ضرور بہرہ مند ہو جاتے لیکن حبیب جالب نے آسان زندگی کو چھوڑ کر اپنے ساتھ اپنے کنبے کو بھی کٹھن خطرات سے پر راہ پر ڈال دیا۔ جالب کی یہ قربانی ان کروڑوں خاموش انسانوں کے لیے سودمند ثابت ہوئی' جو بار بار کی آمریت سے کچلے جاتے تھے۔ جالب کے اشعار فنون' سویرا' نقوش' ادب لطیف' اوراق' سیپ' افکار اور ماہ نو میں تو نہ چھپ سکے کہ ان جرائد کے ایڈیٹرز کے نزدیک ادبی تقاضوں پر پورا نہ اترتے تھے اسی طرح عمر بھر ان پر ریڈیو اور ٹیلیویژن کے دروازے بھی بند رہے۔ جالب کا شعر لاکھوں کے جلسے میں سنا جاتا اور عام آدمی کے ذہن پر انمٹ نقوش کی طرح چھپ جاتا تھا۔ کسی ایک لمحے کی تمام تر سنگینی کے بارے

میں دوٹوک اور آسان زبان میں اپنا ردعمل شعروں میں سمونے والے جالب کی مترنم آواز کا فسوں ایک دل سے دوسرے دل میں بجلی کی سرعت سے سفر کرتا تھا۔ جہاں ان کی آواز لاکھوں دلوں کو گرماتی وہاں آمروں اور جمہوریت دشمن عناصر کے لیے پیام مرگ بھی ثابت ہوتی رہی ہے۔ آمروں کا وہ جھوٹ جسے خوبصورت بتانے کے لیے اداروں اور مخصوص افراد کا تعاون حاصل کیا جاتا تھا اور کروڑوں روپے خرچ ہوتے تھے‘اس کی بدصورتی جالب کے اشعار میں برسرعام بے نقاب ہوتی تھی۔

پھول شاخوں پہ کھلنے لگے‘ تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے‘ تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے‘ تم کہو
اس کھلے جھوٹ کو‘ ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا‘ میں نہیں جانتا

حبیب جالب کے سیاسی افق پر نمودار ہونے کا زمانہ وہ تھا جب پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگ چکی تھی۔ بیشتر ’’ترقی پسند‘‘ اپنی اپنی راہ پر گامزن ہو چکے تھے یا ’’نئی ترقی پسندی‘‘ کی بنیاد ڈالنے میں مشغول تھے۔ حبیب جالب اپنی ذات میں آپ ہی تحریک بن گئے تھے۔ انہوں نے سیاست میں بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں بدلتی ہوئی وابستگیوں سے خود کو وابستہ نہیں کیا‘ اس لیے ان کی شاعری کے لیے کوئی بھی سیاسی پلیٹ فارم مجبوری نہ بن سکا‘ حبیب جالب نے اپنے طبقے کے حقوق کے لیے عملی طور پر اپنا رول ادا کرنے کا عہد کیا تھا۔ اس لیے وہ تنہا اس جنگ میں شریک تھے۔ ان کا ہمنوا صرف ان کا طبقہ ہی تھا اور یہ طبقہ پاکستان کی ۸۰ فیصد آبادی پر مشتمل ہے۔ حبیب جالب کی آواز اسی طبقے کی نمائندہ آواز تھی جسے امریکی سامراج کے ہاتھوں گروی رکھنے والے کاسہ لیس۔ حکمرانوں اور فوجی آمروں نے تختۂ مشق بنایا ہے۔ جمہوریت اور مذہب کی آڑ میں سرمایہ دار اور جاگیردار ٹولہ عوام کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتا رہا اور جالب اس خون آشام ٹولے کو تسلسل کے ساتھ للکارتے رہے ہیں۔ مختلف ادوار میں مجموعی طور پر ساڑھے سات سال قید و بند کی سزائیں اور جالب کی براہ راست شاعری سے بے نقاب ہونے والے پاکستان کے حکمرانوں کا پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کے ہاتھوں جالب پر تارچر بھی حبیب جالب کو حرف صداقت لکھنے سے باز نہ رکھ سکا۔

اور سب بھول گئے حرف صداقت لکھنا
رہ گیا کام ہمارا ہی بغاوت لکھنا

کھیت وڈیروں سے لے لو

ملیں لٹیروں سے لے لو

ملک اندھیروں سے لے لو

رہے نہ کوئی عالی جاہ

پاکستان کا مطلب کیا

لا الہ الا اللہ . . . .

یہ آواز محروم طبقات کی ترجمان آواز تھی۔ ان لوگوں کی آسوں اور پیاسوں کی نمائندہ آواز تھی جن کے حقوق چھین کر مراعات یافتہ طبقے اپنے عشرت کدے آباد کرتے ہیں۔ حبیب جالب اس کھلے جھوٹ کو ذہنوں کی لوٹ کو تسلسل کے ساتھ بے نقاب کرتے رہے ہیں۔ وہ کام جو سیاسی جماعتوں اور سیاسی اکابرین کی ذمہ داری ہوتا ہے اسے ایک شاعر نے تنہا کچھ اس طور سے انجام دیا ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی ان کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آئی اور نہ ہی ان کے فکر و عمل میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی' حبیب جالب نے اس جدوجہد میں اپنی قیمت نہیں لگوائی بلکہ بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ ہر دور میں لاکھوں کی پیش کشوں کے عوض اپنی راہ سے انحراف کی ترغیب کو ٹھکرا دینے والے حبیب جالب کروڑوں انسانوں کے دلوں میں بے پناہ عزت و احترام کا درجہ پا گئے ہیں۔ جب جب عوام کچلے اور ٹھکرائے گئے تب تب ان کی نظریں حبیب جالب کی جانب اٹھیں اور جالب ہر بار ان بے زبان نظروں کی زبان بن گئے۔

بولنے پہ پابندی سوچنے پہ تعزیریں

پاؤں میں غلامی کی آج بھی ہیں زنجیریں

آج حرف آخر ہے بات چند لوگوں کی

اٹھ کے درد مندوں کے صبح و شام بدلو بھی

دوستوں کو پہچانو دشمنوں کو پہچانو

حبیب جالب نے اپنی عوامی شاعری کے ذریعے ہر لمحہ غریب سے غریب تر ہونے والے کروڑوں انسانوں کو سیاسی و سماجی شعور دیا ہے جنہیں بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر کے انہیں تقدیر پرستی میں الجھا دیا گیا۔ خدا فروش استحصالی ٹولہ ان بے زبان اور بے

شعور لوگوں سے علاج، تعلیم اور روزگار کا حق چھین کر صبر واطاعت کی تلقین کرتا ہے جبکہ خود پاکستان کے وسائل کے دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں مصروف ہے۔ جالب نے اپنی عوامی شاعری کے ذریعے ان خاموش انسانوں کے شعور کو بار بار جھنجھوڑا ہے۔

خاک ایسے جینے پر
یہ جینا بھی کوئی جینا ہے

حبیب جالب نے اپنی کلیات ''حرف سردار'' میں لکھا ہے کہ ''بچپن ہی سے بزرگوں سے سنتا چلا آیا ہوں کہ اے خدا ایمان کے ساتھ قبر میں اتار۔ اس کا مطلب اب سمجھ میں آیا کہ مرتے دم تک لوگوں سے پیمان وفا باندھے رکھنے والے شاعر کو ہی عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔'' حبیب جالب نے مرتے دم تک لوگوں سے پیمان وفا کچھ اس طور سے باندھے رکھا کہ وہ اپنی استقامت، جرات اظہار اور ''عوامی شاعر'' کے لافانی اعزاز کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔

''جالب بیتی'' تیس کیسٹوں پر مشتمل ریکارڈنگ ہے جسے کتابی شکل دینے میں کئی مراحل سے گزرنا پڑا۔ ٹرانس کرپشن، ایڈیٹنگ، ابواب اور ان کے ذیلی ابواب کی تقسیم کے بعد ہی موجودہ صورت سامنے آسکی ہے۔ جالب صاحب ایک طویل عرصے سے علیل تھے۔ سانس کی شدید تکلیف کے باوجود انہوں نے بمشکل تمام یہ آپ بیتی ریکارڈ کروائی تھی۔ ترتیب وار واقعات کی باقاعدہ منصوبہ بندی ان کے پیش نظر نہ تھی اور نہ ہی یہ جبر ان کا مزاج برداشت کر سکتا تھا۔ بعض اوقات آمریت کے کسی ایک دور میں ہونے والے ظلم وستم کی روداد بیان کرتے ہوئے انہیں اس سے پچھلے دور آمریت کا کوئی واقعہ یاد آجاتا تھا۔ اس طرح فلم یا ادب کی کسی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کسی سیاسی شخصیت کا احوال سنانا شروع کر دیتے تھے۔ ''جالب بیتی'' لکھتے ہوئے ان واقعات کو مختلف ادوار کے تحت ترتیب دینا پڑا اور پھر علیحدہ علیحدہ ابواب کی تقسیم کے لیے ان سے متعلقہ واقعات کی چھان پھٹک کرتے ہوئے تیس کیسٹوں کو کئی بار سنا گیا۔ یوں ''جالب بیتی'' مکمل ہوئی مگر افسوس کہ اس آپ بیتی کا سنانے والا ہمارے درمیان موجود نہیں ہے۔ ''جالب بیتی'' لکھتے ہوئے جالب صاحب کے لہجے کو بھی برقرار رکھنے کی ضرورت تھی کیونکہ شوکت الفاظ سے وہ تاثر ہی ختم ہو جاتا جو جالب صاحب کی سوچ کا آئینہ دار تھا۔ اس لیے ''جالب بیتی'' جالب ہی کے لفظوں میں بیان ہوئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس آپ بیتی کا اسلوب گفتگو جیسا ہے۔ ''جالب بیتی'' کی ابتدائی بیس کیسٹیں معروف صحافی اور جالب صاحب کے دیرینہ رفیق محترم نثار عثمانی کے گھر ریکارڈ کی گئیں۔ عثمانی صاحب اور ان کے بیٹے عدنان نے حسب روایت بڑے خلوص کے ساتھ کئی دنوں تک میزبانی کے فرائض ادا کیے تھے بلکہ پورا گھر ہی ہمارے حوالے کرتے ہوئے گھر کی چابی ہمیں دے دی تھی۔

عزیز صاحب نیپ کے زمانے میں جالب صاحب کے ساتھی تھے ان کے گھر واقع گڑھی شاہو میں آخری دس کیسٹیں ریکارڈ کی گئیں۔ عزیز صاحب نے بھی بے حد مہمان نوازی کی تھی۔ جنگ پبلشرز کے احسان بزمی اس تمام ریکارڈنگ کے دوران موجود رہے۔ آخری کیسٹ کی ریکارڈنگ کے وقت جالب صاحب کی خصوصی دعوت پر انچارج جنگ پبلشرز جناب مظفر محمد علی اور حامد میر بھی خصوصی طور پر تشریف لائے تھے۔ وہ ایک یادگار دن تھا۔ جالب صاحب بہت خوش تھے کہ ہم اہم کام مکمل ہوا۔ جناب مظفر محمد علی نے ہی اس آپ بیتی کا نام ''جالب بیتی'' تجویز کیا (جسے جالب صاحب نے بے حد پسند کیا تھا) اور جناب اسد مفتی کی کیمرے سے بنائی گئی ایک تصویر کو اس کتاب کے ٹائٹل اور بیک ٹائٹل پر جدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مظفر صاحب نے ''جالب بیتی'' سے پہلے ''جالب نامہ'' ترتیب کروایا اور جنگ پبلشرز کے تحت شائع کیا تھا۔ بعدازاں جالب صاحب سے اپنی آپ بیتی ریکارڈ کروانے کے لیے کہا مگر وہ ٹالتے رہے۔ بالآخر بار بار اصرار کے بعد انہوں نے اپنی علالت کے دوران ہی یہ آپ بیتی ریکارڈ کروانا شروع کی تھی۔ اس طرح ایک بڑے آدمی کی اس عظیم جدوجہد کو محفوظ کرلیا گیا جس میں پاکستان کی سیاسی تاریخ' ادبی اور ثقافتی شخصیات کا احوال اپنی تفصیلات کے ساتھ موجود ہے' وگرنہ یہ داستاں ہمیشہ کے لیے جالب صاحب کے ساتھ ہی دفن ہو جاتی اور عوام کے لیے دکھ اور مصائب اٹھانے والے اس بڑے آدمی کی آپ بیتی سے عوام محروم رہتے۔ ''جالب بیتی'' ایک آدمی کی آپ بیتی ہی نہیں ہے بلکہ یہ عوامی جدوجہد کی سچی داستاں ہے جس کا ہر لفظ اس شخص کی زباں سے ادا ہوا ہے جو خود سچ کی علامت تھا اور جس کی جرات گفتار حرف صداقت کو معتبر کرتی رہی ہے۔

◆◆◆

داستاں چھوڑ آئے

ہمارا گاؤں میانی افغاناں ضلع ہوشیار پور ہے جسے دوآبہ بہشت کا گلابہ بھی کہتے تھے۔میانی افغاناں دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے۔یہ سرسبز وشاداب علاقہ جہاں ندیاں نالے نہریں بہتی تھیں۔یہ باغوں اور گلزاروں کا علاقہ ہمشد پٹھانوں کی ملکیت تھا۔یہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کے زمانے کا ذکر ہے جسے ہندو مسلم اتحاد کے زمانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ہولی دیوالی' عید میلاد النبی ہر ایک تہوار مل جل کر بڑی شان وشوکت سے مناتے تھے۔

میرے والد محترم صوفی عنایت اللہ صاحب کو پڑھنے لکھنے سے از حد دلچسپی تھی' اپنے ذاتی مشاہدات' تجربات' بزرگان دین کے قصے اور خاندان کے بارے میں ان کے قلمی نسخے سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں۔ان کی ایک کتاب ''گلہائے عقیدت'' کے نام سے شائع بھی ہو چکی ہے۔اسی کتاب میں والد محترم نے لکھا ہے کہ

''مجھے (میرے والد صوفی عنایت اللہ) بچپن سے تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔میں وقت کی ناسازگاری کے باعث تعلیم حاصل نہیں کر سکا لیکن عمر بھر اردو لکھتا پڑھتا رہا ہوں۔مجھے شاعری کا بھی شوق تھا۔اردو پنجابی میں بہت کچھ لکھتا رہا ہوں۔دل تو بلندیوں کی سیر کرتا ہے مگر طاقت پرواز خدا کے ہاتھ ہے۔خدا بھی بڑا بے نیاز ہے۔جس نے اپنی رحمت سے میرے ذوق وشوق کی تکمیل ایک دوسری شکل میں فرما دی یعنی میرے دونوں لڑکے شاعر ہوئے۔بڑا لڑکا مشتاق حسین مبارک محکمہ اطلاعات ونشریات مرکزی حکومت پاکستان کراچی میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا اور عمدہ شاعر بھی تھا۔جس کی پیدائش ۱۰ جنوری ۱۹۲۱ء ہے۔چھوٹا لڑکا حبیب احمد جالب جس کی پیدائش ۱۹۲۸ء کی ہے اور مشہور شاعر ہے' لاہور مقیم ہے۔خداوند کریم اس کی عمر دراز کرے اور ہر مصیبت سے محفوظ رکھے...... آمین''

والد محترم نے میری والدہ کی اپنے بچوں سے محبت کے بارے میں لکھا ہے۔

''ہر ماں اپنے ننھے بچے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔خود دکھ سہتی ہے مگر اپنے نور نظر کو آرام پہنچاتی ہے۔ماں جب اپنے بچے کو لوری دیتی ہے تو زمانے بھر کے خطابات بخش دیتی ہے۔عرش کا تارا کہتی ہے۔ملک کا حکمران کہتی ہے۔ماں غریب ہو' امیر ہو مگر اپنے بچے کو زمانے بھر کے بلند مقامات پر فائز کر دیتی ہے۔خدائے تعالیٰ بھی بڑا بے نیاز ہے وہ ماں کی محبت بھری لوری کو

سن کر اپنے لطف وکرم سے سب کچھ قبول فرما لیتا ہے۔ والدہ مشتاق حسین بھی ایک ماتا بھرا دل رکھتی تھی۔ اس نے بھی بچپن میں مشتاق حسین کو بڑے بڑے خطاب بخش دیئے۔ ''میرا مشتاق عرش کا تارا ہے' میرا مشتاق دلی کا شہزادہ ہے' میرا مشتاق وائسرائے کے دفتر کا افسر ہے' میرا مشتاق بابو جی ہے۔ اے لو' میرے مشتاق کی بھوں بھوں کرتی ہوئی کار آگئی۔ اے لو اب کار دفتر پہنچ گئی۔ کار سے اتر کے بابو مشتاق حسین دفتر جا رہے ہیں' چپڑاسی جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں۔'' یہ شیخ چلی نما لوری سن سن کر گاؤں کی عورتیں بہت ہنسا کرتی تھیں۔ لیکن بیگم غلام سرور خان صاحبہ اس کی ممتا بھری لوری سن کر بہت متاثر اور خوش ہوتی تھی۔ بیگم غلام سرور خان کو والدہ مشتاق سے دلی ہمدردی تھی اور وہ اسے بہنوں کی طرح پیار کرتی تھیں اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ جب مشتاق میٹرک کر لے گا تو وہ اسے دہلی وائسرائے کے دفتر میں ملازم کروا دے گی۔ مشتاق حسین کو انہوں نے بیٹا بنا رکھا تھا۔''

کچے آنگن کا گھر

میرے شعور نے جب ذرا آنکھ کھولی تو میں ایک کچے گھر میں تھا۔ میرے ارد گرد غربت اور افلاس کی فضا تھی۔ وہ کچا مکان جو بارشوں میں اکثر ٹپکتا رہتا تھا۔ میری والدہ اس کی لیپا پوتی میں لگی رہتی تھیں۔ وہ مکان میری نانی کا تھا جو اس نے ہمیں دے رکھا تھا۔ میرے دادا میرے والد اور والدہ سے ناراض تھے یا کیا وجہ تھی کہ وہ انہیں اپنے ساتھ نہیں رکھتے تھے۔ اسی باعث ہماری نانی نے یہ مکان دے رکھا تھا۔ میرے والد جفت ساز تھے۔ ان کا سامان میرے ذہن میں ہمیشہ بکھرا رہتا تھا۔ وہ جوتوں پہ کلا بتو کا کام کرتے تھے۔ وہ بہت باریک کام ہوتا تھا۔ سارے ضلع میں ان کے کام کی بڑی دھوم تھی۔ اکثر شادی بیاہ پر انہی کی بنائی ہوئی جوتی دولہا دلہن پہنتے تھے' چونکہ وہ جوتی بہت قیمتی ہوتی تھی اس لیے بہت کم لوگ بنواتے تھے۔ عام آدمی اسے نہیں پہنتا تھا۔ اس لیے یہ کام اتنا زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

ہمارے والد صاحب نے مروج طریقے سے نہیں پڑھا تھا۔ گلستان بوستان' داستان امیر حمزہ' میر امن کی ''باغ و بہار'' وغیرہ انہوں نے اپنے تایا کے دوست عبداللہ خان ذیلدار سے پڑھ رکھی تھیں۔ والد صاحب بہت خوش خط بھی تھے وہ اپنی کتاب ''گلہائے عقیدت'' میں لکھتے ہیں کہ ''میانی افغاناں میں ایک بزرگ رہتے تھے بابا فتح محمد خان۔ ان کو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے بھی شجرہ ہائے نسب یاد تھے۔ وہ جب بھی میرے ابا سے ملتے تھے تو ان کو وہ دادا کے دادا کے نام سے آواز دیتے تھے۔ میرے والد لکھتے ہیں کہ وہ مجھے کہتے کہ ''آ بھئی خیر دین خان والے'' خیر دین ہمارے دادا کے دادا تھے اور ان کے بارے میں فتح محمد خان روایت بیان کرتے ہیں کہ وہ قلعہ پھلور میں سپاہی یا فوجی کی حیثیت سے ملازم تھے۔ قلعہ پھلور ضلع جالندھر میں ہے۔ جب انگریزوں نے

ہندوستان پر یلغار کی تو قلعہ پھلور پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہاں ہمارے بزرگ دادا کے دادا (مورث اعلیٰ) نے بڑی حوصلہ افزا تقریر کی اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ذلت کی زندگی سے بہتر ہے کہ عزت کی موت مر جائیں۔ مخالف سپاہی مقابلہ کرتے کرتے پسپا ہوتے چلے گئے اور کچھ سپاہیوں نے قلعہ کی چھت پر پناہ لی۔ ہمارے مورث اعلیٰ گرفتار ہو گئے اور انہیں انگریز افسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ انگریز افسر نے جب یہ سنا کہ اس اکیلے شخص نے نو سپاہیوں کو ہلاک کیا ہے تو ہمارے مورث اعلیٰ کی بہادری و دلیری کی بڑی تعریف کی۔ انگریز افسر نے اپنے ساتھیوں کا یہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا کہ اس شخص کو ہلاک کر دیا جائے بلکہ انگریز افسر نے اس کے لیے انعام و اکرام کا اعلان کیا لیکن ہمارے مورث اعلیٰ نے مشروط انعام واکرام کو مسترد کر دیا۔ تاہم انگریز افسر نے ہمارے مورث اعلیٰ کو نوازا اور اس طرح وہ گاؤں میانی افغاناں میں آ کر آباد ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ ملازمت کے دوران ہی ان سے وابستہ ایک بڑا مشہور واقعہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک رات اس چوکی کی چھت گرنے لگی جس میں وہ ڈیوٹی پر متعین تھے۔ انہوں نے شہتیر کو ہاتھوں سے سہارا دے کر چھت کو گرنے سے بچائے رکھا۔ باقی سپاہی گشت پر گئے ہوئے تھے۔ جب سپاہی صبح واپس آئے تو انہوں نے ہمارے مورث اعلیٰ کو نیچے سے نکالا۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی شدید دباؤ کی وجہ سے متاثر ہوئی اور وہ تمام عمر کمر سے زنجیر باندھ کر چلتے رہے۔ ہمارے والد نے لکھا ہے کہ ”حبیب جالب میں اسی بزرگ کی کوئی ’انی کنی‘ رہ گئی ہے۔“

بابا فتح محمد خاں کے مطابق ہم غزنی سے آئے۔ مختلف حادثات کے حوالے سے لوگ ہندوستان کی طرف آتے جاتے رہتے تھے۔ امکان غالب ہے کہ دریائے بیاس کے کنارے انہوں نے پڑاؤ ڈالا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ واپس چلے گئے ہوں اور ہمارے آباء واجداد کے واپس جانے کا سامان نہیں ہوا ہوگا' لہٰذا وہ یہیں ٹھہر گئے ہوں۔ ہمارا گاؤں میانی افغاناں تحصیل دسوہہ ضلع ہوشیار پور میں واقع ہے۔ دریا کے کنارے زیادہ تر مچھیرے آباد تھے۔ ہمارے لوگ یہاں زمینوں پر قابض ہو گئے لہٰذا یہ علاقہ میانی افغاناں کے نام سے منسوب ہو گیا۔

میرے والد صاحب بڑے اچھے داستان گو بھی تھے۔ ہمارے گاؤں کا زمیندار اکثر ان کو بلایا کرتا تھا اور قصے کہانیاں سنا کرتا تھا۔ پرانے زمانے میں بڑے لوگوں کے ہاں یہی رواج ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ اس دور میں ریڈیو' ٹی وی' فلم یا دیگر جدید ذرائع نہیں ہوتے تھے۔ ہمارے والد کا بڑا احترام تھا لیکن ہمارا اسٹیٹس گاؤں کے زمینداروں جیسا تو نہیں تھا کیونکہ وہ زمین کے مالک تھے اور جو لوگ بے زمین ہوتے ہیں ان کو کمی کہا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے گاؤں کے بڑے زمینداروں کی بڑی دہشت ہوتی تھی اور ان

کے بڑے جب آتے ہوئے نظر آتے تھے تو عام لوگ ادھر ادھر ہو جاتے تھے یا جو جہاں کھڑا ہوتا وہیں کھڑا رہ جاتا۔ غریب بے زمین کا ان کو سلام کرنا بہت ضروری ہوتا تھا۔ اگر کسی سے رہ گیا یا سلام بھول گیا تو اس کی خاصی درگت بنتی تھی۔ وہ غریب کہتا کہ حضور میں نے دیکھا نہیں تو وہ کہتے کہ نہیں تیری آنکھوں میں چربی اتر آئی ہے۔ ان زمینداروں کے دیوان خانوں میں صفیں بچھی ہوتی تھیں۔ صفوں پر لوگ بیٹھتے تھے اور ان کا حقہ بھی کچا ہوتا تھا اور خان صاحب کا حقہ پکا ہوتا تھا۔ صفوں پر بیٹھے لوگوں کا تمبا کو بھی بس ایسا ویسا ہی ہوتا تھا۔ جبکہ خان صاحب کا تمبا کو بھی عمدہ ہوتا تھا۔ چارپائی پر جب کبھی بھی آتا تو تھانیدار بیٹھتا تھا۔ پولیس چوکی برائے نام ہی تھی اور اصل میں تھانہ "دیوان خانہ" ہی ہوتا تھا کیونکہ جو خان صاحب کہہ دیتے تھے اس کو سچ سمجھا جاتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ تھانے کے ساتھ دیوان خانوں کا بڑا مضبوط رابطہ ہوتا تھا کیونکہ اسی مضبوط رابطے کی وجہ سے ہی زمینداروں کی حکمرانی بنتی تھی۔ غرض کہ خان صاحب لوگ بڑے حاکم ہوتے تھے۔ سیاہ وسفید کے مالک ہوتے تھے۔

جب میں پہلی جماعت میں سکول داخل ہوا تو اس وقت میری عمر چھ یا سات برس کی ہوگی۔ ہمارے دوست بھی بس مفلس لوگوں کے بچے ہوتے تھے کیونکہ خان صاحبوں کے بچوں کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ میں نے جس غریب گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں تو مسائل ہی مسائل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جنگل میں لکڑیاں چننے جایا کرتے تھے۔ مکئی کٹ جانے کے بعد کھیتوں میں ہل چلاتا تھا تو مکئی کی جڑیں (مڈھ) رہ جاتی تھیں انہیں ایک جگہ اکٹھا کر لیا جاتا تھا اور پھر وہ جلانے کے کام آتی تھیں۔ ہر سال ایک جوڑا کپڑوں کا ملتا تھا اور بطور عیدی ایک آنہ عید پر ملنے والے جوڑے ہی میں پورا سال گزار دیتے اور غربت کی انتہا تھی۔ دیہاتوں میں ویسے بھی لوگوں کے پاس روپے پیسے نہیں ہوتے۔ معاملات زندگی یوں چلتے کہ جوتا بن گیا تو کچھ اناج مل گیا یا کسی صاحب استطاعت نے کچھ پیسے دے دیئے بس یہی سب کچھ ہمارا بھی ذریعہ معاش تھا۔

"چڑی میوہ"

میرے نانا پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اس زمانے میں رواج ہی کچھ ایسا تھا...... کہانیاں سنانے کا رواج۔ میری نانی بھی رات کو کہانی سنایا کرتی تھی اور اسے ایسا طریقہ آتا تھا کہ وہ کہانی گھڑ بھی لیتی تھی اور سنانے سے پہلے تمہید باندھا کرتی تھی جیسے "سننے والی کی عمر دراز...... سنانے والے کا بھی بھلا...... اور طوطا مینا سے گفتگو کر رہا ہے" یہ ایک پرانا اسٹائل تھا کہانی سنانے کا۔ پرانے زمانے کی داستانوں کا آغاز ایسے ہی ہوتا تھا۔ رات کو وہ کھانے کا بڑا ذکر کرتی تھیں کہ صبح کو یہ پکالیں گے۔ مچھلی پکائیں' گوشت پکائیں گے' پائے پکائیں گے' پائے نہیں سری کیسی رہے گی۔ اس طرح وہ مجھے رات کو بہلایا کرتی تھیں۔ صبح جب ہوتی تھی تو وہ رات کی ساری

باتیں بھول جایا کرتی تھیں اور میں وہیں انکار ہوتا تھا کہ آج ان ''ڈشوں'' میں سے کوئی ''ڈش'' پکے گی تو نانی رات کو کہانی سنانے سے پہلے صبح کا پروگرام بنایا کرتی تھی۔ رات کو جب میں سو جاتا اور صبح اٹھتا تھا تو میں پوچھتا نانی کیا پکا ئیں وہ جو رات تو نے مجھے کہا تھا تو پھر اس کا مزاج بدل جایا کرتا تھا اور وہ کہتی کہ اپنے دادا کے پاس کیوں نہیں جاتے۔ میرے پاس کیوں رہتے ہو۔ پھر یہ طے پاتا کہ ''چڑی میوہ'' ہی ہو جائے۔ سوکھی مرچیں پسی ہوئیں۔ نمک اور پانی ملا لیا۔ اسے ''چڑی میوہ'' کہتے تھے۔ اسی مکسچر سے روٹی بھگو بھگو کے میں کھا لیا کرتا تھا۔ زندگی یوں بڑے دکھوں اور عسرت میں گزری ہے۔ اس کی یادیں اب تک میں محو نہیں کر سکا ہوں۔ اس لیے بھوک ونگ اور افلاس سے مجھے سخت نفرت ہے۔ اس وقت مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس کا علاج کیا ہے۔ لیکن اس کا دکھ ضرور رہا اور یہی دکھ میرے اشعار میں ڈھلتا گیا۔ میری دادی فوت ہو چکی تھی۔ دادا فقیر منش تھے۔ وہ میلوں ٹھیلوں میں اور صوفیائے کرام کے مزاروں پر جایا کرتے تھے اور ان کے ساتھ ہی زیادہ وقت گزارتے تھے۔

لوک گیتوں کا نگر

میرے قصبے میں عجیب عجیب کردار تھے۔ ایک شخص بڑی اچھی آواز میں یوسف زلیخا پڑھا کرتا تھا۔ اس کی ایک محفل برنے کے درخت کے نیچے لگتی تھی اس کو مائی ولایتاں چھیڑ دیا کرتی تھی کہ ''سناؤ بھئی یوسف زلیخا کا کوئی ٹکڑا'' تو پھر وہ گا کر سنایا کرتا تھا۔ اصل میں وہاں برنے کے درخت کے نیچے مائی ولایتاں کا گھر ہی تھا۔ وہ ایک تکیہ تھا۔ وہ لوگ وہاں مل کر پوست پیتے تھے۔ جب ان کی طبیعت میں ترنگ آ جاتی تو وہ گانا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی مائی ولایتاں نے آواز اٹھائی۔ کوئی اور گا تیک آ گیا۔ مائی ولایتاں کی آواز میں اتنا جادو تھا (حالانکہ وہ ضعیف العمر تھی) کہ میرے کانوں میں اب تک اس کی آواز رس گھول رہی ہے۔ میں اس کو بھلا نہیں سکا۔ اتنی سریلی اور رس گھولنے والی آواز اور پھر یہ کہ اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر نہیں تھے لیکن اس کی آواز چار چار پانچ پانچ کوس سے سنائی دیتی تھی۔ میں اسکول سے جب کبھی آ رہا ہوتا تو اس کی آواز سنائی دے جاتی اور میں اس آواز کا پیچھا کرتے کرتے وہاں پہنچ جایا کرتا تھا جہاں وہ گا رہی ہوتی تھی۔ وہ ہمارے گھر کے قریب ہی رہتی تھی۔ اپنے بچوں جیسا ہمیں سمجھتی تھی۔ اس کا پیشہ ہی گانا بجانا تھا۔ گاؤں بھر میں اس کا احترام کیا جاتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں عرس اور میلے ہوا کرتے تھے اور ان میں دین محمد قوال آیا کرتا تھا۔ اس کی آواز کا شہرہ ایسا تھا کہ وہ اپنے زمانے کا ''دلیپ کمار'' تھا۔ جب کبھی وہ آ جاتا تھا تو لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو جاتے تھے۔ ایسے میں اس کو ایک کوٹھے پر کھڑا کر دیا جاتا تھا وہ بتاتا تھا کہ ''بھائیو! میں آ گیا ہوں اب تم اپنے گھر جاؤ اور میں آج پانچ بجے گانا گاؤں گا تم وہاں آ جانا'' پھر لوگوں کو یقین ہو جاتا کہ وہ آ گیا ہے۔ ایسا اس کا شہرہ تھا۔ اس کی آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ اس کے ریکارڈ

بن گئے تھے۔ وہ لوگوں کو ایک بڑا ہی عجوبہ لگتا تھا' سب کو اچنبھا ہوتا تھا کہ ایک ''مشین'' سے ایک ''توے'' سے آواز آ رہی ہے۔ لوگ گراموفون کے گرد بیٹھ جاتے تھے اور اس کو سنا کرتے تھے۔ اس کی بڑی شہرت تھی۔ وہ گانے والوں کا شہنشاہ تھا۔ اس کا ایک بڑا بھائی عمردین بھی تھا۔ اس کو عجائب خان کہتے تھے۔ وہ بھی بڑا گائیک تھا۔ فتح علی خان اور مبارک علی خان ان ہی کے رشتہ دار تھے۔ وہ زمانہ نوٹنکی اور ''رہس'' کا تھا۔ نقال روپ دھارا کرتے تھے۔ ہیر رانجھا' سوہنی مہیوال وغیرہ کے۔ ان میں مرد عورت بھی بن جایا کرتے تھے۔ ایک ان میں مسخرہ ہوتا تھا۔ اصل ہیرو وہی ہوتا تھا۔ ایسا ہی ایک مسخرہ ''سرور یا'' تھا اور اس کا اصل نام سرور تھا۔ بڑا ہی سادہ سا آدمی تھا' لیکن جب وہ محفل میں آتا تھا تو پتہ نہیں کیسے اس میں ایک تیزی سی آ جاتی تھی۔ ایسی ایسی شکلیں بناتا تھا اور باتیں کرتا تھا کہ لوگ لوٹ پوٹ ہو جایا کرتے تھے۔ نقالوں کی ٹولی میں اس کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی اور اس کا نام چلتا تھا۔ یہ فلم اور اسٹیج کا نعم البدل تھا۔ پھر رام لیلا بھی ہوتی تھیں۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کا زمانہ تھا۔

میر و غالب کی دلی

اپنی والدہ کے بارے میں بتا دوں کہ میں ان ہی کی وجہ سے یہاں بیٹھا اردو بول رہا ہوں۔ یہ ان ہی کی دین ہے۔ میری والدہ نے میرے بڑے بھائی کے بارے میں جو خواب دیکھے تھے۔ کہ وہ بڑا ہو کے افسر بنے گا' بابو بنے گا۔ وہ اپنی ان ہی خواہشات کا اظہار اپنی ایک سہیلی سے کیا کرتی تھیں ان کی وہ سہیلی مشہور ادیب اشفاق احمد کی خالہ تھیں۔ وہ بڑے ہی کھلے دل کی مالک' رحم دل اور غیر متعصب خاتون تھیں۔ ان میں جاگیردارانہ خو نہیں تھی۔ ان میں لوگوں کے لیے ایک رحم اور محبت تھی۔ انہوں نے میرے بھائی کو بیٹا بنایا ہوا تھا۔ ان کے میاں غلام سرور خان دلی میں وائسرائے کے دفتر میں ملازم تھے۔ میری والدہ کی ان خواہشات کا اس بی بی نے احترام کیا۔ میرے بھائی نے جب میٹرک کر لیا تو اسے انہوں نے دلی بلوا لیا۔ وہاں میرے بھائی ملازم ہو گئے تھے۔ میرے چچا بھی سرکاری دفتر میں چپڑاسی تھے۔ بھائی کو کوارٹر مل گیا تھا۔ میرے ابا بھی وہیں جا کر کام کرنے لگے اور میں وہاں پڑھتا رہا۔ دلی میرے لیے اجنبی تھی کیونکہ میں بولتا تو اردو ہی تھا لیکن لہجہ پنجابی تھا۔ کچھ مہینے تک ہم دلی کے لڑکوں کے طنز و مزاح کا نشانہ بنتے رہے۔ پھر ہم وہاں رواں ہو گئے' ہمارا لہجہ درست ہو گیا اور ہمیں دلی کی زبان آ گئی۔ پھر وہ بلی ماراں کے لڑکے ہمارے دوست بن گئے۔ مجھے اب وہ دوست یاد نہیں رہے۔

ہمارے بھائی کو ایک بہت اچھا کوارٹر مل گیا' وہاں بنگالی بھی رہا کرتے تھے۔ میوزک اور رقص ان کے کلچر کا حصہ تھا۔ وہاں میوزک بہت سنا۔ اسی لیے ہمارے کان سروں سے آشنا ہیں۔ دلی ادب کا گہوارہ تھا۔ دلی میں بڑے بڑے اساتذہ رہتے تھے۔ میر و

غالب کی دلی۔سائل اور بیخود اس وقت زندہ تھے۔جنہوں نے غالب اور داغ کو سنا تھا۔ان کو ہم نے سنا۔میں مشاعروں میں ایک سامع کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا تو کبھی کبھار غزل وغیرہ بھی پڑھ لیا کرتا تھا کیونکہ مجھ میں شعر کہنے کی صلاحیت تھی۔میرے بڑے بھائی خود شاعر تھے۔ادبی جریدہ ''آج کل'' جس کے جوش ملیح آبادی ایڈیٹر ہوا کرتے تھے' مجھے یاد ہے کہ جب اس میں میرزا یاس یگانہ چنگیزی کا کلام چھپتا تھا تو لکھا جاتا تھا ''یگانہ آرٹ'' اس کے زیر عنوان جوش صاحب' یاس یگانہ کی غزل چھاپتے تھے۔مضطر لدھیانوی ہمارے ملنے والے تھے۔انہوں نے بھی میرے شعری ذوق کو سراہا۔

میں نے اپنے گاؤں میں ساتویں جماعت پاس کی۔پھر میں دلی بلا لیا گیا۔وہاں شعر و ادب کی فضا عام تھی۔مشاعرے ہوا کرتے تھے۔میرے بڑے بھائی مشتاق مبارک بھی شاعر تھے تو اس پورے ماحول نے مجھے بھی شعر کی طرف راغب کر دیا۔یقیناً میرے اندر فضا پہلے سے موجود ہوگی۔میں ساتویں جماعت میں تھا کہ امتحان میں ایک لفظ دیا گیا ''وقت سحر'' اسے جملے میں استعمال کرنا تھا۔جملہ تو مجھ سے نہ بن سکا مگر شعر ہو گیا۔یعنی میرا پہلا شعر ...... وہ کچھ یوں تھا۔

وعدہ کیا تھا آئیں گے امشب ضرور وہ
وعدہ شکن کو دیکھتے وقت سحر ہوا

سالانہ امتحان کے پرچے میں میرا شعر پڑھ کر میرے کلاس کے ٹیچر یقین شاہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ'' حبیب تُسیں تاں شاعر آں بھئی'' (حبیب تم تو شاعر ہو بھئی)

دلی میں جہاں جہاں بھی مشاعرے ہوتے تھے' میں بڑے بھائی کے ساتھ وہاں وہاں جاتا تھا۔شاعروں میں مولانا ظفر علی خان' سائل دہلوی' بیخود دہلوی اور جگر صاحب تھے۔ان شعراء کو بہت سنا۔دہلی میں میرے استاد' مضطر لدھیانوی ہوتے تھے۔قیام پاکستان کے بعد وہ ایف سی کالج لاہور میں بھی پڑھاتے رہے۔انہوں نے میری بڑی رہنمائی کی۔حرماں خیر آبادی بھی ہوا کرتے تھے۔کبھی کبھی ان کو اپنا شعر سنایا کرتا تو وہ کہا کرتے تھے کہ میاں ابھی کام کرتے رہو۔مشق سخن جاری رکھو۔میرے بڑے بھائی دلی میں ماہنامہ ''آج کل'' میں لکھا کرتے تھے۔یہ اس زمانے کا بڑا مشہور پرچہ تھا۔جرات صاحب کو بھی میں نے سنا' وہ مشاعرے میں آتے' پانچ چھ غزلیں پڑھتیں۔مشاعرہ لوٹا اور چلے گئے۔پھر اپنی کیفیت یا موڈ کو بنانے میں مصروف ہو جاتے۔یہ ان کا شراب کا دور ہوتا تھا' اور پھر اسی کیفیت میں مشاعرے کے آخر میں دوبارہ آتے اور ایک بار پھر مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔میں نے ایسا پڑھنے والا اتنی خوبصورت' رواں دواں غزل کہنے والا شاعر کوئی اور نہیں سنا۔دلی میں جمیل الدین عالی' فرید جاوید ...... یہ نوآموز شاعر

تھے۔عارف جلالی بھی تھے۔

آٹھویں جماعت پاس کر کے میں نے اینگلو عربک ہائی سکول موری گیٹ میں نویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔اسکول کے سامنے ایک مسجد تھی۔نماز کے وقت ہمارے اساتذہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے اور اپنے طالب علموں کو بھی نماز پڑھایا کرتے تھے' وہاں نماز کے بعد یعنی وقت دعا ایک مطلع ہو گیا۔

مدتیں ہو گئیں خطا کرتے

شرم آتی ہے اب دعا کرتے

دلی سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔میں اس وقت نویں جماعت کا طالب علم تھا۔شعراء سے کوئی مراسم نہیں تھے' بھلا نویں جماعت کے طالب علم کے کیا مراسم ہوتے تھے۔لیکن میں نے سائل وبیخود کو سنا جنہوں نے غالب اور داغ کو سن رکھا تھا جگر صاحب کو بھی سنا۔ان سب چیزوں کے ساتھ فراغت' بےفکری یا جسے مسرت اور اطمینان کہتے ہیں وہ لہر زندگی میں نہیں آئی۔اضطراب' بےچینی اور بےکیفی زندگی پر مسلط رہے۔اخراجات کا پورا نہ ہونا ہی اصل مسئلہ تھا۔بڑے بھائی کی تنخواہ ساٹھ روپے تھی تو اس میں اس کے اپنے خرچ بمشکل پورے ہوتے تھے۔اگر تعلیم حاصل کرنا چاہتے بھی تو کیسے کرتے! مجھے دو مہینوں کی اسکول سے جو چھٹیاں ہوا کرتی تھیں تو میں ملازمت کر لیا کرتا تھا اور لوکل ریڈیو پہ جا کے نظمیں پڑھ کر پانچ روپے لے آیا کرتا تھا۔تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ گھر والوں کے ساتھ میں بھی Contribute کر دیتا تھا۔شروع ہی سے سخت محنت اور مشقت کرتے رہے اور اس کے لیے مجبور تھے۔میرا شروع ہی سے والدین کے ساتھ عملی تعاون رہا۔ہمارے والدین کی خواہش بہت تھی کہ ان کے سارے بچے تعلیم حاصل کریں لیکن صورت حال ویسی نہ تھی۔ہم چار بھائی تھے اور ایک بہن تھی۔ایک چھوٹا بھائی پاکستان آ کر پیدا ہوا تھا۔ہمارے چچا ہمارے گھر میں ہی رہتے تھے۔ہماری نانی اور خالائیں خالو تھے' رشتہ داروں میں کچھ تھانیدار تھے۔ان کی اسی طرح کی ہی ملازمتیں تھیں۔

بچھڑے دیس کے غم

میرے اسکول کے ماسٹر بہت ہی سخت ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت بااصول انسان بھی تھے۔وہ سارے طالب علموں کو اپنی اولاد کی طرح پیار کرتے تھے اور اپنا فرض سمجھ کر تعلیم دیتے تھے۔ان کی تمنا ہوا کرتی تھی کہ طالب علم بڑے ہو کر ملک وقوم کی اعلیٰ پیمانے پر خدمت کریں۔اس زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کی بات بھی چل رہی تھی۔بعد میں تحریک پاکستان میں بھی خوب تیزی آ گئی لیکن جب میں اپنے اس زمانے کے اساتذہ کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگ Anti

تھے اور انگریز کے خلاف تھے۔ وہ اصل میں Nationalist تھے۔ آزادی پسند تھے۔ اس وقت چونکہ بچپنا تھا Imperialism لیکن آج انکی باتیں یاد آتی ہیں۔ ان کے انداز و اطوار پر غور کرتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ سب انگریز کے خلاف تھے اور پکے Nationalist تھے۔ میرے اساتذہ میں ہندو اور سکھ بھی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی تنخواہیں اس زمانے کے لحاظ سے بھی کم ہوا کرتی تھیں حالانکہ وہ زمانہ بہت سستا تھا تب قیمتوں نے آسمانوں کو چھوا نہیں تھا۔

میں نے بچپن انتہائی غربت اور افلاس اور خوف کے سائے میں گزارا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرے والد بڑے بھائی کے ساتھ دلی منتقل ہو گئے تو میں پیچھے گاؤں میں اپنی نابینا نانی کے پاس رہ گیا۔ میری نانی جب بینا تھیں وہ ازار بند' جرابیں وغیرہ بن لیا کرتی تھیں اور بینائی جانے کے بعد بھی انہیں یہ مہارت حاصل رہی اور پھر یہ ہنر آمدنی کا ایک ذریعہ بھی بن گیا۔ میری نابینا نانی ازار بند' جرابیں وغیرہ بن لیا کرتیں اور ہم یعنی میں اور نانی انہیں گلی گلی گھوم پھر کر بیچا کرتے تھے۔ نانی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ہوتا تھا اور ہم گاؤں در گاؤں صبح سے شام تک ازار بند' جرابیں وغیرہ بیچا کرتے تھے۔ کچھ لوگ نابینا نانی کو دیکھ کر ازراہ ترحم ازار بند' جرابیں خرید لیا کرتے تھے۔ یوں آٹھ دس آنے اکٹھے ہو جاتے اور ہمارے ہفتہ بھر کے راشن کا انتظام ہو جاتا۔ نانی آٹا خود ہی گوندھا کرتی تھیں اور روٹی' ہانڈی بھی پکا لیا کرتی تھیں۔ یہ ۱۹۳۷ کی بات ہے۔ میری نانی ایک شعر بہت پڑھا کرتی تھی کہ

ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسے کو کیا
دتا نہ دتا پھر کسے کو کیا

میں بچپن میں اس شعر کو نانی کی زبانی سنتا رہا' جب ہم کراچی آئے تو نانی ہمارے ساتھ تھی جس کی عمر سو سال ہو چکی تھی۔ ایک دن میں "کلیات نظیر" پڑھ رہا تھا تو اس میں سے وہی شعر نکل آیا جو کچھ یوں تھا۔

ہم نے تو دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا
اسلام چھوڑ کفر لیا پھر کسی کو کیا

میں نے سوچا یہ شعر سو سال پہلے پیدل چل کر ہمارے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نظیر ایک عوامی شاعر تھا اور اس کا شعر عام آدمی تک با آسانی رسائی حاصل کر لیتا تھا۔ میں نے نانی کو درست شعر سنایا اور کہا اب اسے غلط نہ پڑھنا۔ کبھی کبھی میری نانی مجھ سے خفا بھی ہو جایا کرتی تھیں اور پھر کہا کرتی تھیں کہ "کبھی اپنے ددھیال والوں کے پاس کیوں نہیں جاتا۔ جا اور ان کی جان کو کھا۔" ہماری دادی کا انتقال ہو چکا تھا اور دادا اکیلے رہتے تھے۔ ہمارے دادا پیروں فقیروں کے بہت معتقد ہوا کرتے تھے اور مزار مزار

حاضری دینا ان کی زندگی بن کر رہ گیا تھا۔

ہمارے گاؤں میانی افغاناں کے ایک جانب دریائے بیاس تھا اور دوسری جانب ایک ندی بہتی تھی۔ ہم اکثر ندی پر ڈوری کانٹے سے مچھلی کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ جب میرے والدین نے گاؤں سے پہلی ہجرت کی اور ٹانڈہ منتقل ہو گئے تاکہ بڑے بھائی مشتاق کو ہائی سکول میٹرک میں داخل کروایا جائے۔ میانی افغاناں سے ٹانڈہ منتقل ہو جانے پر مجھے اپنے دوست بہت یاد آتے تھے۔ گاؤں کے ندی نالے اور سبزہ زار یاد آتے تھے اور وہ لوگ بھی جو خوبصورت آواز میں یوسف زلیخا پڑھا کرتے تھے۔ اپنی پہلی ہجرت پر میں اپنے گاؤں کو یاد کر کے بہت رویا تھا۔

مولانا غلام رسول مصنف "یوسف زلیخا" عالم پور کے رہنے والے تھے جو ہمارے گاؤں سے چند کوس کے فاصلے پر تھا' میں نے جن سے قرآن شریف پڑھا وہ خود مولانا غلام رسول کے شاگرد تھے' وہ اپنے استاد کے بارے میں بتایا کرتے تھے کہ پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر مولانا غلام رسول صاحب گا گا کر یوسف زلیخا لکھا کرتے تھے۔

اپنے بچپن کے کھیلوں کو یاد کرتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ وہی غریبوں کے بچوں والے کھیل ہم بھی کھیلا کرتے تھے۔ مثلاً سرکنڈوں کے بور جھاڑ کر تیر بنا لیا کرتے تھے اور پھر ان سے کھیلا کرتے تھے۔ بچپن کے دوست ۱۹۴۷ء میں ہجرت کے وقت بچھڑ گئے ادھر کے دوست ادھر رہ گئے ادھر کے دوستوں میں کبھی کبھار کوئی مل جاتا ہے۔

بٹوارہ اور تقسیم

۱۹۴۷ء میں ہندو مسلم منافرت عروج پر تھی۔ ہم لوگ بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ امرتسر سے کئی ریل گاڑیاں گزریں' اور ان پر دونوں طرف سے قیامتیں ٹوٹیں' ہماری ٹرین بھی جب امرتسر پہنچی تو بتیاں بجھا دی گئیں اور پھر بس زندہ رہنا تھا سو ہم ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچ گئے۔ بڑے بھائی مشتاق سرکاری ملازمت میں تھے اور انہیں کراچی ایئر پورٹ کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس طرح ہم کراچی پہنچ گئے۔ ہمارے والد وہیں رہ گئے تھے۔ ان کی جوتوں کی دکان تھی اور ان کو کاروباری لین دین کے لیے دلی رکنا پڑا۔ وہ ہم کو رخصت کر کے وہیں رہ گئے اور بولے کہ چند روز میں آ جاؤں گا۔ مگر والد صاحب کا وہاں رک جانا غضب ہو گیا۔ بس خدا کو منظور تھا کہ ان کی جان بچ گئی اور وہ ایک سال بعد یعنی ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئے جبکہ ہم لوگ ان کو مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔

ہمارے بڑے دادا بھی بٹوارے کے وقت گاؤں میں تھے۔ ان کا بھی کچھ پتہ نہیں چل سکا اور وہ بھی لاکھوں انسانوں کی طرح بٹوارے میں کام آ گئے۔ ہمارے بڑے دادا کا نام فضل دین تھا اور وہ گائیڈ تھے اور بہت جہاندیدہ انسان تھے۔ وہ بمبئی سے

انگریزوں کو لیتے اور پھر پورا ہندوستان گھومتے تھے۔ گاؤں میں ہمارے والدین کی جو جمع پونجی تھی وہ تمام انہی کے کنٹرول میں ہوتی تھی۔ والدہ صاحبہ کا سامان تھوڑے بہت زیورات یا ان کا اپنا ذاتی اثاثہ تو وہ اس کی حفاظت کی خاطر گاؤں ہی میں رہے اور پھر وہیں فسادات میں مارے گئے۔ مجھے یاد ہے وہ تھوڑی بہت انگریزی بھی بول لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی مجھے ''او بلڈی فول'' کہا کرتے تھے۔

◆◆◆

اڑتے ہوئے پتے

ملک تقسیم ہوگیا۔ہم ٹرین میں پاکستان پہنچے۔امرتسر میں ہم سے پہلے ایک گاڑی ''کٹ'' چکی تھی۔ہم جب پہنچے تو وہاں آگ لگی ہوئی تھی۔ ہمیں بھی خبردار کیا گیا تھا کہ گاڑی سے باہر نہ نکلنا۔اندھیرا کردیا گیا تھا تو ان حالات سے گزر کر ہم ۱۴ اگست کی رات کو آخر کار کراچی پہنچ گئے۔میرے والد پیچھے رہ گئے تھے۔انہوں نے کہا تھا کہ میں بعد میں آجاؤں گا۔ان کا خیال تھا کہ وہ وہیں رہ لیں گے ان کے وہاں چوڑی بازار میں جوتوں کی دکان تھی۔وہ کاریگر بھی ساتھ رکھے ہوئے تھے۔لگتا تھا ان کا ارادہ وہیں رہ جانے کا تھا یا پھر آتے جاتے رہنے کا مسئلہ ہوگا۔وہاں اس وقت ہندو مسلم نفاق کی ہوا چلی ہوئی تھی۔اس لیے وہ وہاں تو نہ رہ سکے بلکہ انہیں وہاں کورو پانڈوؤں کے پرانے قلعے میں رہنا پڑا۔پھر ایک سال کے بعد وہ آئے۔کراچی میں ہمیں جو پہلی مشکل درپیش آئی وہ اپنے عزیزوں کو ڈھونڈنا تھا۔میرے بھائی کی بیوی جو جالندھر میں تھی وہاں سے اسے آنا تھا تو ایک سال ایک دوسرے کو ڈھونڈنے میں گزر گیا۔بڑے بھائی کو کوارٹر مل گیا تھا۔جیکب لائن کے علاقے میں فوجی بیرکیں تھیں وہاں کوارٹر بنا دیئے گئے تھے۔میں نے بھی کراچی میں دسویں میں داخلہ لے لیا۔زندگی وہی عسرت اور افلاس کی تھی۔لوگ کیسے ایک دوسرے کو سنبھالتے وہ خود ہی پریشان حال تھے۔

ایک سال چھ مہینے اسی طرح گزر گئے۔میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا کیونکہ مجھے گھر کے اخراجات چلانے کے لیے مختلف کام کرنے پڑتے تھے۔محنت مزدوری کرتا تھا۔کبھی بندرگاہ پر چلا گیا۔کیمپوں میں ریڈیو اسٹیشن بن گیا تھا میں وہاں جا کر نظمیں وغیرہ پڑھتا تھا۔کراچی میں یوپی' لکھنو اور دلی کے اساتذہ اور ان کے شاگرد اکٹھے ہوگئے تھے۔چنانچہ وہاں مشاعروں کا بڑا چرچا تھا تو وہ جو شوق تھا شاعری کا وہ کراچی میں آکر پروان چڑھا اس زمانے میں مشاعرہ باقاعدہ ایک انسٹی ٹیوشن تھا۔اردو زبان مشاعرے کی وجہ سے ہی رائج تھی۔شاعری ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہوگئی۔تمام اساتذہ اکبرآباد کے' لکھنؤ دلی اور دکن کے' وہاں کراچی میں ہجرت کر آئے تھے۔ ۱۹۴۷ء' ۱۹۴۸ء میں مشاعروں میں ہم نے حصہ لینا شروع کردیا۔ہماری تربیت بھی ہوتی رہی۔زیڈ اے بخاری جو ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے وہ خود بھی شاعر تھے اور انہیں مشاعرے کرانے کا بڑا شوق تھا' یہاں استاد قمر جلالوی اور رئیس امروہوی سے بھی ملاقات ہوئی۔سیماب اکبرآبادی' نظر حیدرآبادی کے والد اختر حیدری' لکھنو کے ہاشم رضا' آل رضا۔ان سب لوگوں کو سنا اور ان لوگوں کے ساتھ گھومے پھرے۔اب یہ عالم تھا کہ صبح سے شام تک غزلیں سنا رہے ہیں اور غزلیں ہی سنتے چلے جا رہے ہیں اور کوئی

کام نہیں ہوتا تھا۔ صدر (کراچی) میں کافی ہاؤس تھا۔ جہاں میں نے بیٹھنا شروع کیا۔ وہاں صبح کو بیٹھتے تھے اور شام کو ہی نکلتے تھے۔ اسٹوڈنٹس تھے جو بڑے قابل اور بے حد ذہین تھے۔ مارکسزم اور سوشلزم اور سیاسیات پر خوب بحث و مباحث ہوتے رہتے تھے۔

ایک غزل ہوگئی......

ان دنوں ہمارے پاس پیسے کہاں ہوا کرتے تھے' اس لیے پیدل ہی چل پڑتے تھے۔ بڑا پیدل چلے۔ گھر سے صبح کو نکلے تو صدر پہنچے۔ صدر میں کوئی پان بیچنے والا مل گیا ہے جو شاعر بھی ہے اور اب وہ پکارتا ہے ''ارے بھائی جالب کہاں جا رہے ہو؟'' میں کہتا ''آگے جا رہا ہوں۔''

''کچھ ہوا؟'' وہ پوچھتا۔

''کچھ نہیں ہوا'' میں جواب دیتا۔

''بھئی ادھر تو دو غزلیں ہوگئیں۔''

اب انہوں نے دو غزلیں ''پلا دیں'' چائے کے بغیر ہی۔ نہ چائے کا پوچھا اور غزلیں سنانا شروع کر دیں۔ آگے چلے تو ایک عینک بیچنے والا ملتا۔

''ارے بھائی جالب کہاں جا رہے ہو؟'' وہ پوچھتا۔

''وہاں تک......''

''بھئی کچھ ہوا۔''

''نہیں بھائی' کچھ نہیں ہوا۔''

''بھئی ادھر تو ایک غزل ہوگئی۔'' اور انہوں نے غزل سنا دی۔ پھر آگے ایک درزی بیٹھا ہوا ہے۔

''کچھ ہوا۔'' کبھی کبھی کوئی چائے کی ''پونی'' پلا دیتا۔ ایک تو پوری چائے کی پیالی ہوتی تھی اور ایک ''پونی پیالی'' ہوتی تھی۔ وہ منگوا لیتے اور اس نے کوئی ساٹھ ستر شعر کا ایک قصیدہ سنا دیا۔ یعنی ایک ٹوپی بیچنے والا بھی شعر سنا رہا اور ہم سنتے چلے جا رہے ہیں۔

ہمارے دوست رشید ملک نیوی میں ہوا کرتے تھے۔ وہ بمبئی میں گیت نگار مدھوک کے ساتھ فلمیں وغیرہ بنایا کرتے تھے اور وہیں سے پاکستان منتقل ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ ایک فلم اسکرپٹ بھی لائے تھے۔ ان کے ساتھ ایک باذوق آدمی بھی تھا۔ وہ مجھے اسکرپٹ سنایا کرتے تھے اور کہتے کہ آپ نے اس فلم کے گیت لکھنے ہیں لیکن وہ فلم نہ بن پائی۔ رشید ملک بی اے تھا اس لیے وہ نیوی

میں بھرتی ہوگیا۔ ہم اس سے ملنے کیاڑی جایا کرتے تھے۔ وہاں سے کشتی میں بیٹھ جایا کرتے اور رشید ملک کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ وہ ہماری خاطر تواضع کیا کرتا تھا اور آتے ہوئے ہماری جیب میں ایک دو روپے بھی ڈال دیتا تھا۔ اس زمانے میں ایک دو روپے بہت ہوتے تھے۔ پھر ہم اپنے گھر آجاتے تھے۔

فرید جاوید

ہمیں شوق ہوگیا تھا شاعر بننے کا۔ شاعروں میں اٹھنا بیٹھنا اور شاعروں سے ہی دوستیاں تھیں۔ ایک شاعر تھے فرید جاوید انہیں میں نے اپنے گھر کے قریب ہی ایک جھونپڑا ڈلوا دیا تھا کیونکہ اس نے اپنا ''ٹینٹ'' اپنے ایک مداح میر جواد حسین زیدی کو دے دیا تھا جو نابینا تھے۔ اس میں وہ اپنے بچوں سمیت رہتے تھے اور فرید جاوید ادھر ادھر پھرتا رہتا۔ ایک بار میں نے میر جواد حسین کو کہہ بھی دیا کہ ''بھئی آپ اس کے ٹینٹ میں رہتے ہیں' تمہاری ایک لڑکی جوان ہے اور یہ بھی ایک اچھا آدمی ہے۔ کلرک ہے آپ اپنی لڑکی کی شادی اس سے کیوں نہیں کر دیتے۔'' تو میر جواد بہت ناراض ہوئے اور مجھے گالیاں بھی دیں۔ میں نے انہیں کہا۔ ''بھئی ذرا اس پہ غور کر لینا۔ میں آپ کو یہ نیک مشورہ دے رہا ہوں۔ ایک تو اس کے ٹینٹ میں آپ رہتے ہیں اور وہ بیچارہ ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے۔'' میر جواد حسین زیدی بڑے عالم آدمی تھے انہیں فارسی بڑی آتی تھی۔ حافظ و خیام ان کو از بر تھے۔ وہاں انہیں جوش و جگر بھی شعر سنانے آیا کرتے تھے۔ وہ بڑا ہی باذوق اور اچھا نقاد تھا۔ جس شعر کو وہ کہہ دیتا کہ یہ ٹھیک ہے اس کو ہم رکھتے تھے اور جس کے بارے کہتا کہ ''یہ شعر نہیں ہوا'' ہم اسے شامل غزل نہیں کرتے تھے۔ وہ ہمارا بزرگ دوست تھا۔ ہماری اس کے ساتھ بعد میں صلح بھی ہوگئی تھی۔

ایک رات کو میں اور میرے والد ایک ہی رضائی میں سو رہے تھے تو غالباً والد صاحب ذرا دیر کو باہر گئے۔ اسی اثنا میں فرید جاوید آ گیا اور مجھے رضائی میں لیٹا دیکھ کر گالیاں دینے لگا کہ ''اب میں کمبل میں پڑا ہوں اور تیرے پاس رضائی ہے۔'' اور وہ رضائی اٹھا کر لے گیا۔ والد صاحب واپس آ گئے' میں اکڑوں بیٹھا تھا۔ والد صاحب نے پوچھا۔ رضائی کہاں ہے؟ تو میں چپ رہا۔ انہوں نے مجھے سختی سے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔ ''اوئے رضائی کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''جی وہ فرید جاوید لے گیا ہے۔'' وہ فوراً اس کے جھونپڑے میں گئے۔ فرید جاوید کمبل پہ رضائی اوڑھے لیٹا تھا۔ میرے والد صاحب نے اوپر سے جوتے برسانا شروع کر دیئے۔ وہ ''ابا جی...... ابا جی...... ابا جی'' کہتا رہا۔ والد صاحب رضائی لے کر آ گئے۔ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ میرے دوست کو رضائی کی ضرورت تھی جو میں اسے نہیں دے سکا۔ میں صبح گھر سے نکلا اور بغیر بتائے کراچی سے حیدر آباد آ گیا۔ جب سے میں نکلا ہوا ہوں' صرف اس دوست فرید جاوید کو رضائی نہ دینے کے واقعہ کی وجہ سے گھر نہیں گیا۔

حبیب احمد مست میانوی

جیکب لائن اسکول کراچی کا اس زمانے کا مشہور اسکول تھا۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ اس زمانے میں اسکول کالج اتنے کہاں تھے۔ جیکب لائن میں ایک دو بیرکوں پر مشتمل ہائی سکول تھا۔ میں بھی اسی سکول میں میٹرک کا طالب علم تھا۔ میں کراچی اور قریب کے شہروں میں بطور شاعر کچھ کچھ مشہور ہو چکا تھا۔ وہاں سکول میں میرے ساتھ سردار عبدالرب نشتر کے بیٹے مرحوم جمیل نشتر بھی پڑھتے تھے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی بڑا انسان تھا۔ اس نے کبھی کسی پر یہ خود سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ سردار عبدالرب نشتر کا بیٹا ہے۔ مشہور کالم نگار نصراللہ خاں اس اسکول میں ہمارے استاد ہوا کرتے تھے۔ گھر والوں اور نصراللہ خاں کے باہم مشورے کے بعد کچھ دن میں ان کے گھر بھی رہا ہوں۔ وہ مجھ پر بڑے مہربان تھے اور بطور شاعر میری صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے کئی بار اپنے کالموں میں کیا ہے۔ وہ جہانگیر روڈ پر سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے اور میرا بستر انہوں نے کوارٹر کے برآمدے کے ایک کونے میں لگوا دیا تھا۔ میں رات گئے اکثر تازہ غزل نصراللہ خاں کو جگا کے سنایا کرتا تھا۔ ان کی بیگم بھی اٹھ جایا کرتی تھی۔ اس زمانے میں میرا تخلص ''مست'' ہوا کرتا تھا اور میں ''حبیب احمد مست میانوی'' کہلاتا تھا۔ جب میں تازہ غزل سنانے کے لیے نصراللہ خاں صاحب کو جگاتا تو وہ کہا کرتے تھے کہ ''مست سو جاؤ صبح غزلیں سنیں گے'' مگر میرے اصرار پر وہ دونوں میاں بیوی اٹھ بیٹھتے اور بقول ان کے میں اپنی غزل سنا کر اپنا بوجھ ہلکا کر کے مزے سے سو جاتا اور وہ دونوں میاں بیوی میری غزل اور ترنم کے سحر میں بقیہ رات کروٹیں بدلتے گزار دیتے۔

حیدر بخش جتوئی

کراچی سے نکل کر میں حیدرآباد آ گیا۔ حیدرآباد میں میرا نام مزدور حلقوں میں تھوڑا سا مشہور ہو چکا تھا۔ کیونکہ میں نے حیدر بخش جتوئی کے ساتھ بھی کام کیا۔ اس سے پہلے میں نے ''امروز'' میں بھی کام کیا۔ ہماری ڈیوٹی لگا کرتی تھی کہ ہم حیدر بخش جتوئی کے الیکشن میں جائیں۔ عارف جلالی اور میں وہاں جاتے تھے۔ ایوب کھوڑو کے مقابلے میں حیدر بخش جتوئی الیکشن لڑ رہے تھے۔ ایک بار کھوڑو نے ہمارے قریب آ کر کہا کہ ''تم اسٹوڈنٹ یہاں کیا لینے آتے ہو؟'' میں نے اس سے کہا کہ ''ہم تمہاری بنیادیں اکھاڑنے یہاں آتے ہیں۔'' تو وہ یہ سن کر چلا گیا لیکن جہاں ہم رات کو ٹھہرے ہوئے تھے اس مکان کو اس نے آگ لگوا دی اور حیدر بخش جتوئی کی کار بھی جلا دی۔ وہاں ہمارا جلسہ بھی ہوا جہاں ہم نے یہ نظم پڑھی تھی۔

حیدر بخش جتوئی رے بھیا
حیدر بخش جتوئی
ہاری کا غم کھانے والا اور نہ دوجا کوئی
حیدر بخش جتوئی
ہم لاکھوں کی پونجی لوٹے جاگیردار اکیلا
اچھا پہنے کار میں گھومے ٹھاٹھ کرے البیلا
ہم تو روئیں بھوک کے مارے اور اس کے گھر میلہ
آپ تو اوڑھے شال دوشالہ ہمیں ملے نہ کوئی
حیدر بخش جتوئی رے بھیا
حیدر بخش جتوئی

ہمیں ایک دوست نے پانچ روپے کرائے کے لیے دیئے' ہم بہاولپور آ گئے۔ بہاولپور میں ہم نے رات کو ظہور نظر کے گھر دستک دی وہ جب دروازہ کھولنے نیچے اترا تو یہ سوچ رہا تھا کہ "ابراہیم جلیس ہوگا یا حبیب جالب ہوگا" لیکن صرف میں ہی تھا۔ ہم نے اس سے کہا کہ ہمیں پہلے کھانا کھلاؤ۔ اس نے بیوی کو جگایا اور کھانا وغیرہ کھلایا۔ ہم اس دن وہاں رہے' پھر ملتان آ گئے۔ ملتان سے ہم لاہور آ گئے۔

لاہور کی گلیاں

لاہور میں آ کر ہم نے سوچا کہ اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے جاری کیا جائے۔ ہم نے اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت تک ہم شاعر بن چکے تھے۔ ہماری غزلیں "ماہ نو" میں چھپ چکی تھیں۔ وہاں سید عبداللہ' ابواللیث صدیقی' عبادت بریلوی اور سید وقار عظیم استاد ہوا کرتے تھے۔ ہماری فیس وغیرہ تو معاف ہو گئی تھی لیکن رہنے کے لیے کوئی انتظام نہیں تھا۔ ہمیں ایک ملازمت مل گئی "آفاق" اخبار میں۔ سید نور احمد اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس میں ہم کام کرنے لگے۔ ہمارے ایک دوست سید فرید کاظم گیلانی تھے' ان کے والد تھے اولاد علی شاہ گیلانی (فرید کاظم بھی فوت ہو گئے ہیں) تو یہ دونوں ٹبی (شاہی محلہ) کے علاقے میں ایک خانقاہ کے پاس رہتے

تھے۔ وہاں ان کا گھر تھا اور خانقاہ ان کے بزرگوں کی تھی۔ وہاں خواتین نہیں تھیں۔ اس گھر کے کئی کمرے تھے ڈراؤنے اور اندھیرے۔ اس گھر کے نیچے تکیاں بیٹھتی تھیں۔ جب میں رات کو دو بجے ''آفاق'' سے کام کر کے نکلتا تھا تو پیدل جاتا تھا۔ جب وہاں پہنچتا تو پولیس مجھے پکڑ لیتی تھی اور وہ پوچھتے کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیونکہ وہ جگہ ''ایسی ہی'' تھی۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ میں رہتا ہی یہاں ہوں۔ انہیں یقین نہیں آیا کرتا تھا۔ پھر وہ میرے ساتھ جا کر دروازے پہ دستک دیتے تھے تو بزرگ اولاد علی شاہ گیلانی دروازہ کھولنے کے لیے اٹھا کرتے تھے۔ وہ تصدیق کرتا کہ یہ بچہ یہیں رہتا ہے۔ پھر میری جان چھوٹتی تھی۔ فرید کاظم نوجوان آدمی تھے وہ نہیں اٹھا کرتے تھے۔ پندرہ بیس دن بعد سید اولاد علی شاہ گیلانی نے مجھ سے کہا کہ ''بیٹا! میں بوڑھا ہوں' مجھ سے رات کو اٹھا نہیں جاتا تم اپنا کوئی اور انتظام کر لو۔'' مجھے ان پر ترس آیا۔ میں نے آفاق کے ایڈیٹر سے اپنی تنخواہ کا پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ پچھتر روپے ماہوار ہوگی۔ پچھتر روپوں میں کوئی مکان کرائے پر نہیں مل سکتا تھا۔ اور نہ ہی تعلیم کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا۔

ایک عجیب نفسانفسی کا زمانہ تھا۔ کوئی کسی کو لفٹ نہیں کراتا تھا۔ چائے کا بھی کوئی کسی کو نہیں پوچھا کرتا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب بیٹھا کرتے تھے۔ ان سے ہمارا تعارف بہت کم تھا۔ ہمارا شاعرانہ مرتبہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ ہم ان کے پاس بیٹھتے۔ بس جیسے کوئی طالب علم ہوتا ہے۔ ایک بار پھر لاہور کو میں نے خیر باد کہا اور یہ بھی کہا کہ

اب کس پہ ستم ایسے تم ایجاد کرو گی
لاہور کی گلیو مجھے تم یاد کرو گی
اتنی تو خبر ہے کہ پریشان تھا جالب
کس شہر گیا چھوڑ کے لاہور کہیں کیا؟

میری شادی

کراچی چلا گیا۔ بیچ میں ایک آدھ بار لاہور آیا۔ کراچی میں میری شادی ہوگئی۔ یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔ میرے چچا کی لڑکی سے میری شادی ہوئی۔ میری بیوی کے بارے میں سب فکر مند تھے کہ اس کی شادی کہیں اور ہونی چاہیے۔ میرے ذہن میں بھی نہیں تھا۔ میرے والدین کے ذہن میں بھی نہیں تھا۔ ہمارے چچا بڑے باذوق تھے۔ وہ مجھے بچپن سے ہی چاہتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں تو اپنی بیٹی کی شادی جالب سے ہی کروں گا۔ میرے والد نے کہا کہ دیکھو وہ آوارہ آدمی ہے۔ کبھی کہیں تو کبھی کہیں اس کا کوئی ٹھکانہ ہے کہیں؟ اس کے ساتھ شادی کرنا تمہاری بیٹی کے ساتھ ظلم ہوگا۔ لیکن چچا نے کہا کہ اگر میری بیٹی کی شادی ہوگی تو جالب کے

ساتھ ہی ہوگی۔ میرے والدین بھی راضی ہو گئے اور ہم جو بڑے ''ترقی پسند'' بنتے تھے' ہم نے بھی والدین کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیا۔ شادی ''غریبانہ'' ہی تھی دو چار دس لوگ تھے۔ ہمارے چچا بھی اس قابل نہ تھے اور نہ ہی ہم کہ بہت بڑا اہتمام کرتے۔ کہیں سے دو سو روپے لے کر شادی کر لی تھی۔ شادی کے بعد ہم نے ملازمت کر لی۔ جمیل الدین عالی نے ہمیں ایک انکم ٹیکس افسر کے ہاں ملازم رکھوا دیا تھا۔ میں ان کا ممنون ہوں۔ ان کا یہ مجھ پر احسان ہے۔ ان ہی دنوں جگر مراد آبادی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ ''کیا حال ہے؟'' میں نے کہا ''شادی کے غم کے جھیلتا ہوں۔'' کہنے لگے ''شادی بڑی اچھی ہوتی ہے' آدمی کو باقاعدہ بنا دیتی ہے۔'' وہ بڑے شریف آدمی تھے۔ بڑے اعلیٰ انسان تھے اور شاعر بھی بڑے تھے۔

بہر حال جتنا مجھے سمجھا گیا کہ میں لاابالی ہوں اتنا ہی میں قابل نکلا۔ میں نے اپنی شادی کا احترام کیا۔ شادی سے پہلے میں لائلپور بھی گیا تھا۔ وہاں میں نے کوہ نور ملز میں ملازمت کی تھی۔ ملازمت کیا تھی؟ میں نے ایک مشاعرہ پڑھا تھا۔ خواجہ ناظم الدین کی صدارت تھی۔ وہاں سعید سہگل بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں سنا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا' کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا' کچھ نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا' ہمارے ہاں آ جاؤ۔ وہاں چلے گئے اور اپنی افتاد طبع کے باعث مزدوروں کی حق تلفی اور استحصال کرنے پر وہاں کچھ شعر کہہ دیئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی بات ان کے خلاف جاتی تھی۔ میری ایک غزل تھی کہ

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں
پیار کی روشنی نہیں ملتی
ان مکانوں میں ان مکینوں میں

یہ غزل میں نے وہیں ایک مشاعرے میں پڑھی تو انہوں نے مجھے نکال دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کا شکر گزار ہوں کیونکہ میں خود یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔

ایک یادگار مشاعرہ

لائلپور ہی کے زمانے میں ایک مشاعرہ لاہور میں ہوا تھا۔ جس سے میں لاہور میں پہلی بار متعارف ہوا تھا۔ یونیورسٹی ہال میں اس مشاعرے کا انعقاد تھا۔ مجھے بس نہیں ملی تو میں ایک ٹرک والے کی منت خوشامد کر کے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ میں بہت لیٹ پہنچا۔ اس وقت مشاعرہ شباب پر تھا۔ شوکت تھانوی نظامت کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ جب میں پنڈال میں داخل ہوا تو شور برپا تھا کہ

زہرہ نگاہ...... زہرہ نگاہ...... لوگ کسی اور کو سننا نہیں چاہتے تھے۔ بس یہی شور تھا کہ زہرہ نگاہ زہرہ نگاہ...... اب شوکت تھانوی نے میری جانب دیکھا کہ میں آ گیا ہوں۔ فوراً انہوں نے کہا کہ "اب میں لائلپور سے آئے ہوئے نوجوان شاعر حبیب جالب کو دعوت سخن دیتا ہوں۔" اب جب میں مائیک پر آ کے کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ لوگ مجھ سے بھی وہی سلوک کر رہے ہیں جو دوسرے شاعروں کے ساتھ کر چکے تھے۔ مجھے شاعروں کی "لاشیں" نظر آ رہی تھیں۔ مشاعرہ کیا تھا "مقتل گاہ" بنا ہوا تھا۔ ان "لاشوں" میں مجھے اپنی "لاش" بھی نظر آنے لگی۔ اب دو باتیں میرے ذہن میں تھیں کہ اگر نہ سنایا تو حسرت رہ جائے گی۔ سناؤں تو شاید سن لیں۔ اس وقت مجھ پر ہوٹنگ ہو رہی تھی۔ لوگ شور کر رہے تھے کہ نکالوں کہاں سے آ گیا ہے یہ فقیر...... کیونکہ میرے سر کے بال بھی بڑے بڑے تھے۔ ایک چادر میں نے اوڑھی ہوئی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میں نے مطلع پڑھا۔

دل کی بات لبوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

اب جو میں نے یہ پڑھا تو لوگوں نے کہا ارے سنو! یہ تو کوئی "ٹھیک ٹھاک" شاعر ہے۔ میں نے پھر مطلع پڑھا اور پھر دوسرا شعر:

بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں

جب میں نے یہ شعر پڑھا کہ

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

جگر مراد آبادی مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے واہ واہ کہہ کر مجھے داد دی۔ میں نے مائیک چھوڑ کر ان سے ہاتھ ملایا اور دوبارہ آ کر وہ شعر پڑھا اور پھر غزل مکمل کی۔

جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کے لیے بدنام ہوئے
آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں
وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں

یہ غزل مشاعرے میں ہٹ ہوگئی۔ اس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ بہت شہرت ہوئی اور مجھے بہت عزت ملی۔ لوگوں نے کہا۔ ایک

اور...... ایک اور...... مکرر...... مکرر...... اب شوکت تھانوی مائیک پر آ گئے۔ اور کہنے لگے "دیکھئے ابھی فلاں غازی آبادی ہیں ابھی فلاں جگہ سے لکھنوی آئے ہوئے ہیں پھر موقع دیا جائے گا' وغیرہ وغیرہ" تو میں نے سوچا کہ یہ شوکت تھانوی جو کام دکھا رہا ہے یہ مجھے پڑھانا نہیں چاہ رہا جبکہ لوگ مجھے سننا چاہتے ہیں۔ غصہ مجھے تو تھا ہی کہ کون صاحب ہیں وہ زہرہ نگاہ...... میں فوراً مائیک پر آ گیا اور کہا۔ "حضرات! آپ مجھے سننا چاہتے ہیں؟" انہوں نے کہا "ہاں" میں نے کہا کہ "پھر یہ کون ہے بیچ میں! ہٹیے بیچ میں سے۔" یہ کہہ کر میں نے غزل سنانا شروع کر دی۔ دوسرے دن "احسان" اخبار میں ظہور الحسن ڈار نے لکھا کہ زہرہ نگاہ' جگر اور جالب کو مشاعرے میں سنا گیا۔ زہرہ نگاہ بہت خوبصورت پڑھتی تھی۔ اور بڑے اچھے سادہ شعر کہتی تھیں ان کی آواز میں ایک عجیب قسم کی تہذیب تھی ایک شدت تھی ایک پاکیزگی تھی۔ ان کے بعد پڑھنا بڑا مشکل کام تھا تو اس مشاعرے کے دوسرے دن میں لاہور میں زیر بحث رہا۔ اس طرح میں لاہور میں بھی متعارف ہو گیا۔

◆◆◆

شب عہد کم نگاہی

جب پاکستان بن رہا تھا تو ہمارے ذہن میں پاکستان کا جو تصور تھا وہ آزاد خوشحال اور جمہوری پاکستان تھا۔ جب ہمارے یہ تمام خواب ایک ایک کر کے ٹوٹنے اور بکھرنے شروع ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ برسراقتدار طبقہ ہمارے مسائل حل نہیں کرسکتا اور اس کی سوچ ہمیں منزل تک نہیں پہنچا سکتی۔ مسلم لیگ کی قیادت کرنے والے جمہوریت اور اختلاف کو برداشت ہی نہیں کرتے تھے۔ یہ معاملہ جمہوریت کشی کا شروع ہو چکا تھا۔ جناح ایک ڈیموکریٹک آدمی تھے لیکن انہیں اتنی مہلت نہ ملی۔ اگر وہ زندہ رہتے تو آئینی مسائل بھی حل کر جاتے۔ یہ صلاحیت ان میں تھی کہ وہ آئین بنا سکتے تھے پھر کوئی اعتراض بھی نہ ہوتا۔ وہ آئین بڑا ہی ڈیموکریٹک اور سیکولر ہوتا۔ وہ قائد تھے بانی تھے۔ ان کی سوچ ماڈرن تھی۔ کئی لوگ ان کو مشورہ بھی دیتے رہے لیکن جو Reactionery تھے ان سے وہ متفق نہیں تھے۔ یہ جو ملاں آج کل یہی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم نے ہی پاکستان بنایا اس وقت تو یہ کہیں بھی نظر نہیں آتے تھے۔ جمعیت علمائے ہند تو اس وقت پاکستان کی مخالف تھی اب بھی ہے۔ جماعت اسلامی والے جو اس وقت پاکستان کی تشکیل کے مخالف تھے اب یہ کہہ رہے ہیں کہ جیسے تمام مشورے انہوں نے ہی اس وقت قائداعظم کو دیئے تھے۔

پاکستان جب بن چکا تو کراچی میں آئے۔ ان خوابوں کی تعبیر ہم نے نہ دیکھی۔ وہ ماحول اور فضا ہمیں نہ ملی۔ بیکاری اور بیروزگاری اور جمہوریت کی مخدوش صورت حال ہم نے دیکھی۔ ان دنوں ہمارا تعلق ترقی پسند مصنفین سے ہوا۔ ان میں ممتاز حسین تھے ابراہیم جلیس' ظہور نظر تھے۔ ریاض روفی' احمد ندیم قاسمی لاہور میں تھے یہ عزیز اثری بھی وہیں کراچی میں تھے۔ ان کا میکلوڈ روڈ کراچی میں محمدی بلڈنگ میں دفتر تھا جہاں ہر ہفتے ہم جایا کرتے تھے اور ادب میں مقصدیت اور افادیت کا شعور جو عوام کے مفاد کا تحفظ کرے اور جو امپریلزم سے بیرونی سامراج کے ایجنٹوں سے نجات دلائے' ان پر بحثیں ہوتیں۔ یہ مقصد شاعری میں اس وقت ہم لے کر آئے اور ان کو ہی ہم نے اپنا منشور بنایا۔ پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک سائنٹیفک پارٹی سے ہی تعلق تھا۔ واجبی سا سمجھ لیں یا باقاعدہ' لیکن یہ ایک آزادانہ ترقی پسند تنظیم تھی۔ مزدوروں اور کسانوں کے جلسوں میں ہم آیا جایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک بڑی پارٹی انڈیا میں تھی۔ وہاں کے لوگوں سے بھی متاثر تھے۔ سجاد ظہیر یہاں انٹرنیشنل کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے انڈر گراونڈ کام کرتے رہے۔ ترقی پسند مصنفین سے ہم نے بہت کچھ سیکھا اور ہماری تربیت ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ کالج اسٹوڈنٹ

بڑے پڑھے لکھے اور نظریاتی ہوا کرتے تھے۔ ان میں جو لوگ تھے ایک عزیز احمد خان کا نام یاد ہے۔ ایس ایم کالج تھا جس کے پرنسپل جمیل واسطی تھے۔ وہ بھی شاعر تھے۔ ایس ایم کالج میں بھی میٹنگز ہو جایا کرتی تھیں۔ ان سے ہم نے استفادہ کیا۔ وکٹوریہ روڈ صدر میں کافی ہاؤس تھا۔ وہاں سارا دن مباحثے ہوتے تھے۔ سیاسیات' اقتصادیات' مارکسزم اور سوشلزم پر۔ آج کے اور اس دور کے اسٹوڈنٹ میں جو میں فرق دیکھ رہا ہوں کہ اس دور کے طالب علم پر اعتبار کیا جا سکتا تھا۔ ان میں حقیقت پسندی تھی' ایک سنجیدگی' پاکستان کو سامراج دشمن اور خوشحال بنانے کی لگن میں رہتے تھے۔ ان میں شعور تھا۔ یہ سب کچھ ہمیں راستہ سمجھانے کی شکلیں تھیں۔ ہماری منزل متعین ہو گئی تھی کہ پاکستان کو ہم نے خود کفیل بنانا ہے۔ جمہوری بنانا ہے۔ آزاد بنانا ہے اور مذہبی تعصبات کا خاتمہ کرنا ہے۔ پاکستان کا جو باشندہ ہے اس کو سب کے برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ مخلوط قسم کا طریقہ انتخاب ہمارے ذہن میں تھا۔ اب تو جداگانہ ہو گیا ہے۔ ہمارے خیال کی تو اب یہ نفی ہے۔

مجاز لکھنوی

کراچی میں ہمیں جو دوست ملے۔ جنہوں نے ہمیں متاثر کیا وہ بھی اسٹوڈنٹ تھے۔ ترقی پسند رائٹرز تھے۔ کسانوں میں حیدر بخش جتوئی تھے۔ آزاد پاکستان پارٹی بھی بنی تھی اس میں میاں افتخار الدین بھی تھے۔ انہوں نے اپنا پرچہ "امروز" نکالا۔ اس میں بھی ہم نے کام کیا۔ گرینڈ ہوٹل سے یہ پرچہ نکلتا تھا۔ وہاں ہر سال "ڈان" کا مشاعرہ ہوتا تھا۔ مجاز لکھنوی آیا کرتے۔ ایک بار گرینڈ ہوٹل میں ان کو ٹھہرایا گیا تھا۔ مجاز کے ساتھ میری ڈیوٹی لگ گئی تھی۔ میں ان کو گھما پھرا کے واپس ہوٹل لے آتا' سلا کے لٹا کے پھر گھر واپس جاتا۔ مجاز ایک بڑا شاعر اور منصف مزاج آدمی تھا۔ وہ بڑا معصوم شاعر تھا۔ اس زمانے میں اس کی صحت کی صورت حال کوئی خاص اچھی نہیں تھی۔ ان کی شراب نوشی جاری تھی۔ کراچی میں شراب کی باریں کھلی ہوتی تھیں۔ وہ "بار در بار" پھرتا تھا۔ ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ نصیر حیدر ان کے دوستوں میں تھے۔ وہ کراچی میں تھے۔ نصیر کے ماموں بڑے کنٹریکٹر تھے۔ بڑے متمول آدمی تھے اور مجاز ان کے دوستوں میں تھے۔ وہ مجاز کی بڑی تواضع کیا کرتے تھے۔ نصیر حیدر خود بڑے اچھے صحافی اور دانشور تھے۔ ملک غلام جیلانی سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ جب نصیر حیدر مل جاتے مجاز مجھے کہتے کہ اچھا بھئی اب آپ جائیں اب نصیر حیدر مجھے چھوڑ دیں گے۔ مجاز لکھنوی جہاں جاتے تو میں بھی ساتھ ہوتا تھا ان سے جب بھی کسی شعر کی فرمائش ہوتی تو وہ کہتے کہ پہلے حبیب جالب سے سنو۔ وہ خود اتنا بڑا شاعر تھا لیکن خود سے پہلے میرا کلام سنواتے تھے۔ پھر اپنا سناتے تھے اور بزرگوں کی طرح تمہید باندھ کر کہا کرتے تھے کہ جالب آگے چل کر بہت بڑا شاعر ہوگا۔ مجاز لکھنوی کی سادگی اور ذہانت کے بڑے واقعات ہیں۔

ایک صاحب ان کے ساتھ ہر شام لگ جایا کرتے تھے اور مجاز کہتے کہ ''بھئی میں خود مہمان ہوں اور یہ آدمی میرا مہمان ہو جاتا ہے۔ ذہن و دل کے ساتھ ساتھ میری جیب پر مسلط ہو جاتا ہے' دیکھو میاں جب یہ طے ہے کہ تم بور ہو تو جیب میں پیسے کیوں نہیں رکھتے۔'' ایک دفعہ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں تو انہوں نے کہا'' جہاں سے آگے آب وہوا ہی آب وہوا ہے۔'' (مجاز کلفٹن کے علاقے میں ٹھہرے ہوئے تھے) مجاز کے لطائف بہت مشہور ہیں۔ وہ ایک بے حد سیدھا' مخلص اور بیباک شاعر تھا۔ اس کا بھی مجھ پر اثر ہے۔

نیفے میں غزلیں

استاد قمر جلالوی' نہال سیوہاروی' سیماب اکبر آبادی بادی مچھلی شہری یہ وہ اساتذہ کرام ہیں جن کو میں نے بغور سنا۔ مشاعرے ہوتے تھے' بحث مباحثے ہوتے تھے۔ شاگردوں کا عالم یہ تھا کہ اکثر استادوں کی غزلیں ہی پڑھا کرتے تھے۔ ان کے اثر سے کوئی کوئی ہی نکلتا تھا۔ استاد قمر جلالوی کا عالم یہ تھا کہ وہ خود تو اپنی شاعری نہیں لکھتے تھے۔ کسی سے لکھوا کے اپنے نیفے میں اڑس لیتے تھے۔ وہ زبانی کہہ دیتے کوئی نہ کوئی انہیں لکھ دیتا۔ بعض اوقات نیفے میں ہی غزلیں ڈھل جاتی تھیں۔ مشاعروں میں بہت ساری غزلیں وہ شاگردوں کو بنا کر دیتے تھے۔ پھر چلتے چلتے اپنی غزل بناتے تھے یا مشاعرے کے دوران لکھتے تھے۔ وہ بہت قادر الکلام شاعر تھے۔ میں نے ان کو قریب سے دیکھا اور سنا ہے۔

ہمیں شعر و شاعری کا شوق دیوانگی کی حد تک تھا۔ شروع شروع میں ایک واجبی سا شاعر تھا۔ ایک بار بزم اقبال کا مشاعرہ ہوا تھا۔ اس میں مجھے منتخب کر لیا گیا تھا۔ شہر میں یہ بڑا شہرہ تھا کہ ایک نوجوان کو پڑھنے کا موقع دیا جا رہا ہے حالانکہ بڑے بڑے اساتذہ موجود تھے۔ شاعروں میں جو حسد ہوتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے۔ میں سادہ سادہ غزل کہتا تھا لیکن پڑھتا ترنم سے تھا۔ میں نے جگر مراد آبادی کو ترنم سے پڑھتے سنا تھا۔ حفیظ جالندھری کو بھی ترنم کے ساتھ میں نے پڑھتے سنا۔ اس طرح ترنم سے پڑھنے کا ہمیں شروع ہی سے شوق تھا۔ آواز بھی میری بہت اچھی تھی۔ وہ اساتذہ جو اکثر دوسروں کو غزلیں لکھ دیتے تھے ان میں سے ایک شاعر راغب مراد آبادی سے ہمارا بھی رابطہ ہو گیا۔ وہ کسی نہ کسی کو شاگرد بنانے کی تاک میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں شاگرد بنانے کے مقابلے جاری تھے۔ ہم میٹرک کے طالب علم تھے انہوں نے ہم سے نکات السخن' شعر العجم جیسی کتابوں کا ذکر کیا کیونکہ ہم طالب علم تھے اور ان کا ایسی کتابوں کا ذکر ہمارے سامنے کرنے کا مقصد ہمیں مرعوب کرنا تھا لیکن ہم خود شاعر تھے۔ وہ اپنے شعروں میں بھاری بھرکم لفظ استعمال کرتے تھے جس سے شعر کی سادگی مجروح ہوتی تھی۔ میں اس وقت ان سے بیزار ہوا جب میں ایک مشاعرے میں غزل

پڑھ رہا تھا اور میرے پیچھے وہ خود شاعروں سے داد وصول کر رہے تھے کہ یہ غزل میں نے ہی لکھ کر دی ہے۔ یہ بات وہ اشاروں سے کہہ رہے تھے۔ میں نے اس وقت سوچا کہ یہ "برگد" تو مجھے کھا جائے گا۔ مجھے آگے نہیں چلنے دے گا۔ لوگ یہی سمجھتے رہیں گے کہ مجھے یہی لکھ کر دے رہا ہے' پھر میں نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ اسی طرح ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ جمیل الدین عالی سے میں اور راغب مراد آبادی ملنے کے لیے گئے۔ جمیل الدین عالی اس وقت نوجوان شاعر تھے۔ ان کا چہرہ اور حالت بھی "شاعرانہ" ہی تھی۔ گریبان کھلا' ٹائی ڈھیلی ڈھالی۔ ان سے میرا تعارف کروایا گیا۔

"یہ حبیب جالب ہیں۔ کیا شعر کہتے ہیں۔ سبحان اللہ!"

"تم شاعر ہو؟" عالی نے پوچھا۔

"جی ہاں" میں نے کہا۔

"کوئی شعر سناؤ۔"

میں نے انہیں اپنا ایک شعر سنایا۔

شعر سن کر وہ بولے۔ "یہ تمہارا شعر ہے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں' یہ شعر میرا ہی ہے۔"

"واقعی!"

"جی ہاں واقعی"

"تو پھر اس کے ساتھ کیوں آئے ہو؟" عالی نے مجھے قدرے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

یہ ایک ردعمل تھا ان اساتذہ کے خلاف جو غزلوں کا کاروبار کرتے تھے۔ سیماب اکبر آبادی' رئیس امروہوی' قمر جلالوی اور راغب مراد آبادی لوگوں کو غزلیں لکھ کر دیتے تھے۔ ان "برگدوں" سے جو بچ گیا اور جس میں خودداری ہوتی تھی وہ شاعر ہو گیا اور جو ان کے سائے میں ہی رہا وہ مر مرا گیا۔ میں ان کے چنگل سے نکل گیا۔ یہ بہت بڑا مرحلہ ہوتا ہے جسے طے کرنا آسان نہ تھا لیکن میں نے یہ مرحلہ بھی کامیابی سے طے کیا۔

"جنگ" میں ملازمت

کراچی میں بہت زیادہ شاعر تھے۔ ایک لمبی چوڑی فہرست تھی۔ کہیں بھی مشاعرہ ہو باری نہیں آتی تھی۔ میں نے ان دنوں

روز نامہ "جنگ" میں ملازمت کر لی تھی۔لیکن میرے ذہن میں پنجاب کا ہی بار بار خیال آتا کہ مجھے پنجاب ہی جانا چاہیے۔ایک دن میں نے میر خلیل الرحمن مرحوم سے کہا کہ "جناب میں اب آپ کے ہاں سے جانا چاہتا ہوں' مجھے پنجاب یاد آ رہا ہے۔" تو میر صاحب نے مجھ سے کہا۔"بھئی کیا ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"ہم نے کہا۔"آپ نے تو ہماری بہت سرپرستی کی ہے۔" مجھے یاد آتا ہے کہ میر خلیل الرحمن نے مجھے "جنگ" سے نکالا نہیں تھا۔اس کے مقابلے میں میاں افتخار الدین کے "امروز" سے جو پانچ چھ آدمی انہوں نے نکالے تھے ان میں ایک میں بھی تھا۔ایک نظریاتی آدمی کے مقابلے میں یہ بندہ (خلیل الرحمن) بہتر تھا۔جب مجھے "امروز" سے نکالا گیا تو میں نے میاں افتخار الدین سے کہا کہ آپ نے میری زندگی بیک جنبش قلم سڑک پر پھینک دی ہے اس پر آپ نظر ثانی فرمائیں تو انہوں نے کہا کہ "میرا اس معاملے سے تعلق نہیں ہے' سید امیر حسین شاہ کا تعلق ہے۔" امیر حسین شاہ اس وقت مجھے نہیں جانتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں ہم دونوں نیشنل عوامی پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے ممبر ہوئے پھر جب ہمارا نام ہوا۔جلسے وغیرہ پڑھنے شروع کئے تو میاں افتخار الدین بھی ہم پر مہربان ہوئے۔اس واقعہ سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرے "امروز" سے نکالے جانے پر میاں افتخار الدین کا صحافت و سیاست میں جو مقام و مرتبہ ہے وہ کم ہو جاتا ہے۔ان کا بہت بڑا کانٹری بیوشن ہے۔انہوں نے معیاری اور خوبصورت پرچے نکالے اور جمہوری سیاست کی اور ترقی پسند سیاست کو پروان چڑھایا۔

سانگ رائٹر

پنجاب (لاہور) ہمارا ایک دوبارہ آنا جانا ہوا کیونکہ پھر ہماری شادی ہو گئی۔اس وقت ہم لاہور سے کراچی واپس چلے گئے تھے لیکن منزل اور تھی اس لیے فلموں سے بھی واسطہ ہو گیا تھا۔ہم فلموں کے سانگ رائٹر ہو گئے۔ہمارے دوست علاؤالدین ایکٹر تھے وہ ہمیں کراچی میں اکثر ملا کرتے تھے۔عارف جلالی کے ساتھ ان کے تعلقات بمبئی سے ہی تھے۔ہم دونوں علاؤالدین سے ملتے اور گپ شپ رہتی تھی۔علاؤالدین ادب دوست تھے' شعر خود ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔انہوں نے بھی مجھے لاہور آنے کی دعوت دی تھی۔میں نے انہیں غزل سنائی تو انہوں نے کہا کہ آپ لاہور آئیں آپ سے فلم کے لیے گیت لکھوائیں گے۔

لاہور میں ہمارے رشتہ دار بھی تھے۔ہماری بہن کی شادی بھی لاہور میں ہی ہونا تھی۔۱۹۵۶ء کے اردگرد ہم اور ہمارے والدین لاہور آ گئے۔میری بیوی اور والدین کچھ عرصہ کے لیے جھنگ میں مقیم ہوئے اور میں لاہور میں ہی علاؤالدین کے ہاں قیام پذیر ہو گیا۔علاؤالدین مجھے صبح پانچ روپے دے دیتے تھے اور کہتے تھے کہ "آپ ادھر ادھر پھریں' ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آپ سے گانے لکھوائے جائیں۔" علاؤالدین بہت اعلیٰ آرٹسٹ تھا اور انسان بھی اعلیٰ تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ جعفر شاہ بخاری جو فلم ''بھروسہ'' کے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے مجھے دور سے آواز دی۔ میں نے ان سے کہا۔ ''کون ہیں آپ' میں تو آپ کو نہیں جانتا۔'' انہوں نے کہا۔ ''علاؤ الدین نے کہا ہے کہ آپ سے گانے لکھوائے جائیں۔'' میں کھڑا رہا۔ وہ ٹیکسی سے اتر کر میرے پاس آیا۔ مجھے زور دے کر زبردستی اپنے ساتھ بٹھالیا اور شاہ نور اسٹوڈیو لے گیا۔

پہلی کتاب

اب مرحلہ آیا ہماری پہلی کتاب ''برگ آوارہ'' چھپنے کا۔ ہمارے ایک دوست اکرام الحق جالندھری تھے۔ وہ مکتبہ کارواں لاہور کے مالک چوہدری عبدالحمید کے بھی دوست تھے۔ اکرام الحق بڑے ہی ملنسار اور صلح جو آدمی تھے۔ کافی ہاؤس میں بیٹھا کرتے تھے۔ ان کی یہ عادت تھی کہ وہ دو آپس میں لڑنے والوں کے بیچ بڑی خوبی سے صلح کروادیتے تھے۔ مثلاً حمید نظامی سے کہنا کہ ''وہ تو آپ کی بڑی تعریف کررہے تھے۔'' اور نظامی صاحب کے مخالف سے کہہ دینا۔ ''نظامی صاحب تو آپ کی بڑی تعریف کررہے تھے۔'' یوں ان کو ملا دینا۔ یہ ان میں خوبی تھی۔ دوستوں کے وہ دوست تھے۔ اسی طرح انہوں نے میرا ذکر چوہدری عبدالحمید سے کیا کہ ''جالب صاحب تو آپ کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ آپ بڑے اچھے شاعر ہیں۔ آپ کا بڑا اچھا ادارہ ہے۔'' انہوں جواباً کہا کہ ''جالب صاحب کا کلام تھوڑا سا میں نے بھی سنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی کتاب چھاپی جائے لیکن میں یہ سنتا ہوں کہ بس ترنم ہی ترنم ہے شعر تو وہ خود نہیں کہتے۔'' چنانچہ اکرام الحق مجھے ان کی دکان پہ لے گئے جو انارکلی میں قطب الدین ایبک کے مزار کے قریب ہی تھی' وہیں میں نے سعادت حسن منٹو کو بھی دیکھا تھا۔ جن سے بعد میں ملاقاتیں رہیں۔ چوہدری صاحب نے مجھ سے بھی وہی بات کی۔ ''جالب صاحب آپ کا کلام تو مجھے بے حد پسند ہے لیکن ایک شک وشبہ ہے کہ آپ خود شعر نہیں کہتے' یہ میری الجھن آپ دور کردیں۔'' انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''میں آپ کو ایک مصرعہ دیتا ہوں آپ چار پانچ شعر وزن میں کہہ دیں۔ خیال کی بلندی پستی کو فی الحال چھوڑ دیں۔'' میں مسکرایا اور سوچا کیسے کیسے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں نے ان کو پانچ چھ شعر وہیں لکھ دیئے تو انہوں نے کہا۔ ''میں مطمئن ہوگیا۔'' برگ آوارہ یوں شائع ہوئی۔ برگ آوارہ کا سرورق حنیف رامے نے بنایا تھا۔ ''سرمقتل'' کا بھی انہوں نے بنایا ہے۔ کتاب چھپنے کے بعد میں مستند شاعر ہوگیا۔ لاہور میں متعارف تو اسی مشاعرے سے ہوگیا تھا جس میں پہلی بار یہ غزل پڑھی تھی۔

''دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں''

لاہور ایک بڑا شہر ہے اور اچھا شہر ہے اگر ذرا بھی کسی میں صلاحیت ہوتی ہے تو اسے قبول کرلیتا ہے۔ مثلاً سجاد باقر رضوی جو پروفیسر تھے' کسی زمانے میں ایک کلرک ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے محنت کی۔ یہاں آئے۔ پروفیسر ہوگئے۔ شاعر اور نقاد بھی ہو

گئے۔ لاہور میں یہ خوبی ہے کہ صلاحیت ہو تو قبول کر لیتا ہے نہیں ہے تو اسے قبول نہیں کرتا۔ لاہور شہر میں جمنے کے لیے جسم میں کافی خون ہونا چاہیے۔ یہ شہر خون بہت مانگتا ہے لیکن جب کسی کو قبول کر لیتا ہے تو پھر اسے بہت عزت بخشتا ہے۔ اس شہر لاہور میں بطور ایک فلم رائٹر بھی مجھے مقام ملا اور ایک صاحب کتاب شاعر کی حیثیت سے بھی عزت ملی۔ میری پہلی کتاب یہیں سے شائع ہوئی۔

سر مقتل

فلموں کے ساتھ میرا رابطہ جاری تھا مگر ترقی پسند تحریکوں نے مجھے عملی سیاست کی طرف راغب کر دیا تھا لہٰذا لاہور میں بھی ہم خیال لوگوں کے ساتھ میری وابستگی ہوئی۔ اس وقت نیشنل عوامی پارٹی کی بنیادیں رکھی جا رہی تھی۔ یہاں ہمارے دوست رؤف طاہر میاں محمود علی قصوری اور شیم اشرف ملک تھے۔ لائلپور میں سیف خالد تھے۔ لاہور میں ہی سردار شوکت علی اور سی آر اسلم تھے۔ ہمارا زیادہ رابطہ میاں محمود علی قصوری سے رہا کیونکہ وہ بڑے خلیق' بڑے مخلص اور بڑے قانون دان اور بنیادی انسانی حقوق کے بہت بڑے علمبردار تھے یہاں تک کہ وہ بنیادی انسانی حقوق کے ایک ٹریبونل کے بھی جج ہوئے۔ ان سے ہمارا بھرپور رابطہ رہا۔ میاں محمود علی قصوری متحدہ ہندوستان میں جیل کاٹ چکے تھے۔ تحریک آزادی ہندوستان میں بھی ان کا حصہ تھا۔ میاں محمود علی قصوری آزاد پاکستان پارٹی کے بھی صدر رہے۔ مصیبت کسی بھی جماعت کے سیاسی ورکر پر آ جائے وہ اس کی مدد مفت کرتے تھے' وہ ہمارے لیے ایک بہت بڑا Shelter تھے۔

میں نے جب نیشنل عوامی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تو یہی وہ لوگ تھے جن لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر میں خوش ہوتا تھا۔ جن کو اپنا ساتھی سمجھتا تھا' جن کو مجھ پر اور مجھے ان پر اعتماد تھا۔ جن کی رفاقت پر مجھے ناز تھا۔ وہ نظریات کے اعتبار سے بھی میرے ہم خیال تھے۔ حکمران طبقے یا پارٹی سے تعلق تو ہمارا آج تک نہیں ہے۔ ہماری جدوجہد' جمہوریت' آزادی' خوشحالی اور سامراج سے نجات کے لیے تھی۔ یہ منشور ان کا تھا۔ یہی منشور ہمارا تھا۔ فلم سے ہمارا تعلق اتنا نہ رہ سکا کیونکہ ہمیں سیاسی جلسوں میں جانا پڑتا تھا' ہم فلم کے لیے ہر وقت موجود نہیں رہ سکتے تھے۔ کئی برسوں تک فلم کے لیے نہیں لکھا لہٰذا فلم سے ہمارا بھرپور تعلق نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔

یہ مارشل لاء وغیرہ جو آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ترقی پسند تحریک زور پکڑ رہی تھی اور ایسٹ پاکستان اور ویسٹ پاکستان میں سیکولر ڈیموکریٹک سیاست پروان چڑھ رہی تھی تو یہ مارشل لاء ان کے خوف سے ہم پہ مسلط ہوئے کہ "ہم آ جائیں گے۔" مفاد پرست طبقہ جن کا مفاد تھا ان کو اینٹی امپریلزم اور جمہوریت ناپسند تھی۔ مزدوروں کی تحریکیں بھی عروج پہ تھیں۔ جب ان صنعت کاروں کو چھوٹ دی گئی کہ تم اپنے کارخانے بنا لو اور یہ مزدوروں کے ساتھ وعدے کرتے رہے لیکن جب دینے کا وقت آیا تو مارشل لاء لگ گیا

بلکہ لکھوا دیا گیا۔قائد اعظم کے بعد ہی سے بیوروکریسی ہم پہ مسلط ہو گئی تھی۔

راولپنڈی سازش کیس تو ایک معمہ ہی ہے۔فیض صاحب کہاں کے ''سازشی'' تھے۔ایسے ہی یہ پکڑے گئے۔کرنل فیض احمد فیض کرنل بھی تو یہ کہلاتے تھے اور یہ ''ان'' میں بیٹھتے تھے اور دھر لیے گئے ورنہ ان کا کیا تعلق ہوگا۔ہوسکتا ہے ''وہ'' کامیاب ہو جاتے تو انقلاب آ جاتا۔اس سازش کے فیض صاحب پہ الزامات ہی تھے۔

نیشنل عوامی پارٹی میں یہ لوگ جن کا میں نے ذکر کیا ہے نیشنلسٹ اور اینٹی امپیریلسٹ تھے۔ڈیموکریٹک اور پروگریسو تھے۔ ایسٹ پاکستان میں بھی پارٹی کے اندر اسی طرح کے لوگ تھے، کمیونسٹ نیشنل عوامی پارٹی میں ہی سما گئے۔ہم اسی کوشش میں تھے کہ آزاد غیر جانبدار اور خودمختار پاکستان کی تعمیر و ترقی ہو لیکن ہمارے تمام خواب مارشل لاؤں نے چکنا چور کر دیے۔

۶۲ء کا دستور

ایوب خان کے مارشل لاء کے خلاف آواز اٹھانا بڑے ہی حوصلے کی بات تھی۔مجھے یاد نہیں کہ ایوب خان کے خلاف میرے علاوہ کسی نے آواز اٹھائی تھی البتہ جسٹس کیانی ہائیکورٹ کی سنگین دیواروں کے اندر بیٹھ کر مارشل لاء کو طنز و مزاح کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ہم چونکہ عملی سیاست میں تھے۔دوسرے ترقی پسند شاعر سیاست چھوڑ چھاڑ چکے تھے، خوفزدہ ہو گئے تھے اور ادھر ادھر ہو چکے تھے یا سیاست سے ہی بیزار ہو گئے تھے۔موچی گیٹ میں جانا ہی وہ اپنی توہین سمجھنے لگے تھے کہ ان کا اس سے مرتبہ کم ہوتا ہے۔ہم مشنری لوگ تھے۔ہم نے تو شعر کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔میرے علاوہ اور کون تھا اس وقت جو میری طرح مارشل لاء کے خلاف واشگاف انداز میں باتیں کرتا تھا۔یہ میں نہیں جانتا۔حسین شہید سہروردی جیسے بہادر آدمی کو بھی دیکھا جب ان پر ایبڈو لگا تو وہ اپنی وکالت خود کرتے تھے۔اس کی شان یہ تھی کہ وہ ورکروں پہ مرتا تھا اور ان کی امداد کرتا تھا۔جب میں نے سہروردی شہید کو ''برگ آوارہ'' پیش کی تو انہوں نے تمام ورکروں کو اپنے کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا اور پھر مجھے تین سو روپے دیے حالانکہ کتاب کی قیمت تین روپے تھی۔میں نے ان سے کہا کہ آپ نے یہ بہت زیادہ پیسے دے دیے۔انہوں نے کہا ''ہم آپ کی کتاب کی قیمت نہیں دے سکتے یہ تو ہماری طرف سے نذرانہ ہے۔'' انہوں نے مجھے ایک پنجابی مشاعرے میں سنا تھا جس کی صدارت راجہ غضنفر علی نے کی تھی۔وہ پرانے نیشنلسٹ تھے۔بڑے ذہین آدمی تھے، اچھے ادیب تھے۔اپنی ذہانت کے ہاتھوں انہوں نے بہت نقصان اٹھایا۔وہ سہروردی صاحب کے زیادہ قریب رہتے تھے۔مجھے یاد ہے کہ ایک روز میں شورش کاشمیری کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، سہروردی بھی تھے۔میں نے وہاں ایک پنجابی غزل پڑھی۔

جالب سائیں کدی کدائیں چنگی گل کہہ جاندا اے
لکھ پوجو چڑھدے سورج نوں آخر ایہہ لہہ جاندا اے
باجھ تیرے او دل دے ساتھی دل دی حالت کیہ دساں
کدی کدی ایہہ تھکیا راہی رستے وچ بہہ جاندا اے
ساندل بار دیہندیئے ہیرے وسدے رہن تیرے ہاسے
دو پل تیرے غم دا پروہنا اکھیاں وچ رہ جاندا اے
ہائے دوآبے دی او دنیا جتھے محبت وسدی اے
ہنجو بن کے دکھ وطناں دا اکھیاں چوں وہہ جاندا اے
فجرے او چکاندا ڈٹھا جالب ساری دنیا نوں
راتیں جہڑا ایک دکھاں دے بس ہس کے سہہ جاندا اے

پنجابی کا مشاعرہ تھا' وہ بھی ایسا جیسے کوئی خاموشی کے تالاب میں پتھر پھینکے۔ اس قسم کے وہ پتھر تھے۔ غزل سن کر سہروردی بہت خوش ہوئے اور کہا کہ "ہم نہیں جانتے کہ آپ کتنے بڑے شاعر ہیں لیکن ہم آپ سے یہ کہتے ہیں کہ آپ بڑے بہادر شاعر ہیں۔" یہ زمانہ مارشل لاء کا خوفناک زمانہ تھا۔ اس وقت میں نے اپنی مشہور نظم کہی تھی "دستور"

۱۹۶۲ء کا دستور ہم پر مسلط کیا گیا تھا' یہ نظم اسی کے بارے تھی۔ اب اس کو پڑھنے کا معاملہ تھا کہ اس کو پڑھا کہاں جائے۔ اتفاق سے ایک مشاعرہ ہو گیا۔ یہ مشاعرہ مری میں تھا جہاں پاکستان کے شاعروں کی "کریم" اکٹھی تھی۔ سب وہاں موجود تھے۔ غالباً جشن مری تھا۔ شاعروں میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو "کتواؤ" جیسے پتنگوں کے پیچ ہوتے ہیں اور کسی ایک کی پتنگ کٹ جاتی ہے۔ اسی طرح مشاعروں میں شاعر کاٹے جاتے ہیں کیونکہ شاعر آپس میں حسد رکھتے تھے۔ کسی کی واہ واہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس زمانے میں تین شاعر بڑے مشہور تھے بلکہ مشاعرہ لوٹ قسم کے شاعر تھے۔ سید محمد جعفری' شوکت تھانوی اور ظریف جبل پوری۔ یہ لوگ طنز و مزاح میں شعر کہتے تھے اور لوگ ان کو سن کر بہت خوش ہوتے تھے اور وزراء بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ حکمران طبقہ بھی ان سے خوش رہتا تھا۔ شوکت تھانوی جب اس مشاعرے میں غالب کی غزل کا ہندی ورشن پیش کر چکا اور غالب کی توہین کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو ہنسا چکا تو ایک شاعر نے جو مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے یعنی ناظم مشاعرہ بھی تھے اس کو اشارہ

کیا کہ اب جالب کو گنواؤ۔ میں نے وہ اشارہ دیکھ لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہاں غزل نہیں چلے گی اور غزل سنانی بھی نہیں چاہیے تھی کیونکہ جب یہ تین مزاحیہ شاعر لوگوں کو ہنسا چکے ہیں اور ان پر یہاں کے مارشل لاء اور اس کے مسلط کردہ دستور کا کوئی بھی اثر نہیں ہے تو پھر میرا یہ فرض بنتا ہے کہ میں یہاں اس کے خلاف برسرِ دربار آواز اٹھاؤں۔ میں مائیک پر آیا اور کہا کہ ''آج خلاف معمول نظم عرض کروں گا اور نظم کا عنوان ہے...... دستور'' میں نے ''دستور'' کا لفظ کہا تو وہی ناظم مشاعرہ مجھے روکنے لگا اور کہنے لگا کہ ''کیا کر رہے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟'' میں نے کہا کہ ''ہٹ جاؤ' مائیک کی تلوار میرے ہاتھ میں ہے۔ آج میں آمریت کو لہولہان کر کے چھوڑوں گا۔'' اور میں نے وہ نظم ''دستور'' ترنم سے پڑھنا شروع کر دی۔

دستور

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے

ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے

ظلم کی بات کو جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

پھول شاخوں پہ کھلنے لگے تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے تم کہو

چاک سینوں کو سلنے لگے تم کہو

اس کھلے جھوٹ کو ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا
تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا فسوں
چارہ گر میں تمہیں کس طرح کہوں

تم نہیں چارہ گر کوئی مانے مگر
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

یہ نظم سننے کے دوران جو لوگ سہمے ہوئے بیٹھے تھے وہ اب نعرہ زن ہو گئے اور باآواز بلند داد دی اور بار بار ایک ایک بند کو سنا۔ جب میں نظم ختم کر چکا اور اسٹیج سے نیچے اترا تو مشاعرہ بھی ختم ہو گیا حالانکہ کچھ شاعر بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کو کسی نے نہیں سنا۔ چلتے چلتے ایک بزرگ نے مجھ سے کہا کہ یہ موقع نہیں تھا ایسی نظم پڑھنے کا۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ میں ''موقع پرست'' نہیں ہوں۔ یہ نظم منٹوں سیکنڈوں میں سارے شہر میں پھیل گئی۔ منظور قادر تک بھی پہنچی۔ انہوں نے ایک تقریب کے دوران کہا تھا کہ ''اب میرا دستور نہیں چلتا ایک لڑکا اپنا دستور پڑھ گیا ہے، اب تو وہی چل رہا ہے۔'' وہاں جسٹس بشیر احمد بھی تھے انہوں نے کہا کہ ''ابھی نہیں پکڑیں گے آہستہ آہستہ پکڑیں گے۔'' اس نظم کو پڑھنے کے بعد دس سال تک میرا داخلہ مری میں بند ہو گیا اور قید و بند کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ میں ان دنوں پنجاب کے ہر ضلع اور شہر میں ایک بار ضرور گیا اور وہاں جا کر یہ نظم سنائی تھی۔ کوئی ڈی سی مجھ سے نہیں جیت سکا۔ لوگوں نے مجھ سے اس نظم کو سنا اور بار بار سنا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ جو مشاعرہ پڑھنے کا تین چار سو روپے معاوضہ ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ قیمتی لوگوں کا جذبہ ہے۔ میں چند پیسوں کے لیے لوگوں کے اس جذبے کو مجروح نہیں کر سکتا۔ میں نے لوگوں کے حوصلے بڑھائے اور ان کا ہی ساتھ دیا ہے۔ مشاعروں کے شاعر بھی میرا پیچھا کر رہے تھے۔ میں جہاں بھی جاتا وہ اس ضلع کے ڈی سی کو کہلواتے کہ اس کو روکو یہ نظم ''دستور'' پڑھے گا۔ جتنا مجھ پر تشدد ان شاعروں نے کیا ہے اتنا پولیس نے بھی نہیں کیا ہے۔

الیکشن ۱۹۶۴ء

ایوب خان کا زمانہ اور ۱۹۶۴ء کا الیکشن آ گیا۔ جس میں مادر ملت نے خود بطور امیدوار حصہ لیا تھا۔ ان کی انتخابی مہم میں بھی میں نے بھرپور حصہ لیا کیونکہ نیشنل عوامی پارٹی (NAP) کمبائنڈ اپوزیشن گروپ میں تھی اور ان سب کی متفقہ امیدوار مادر ملت تھیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ان دنوں میاں محمود علی قصوری کے پاس باچا خان آئے تھے۔ وہ ملک سے باہر جا رہے تھے۔ انہوں نے جاتے ہوئے قصوری صاحب سے کہا تھا کہ "صرف اور صرف فاطمہ جناح ہی ایوب خان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔"

ان دنوں کراچی میں مادر ملت کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ وہاں میں نے مادر ملت کے لیے کچھ شعر پڑھ دیے۔ ایوب خان کے وزیر اطلاعات عبدالوحید خان ہوا کرتے تھے انہوں نے مادر ملت کے خلاف کوئی بیان دیا تھا۔ اس پر میں نے کچھ شعر کہے تھے جو کچھ یوں تھے۔

مس فاطمہ جناح کی باتیں بھی ہیں غلط
منطق ملاحظہ ہو یہ عبدالوحید کی
اس بے ادب نے مادر ملت کی شان میں
گستاخ ہو کے اپنی ہی مٹی پلید کی
حق بات پہ یہ داد بھی دیتا تو کس طرح
اس نے ضمیر بیچ کے کرسی خرید کی
یہ جو وحید خان ہے تنہا وطن پرست
لعنت بہت بڑی ہے یہ دور جدید کی

"دستور" میرا تو مشہور ہو گیا تھا' اس نظم کا بھی بہت شہرہ ہوا۔ عبدالوحید خان بہت بلبلایا اور اس نے ایوب خان سے شکایت بھی کی۔ سید شوکت حسین رضوی کے ایک جاننے والے تھے جو مجھے بھی جانتے تھے ان ہی کے توسط سے شوکت کو حکومت کے ارادوں کی خبر ہو گئی۔ چنانچہ شوکت رضوی نے مجھے کراچی ٹیلیفون کیا کہ "وہیں رہ جاؤ ورنہ یہاں آؤ گے تو گرفتار ہو جاؤ گے۔" لیکن ان کا یہ پیغام مجھ تک نہیں پہنچا۔ لہٰذا میں لاہور آ گیا کیونکہ مجھے مادر ملت کے جلسوں میں کمبائنڈ اپوزیشن کی طرف سے شامل ہونا تھا اور یہ ایک اجلاس میں طے ہوا تھا۔ میں لاہور میں ساندہ خورد میں رہتا تھا۔ صبح میں گھر سے نکل جاتا تھا اور رات گئے واپس آتا تھا۔ میری غیر حاضری میں ایک تھانیدار چند سپاہیوں کے ساتھ آ جاتا اور میرے بارے میرے گھر والوں سے پوچھتا تھا۔

پولیس کے چھاپے

میرے والد محترم صوم وصلوٰۃ کے پابند انسان تھے۔ وہ جس مسجد میں نماز پڑھتے تھے وہاں کے امام صاحب سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی کیونکہ امام صاحب ہمارے مالک مکان بھی تھے ہم ان کے کرائے دار تھے۔ میرے والد محلے میں ایک نیک اور شفیق آدمی کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ لوگ ان کی بہت عزت کیا کرتے تھے اور ان کی نیک نامی کا چرچا عام تھا۔ محلے کے وہ لوگ جو پولیس سے خوفزدہ تھے اور ان میں سے بعض پولیس کے مخبر بھی ہوتے تھے' کہا کرتے تھے کہ جالب خود اچھا آدمی نہیں ہے' ان کے والد بہت اچھے انسان ہیں کیونکہ ان کے نزدیک حکومت کے خلاف ہونا کوئی اچھی بات نہیں تھی' برے کردار کی نشانی تھی۔ میں نے ایک دن اپنی بیوی سے بڑی سختی کے ساتھ کہا کہ وہ وعدہ کرے کہ صرف میرا ہی ساتھ دے گی۔ اس نے کہا کہ "میں آپ کی وفادار ہوں اور ہمیشہ آپ کا ساتھ دوں گی۔ آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گی۔" میں نے کہا کہ یہاں وفاداری کا مسئلہ نہیں ہے اگر پولیس مجھے نہ پکڑ سکی تو وہ پھر تمہیں تھانے لے جائیں گے اور مجھے مجبوراً پولیس کو گرفتاری دینا پڑے گی اس لیے تم یہاں سے کچھ دن کے لیے ملتان چلی جاؤ تا کہ یہ مشکل گھڑی ٹل جائے تو پھر واپس آ جانا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری راہ میں ایسی کوئی مجبوری کی دیوار کھڑی ہو جس سے میرا یہ سفر رک جائے تو اس نے میری بات مان لی اور ملتان چلی گئی۔

میری گرفتاری پر مامور تھانیدار روزانہ چکر لگا کے تنگ آ گیا کیونکہ میں اس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ میں رات کو ایک مسلح آدمی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ آدمی فضل الرحمن ٹیپو تھا۔ مر گیا بیچارہ۔ وہ پرانا نیشنلسٹ تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں اس نے بھرپور حصہ لیا تھا اور کے ایل سہگل جو گانا یک تھا اس کا بھی دوست تھا۔ میں بمبئی میں بھی اس کے پاس رہا تھا تو ٹیپو نے ان دنوں میری حفاظت اپنے ذمہ لی۔ بے حد مشکل حالات تھے۔ ایوب خان کی آمریت اور کالا باغ کے ظلم و جبر کی سیاہ رات چھائی ہوئی تھی۔ کہیں بھی اس اندھیرے میں روشنی کی کرن نظر آتی تو اسے فوراً بجھا دیا جاتا تھا۔ لوگوں کی زبانوں پر تالے لگ گئے تھے لیکن لکھنے اور کہنے والوں نے اس سیاہ دور میں بھی ظلم کو ظلم ہی لکھا' تاریکی کو تاریکی ہی کہا اور روشنی کے لیے اپنے خون سے چراغ روشن کئے۔ ہم اس روشنی کو فروزاں کرنے میں پیش پیش تھے۔ ہم جانتے تھے کہ اس معرکے میں جان بھی جا سکتی ہے لیکن ہم نے اس راہ سے پیچھے ہٹنا گوارا نہیں کیا۔

پولیس کے غنڈے جو مجھے پکڑنے کے لیے میرے گھر کے آس پاس پہرہ دیا کرتے تھے' رات کو ایک ڈیڑھ بجے تھک ہار کر سو جاتے تھے اور میں ڈھائی تین بجے آتا تھا اور صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی گھر سے نکل جاتا تھا۔ اس تھانیدار کے قابو ہی نہیں آیا۔ میں نے ایک بار اپنے مالک مکان سے کہا کہ "مولانا! پولیس یہاں آ کے شور مچاتی ہے آپ انہیں سمجھائیں۔" تو وہ کہنے لگے "میں کیوں

سمجھاؤں؟ آپ کوئی برا کام کرتے ہیں تو پولیس آتی ہے نا۔" میں نے کہا کہ "مولانا! میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کے کالا باغ سے تعلقات ہیں۔ میں تو آپ کو اچھا انسان سمجھ کے بات کر رہا تھا۔" اس پر وہ بہت بگڑا۔

اتنے تنہا تھے ہم کہ ہمارا ساتھ دینا کسی کو گوارا نہ تھا۔ پولیس مجھے پکڑنے کے لیے دن رات میرے پیچھے پیچھے تھی مگر میں کسی طرح بھی ان کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ پولیس نے ہمیں گرفتار کرنے کے لیے جو جرم تراشا تھا وہ یہ تھا کہ میرا پاسپورٹ جعلی ہے۔ ایک دن ایک عام سا پولیس والا سائیکل پر ہتھکڑی لٹکائے آ گیا اور آتے ہی مجھ سے کہنے لگا کہ "بھئی تیرے کول جعلی پاسپورٹ اے؟"

میں نے پوچھا۔ "توں کون ایں؟"

اس نے کہا۔ "میں پولیس ہوں......"

میں نے کہا۔ "تو مجھے شکل سے ہی چور لگتا ہے۔ جا بھاگ جا یہاں سے۔"

وہ چلا گیا۔

اسلم سکھیرا جو کہ سٹی مجسٹریٹ تھے وہ ہمارے دوست تھے اسے میں نے اپنا پاسپورٹ دکھایا اور پوچھا کیا یہ جعلی ہے۔ اس کی مدت تو پوری ہو چکی ہے مگر پولیس ہمیں تنگ کر رہی ہے۔ تو وہ کہنے لگا کہ "تم ایوب خان کے خلاف لکھنا اور بولنا بند کر دو تو پولیس تنگ نہیں کرے گی۔" میں نے اسے جواب دیا کہ "میں تو قائداعظم کی ہمشیرہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دے رہا ہوں۔" لیکن اس کی سمجھ میں میری بات نہ آئی۔

◆◆◆

عہد ستم

مجھے یاد ہے کہ ایک ہی دن میں اپوزیشن کے تین شہروں میں جلسے تھے۔ پشاور،پنڈی اور لاہور میں۔ اور مجھے ان جلسوں میں محمود علی قصوری کے ساتھ شرکت کرنا تھی۔ میں نے پاجامہ اور کرتہ ایک درزی کو اور جیکٹ دوسرے درزی کو سلنے کے لیے دے دی اور سوچا کہ رات بارہ ایک بجے لے لوں گا۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں کسی نے میرے بارے پولیس کو اطلاع کر دی۔ میں درزی کی دکان سے لوٹا ہی تھا کہ چھ سات سپاہی ایک اے ایس آئی اور ایک انسپکٹر وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ "آپ سے بہت ضروری بات چیت کرنی ہے آپ ہمارے ساتھ تھانے چلیے۔"

میں سمجھ گیا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کے پاس کوئی سمن یا وارنٹ نام کی شے ہے؟"

"نہیں نہیں وہ پاسپورٹ والا معاملہ ہے اسی کے بارے پوچھنا ہے۔ بس اتنی ہی بات ہے۔ آپ چلیے تو سہی۔" انہوں نے مجھے ٹالتے ہوئے کہا۔

چھ سات غنڈہ ٹائپ پولیس والے تھے۔ انہوں نے مجھے پکڑ کے جیب میں ڈال دیا۔ راستے میں جیپ لاء کالج کے پاس ہی رکی۔ وہاں سے انہوں نے میڈیکو لیگل سے سرٹیفکیٹ لیا کہ "میں نے شراب پی رکھی ہے۔" میں یہ سب کارروائی دیکھ رہا تھا۔

لوگوں کو اور میرے ساتھی ورکرز کو میری گرفتاری کے بارے پتہ چل گیا۔ مگر پولیس والوں نے انہیں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ اب میرے علاقے کے اس تھانیدار کا انتظار ہو رہا تھا جس کی ڈیوٹی مجھے گرفتار کرنے کی تھی۔ میں ٹیلیفون کرنے کی اجازت لیتا ہوں تو ٹیلیفون کی تار کاٹ دی جاتی ہے۔ یہ سب ڈرامہ میرے سامنے جاری ہے کہ وہ تھانیدار آ جاتا ہے۔ سب پولیس والے اشاروں میں بات کر رہے ہیں۔ دراصل وہ اس شش و پنج میں تھے کہ مجھ پر کون سا کیس ڈالیں اور کس طرح مجھے "مجرم" ثابت کریں۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا پاسپورٹ دیکھ لو اور مجھے فارغ کرو۔ وہ پاسپورٹ دیکھ رہے ہیں اور میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ پاسپورٹ کو جعلی نہیں بنا سکتے تھے جو بھی نشان لگاتے صاف پتہ چل جاتا تھا اس لیے کیس مضبوط نہیں ہوتا تھا۔ سرے سے مقدمہ ہی الٹ ہو جاتا تھا۔ میرے علاقے کا تھانیدار بہت پریشان تھا۔ اس کے ساتھ دو ڈی ایس پی بھی تھے اور ساحل فارانی نامی کسی شاعر کو بھی انہوں نے میرے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ اس کے ذمے انہوں نے یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ اس نے مجھے گرفتار

کرواتا ہے۔ وہ سخت مصیبت میں گرفتار تھا۔ پولیس اسے ساتھ لے کر کبھی میرے گھر جاتی کبھی کسی جلسے میں تو کبھی برکت ہال میں۔ لیکن فانی کو میں کہیں نظر نہ آیا اور وہ مجھے برآمد نہ کرا سکا۔ فارانی نے مجھے بعد میں یہ تفصیل بتائی تھی۔ اس نے کہا کہ ''میں نے شکر ادا کیا کہ آپ میری وجہ سے گرفتار نہیں ہوئے ورنہ اپنے دامن پر لگا یہ داغ میں عمر بھر نہ دھو سکتا تھا۔''

بہر حال پولیس تفتیش کر رہی تھی اور اپنی تمام عقل استعمال کر رہی تھی کہ مجھ پر کوئی ''جرم'' کسی طرح ڈال کر مقدمہ مضبوط بنایا جا سکے۔ میں نے ایک پولیس والے سے پوچھا کہ تم زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے ہو؟ تو اس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا کہ ''ہم پہلے ٹانگیں توڑیں گے پھر بانہیں توڑیں گے پھر پیش کریں گے۔'' میں نے کہا کہ پاسپورٹ تو دیکھ لیا اب کیا دیکھنا ہے۔ اب مجھے جانے دو۔ ایک اے ایس آئی تھا جو بعد میں ایس پی ہو گیا۔ اس کا نام فاروقی تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ''میں نے آپ کو اکثر کالجوں میں سنا ہے۔ میں آپ کا مداح ہوں مگر آپ تو ہماری وردیاں اتروانے لگے ہیں اور ہماری ملازمت ختم کروانے لگے تھے۔ کالا باغ کا آرڈر تھا کہ اگر آج حبیب جالب کو نہ پکڑا گیا تو سب کو معطل کر دیا جائے گا۔ آپ بیٹھ جائیں اب آپ کو نہیں چھوڑیں گے۔ ہم نے آپ کو پکڑ لیا ہے۔''

میں نے اسے پوچھا۔ ''اب کیا پروگرام ہے؟'' کہنے لگا۔ ''اب آپ جیل جائیں گے۔ کچھ پھل وغیرہ منگوائیں آپ کے لیے یا کھانا منگوائیں' جو آپ چاہیں وہ آ جائے گا۔'' میں اس کی ''مجبوریاں'' سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ نہ جانے تم نے کیا کیا ''برآمد'' کر لیا ہے کچھ مجھے بھی بتاؤ۔ مگر وہ مجھے ایک مجسٹریٹ انور لطیف کے پاس لے گئے وہ بھی مجھے جانتے تھے مجھ پر جو جھوٹا مقدمہ بنایا گیا وہ یوں تھا کہ ایک شخص محمد وارث کے میں نے ہزار روپے دیئے تھے جو میں نے اس سے ہیرا منڈی میں گانا سنتے ہوئے لیے تھے اس نے اپنے پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کیا سو میری اس سے تکرار ہوئی جو بڑھتی چلی گئی اور میں نے اپنے تھیلے سے چاقو نکالا' اس پر وار کیا اور اسے زخمی کر دیا اور مجھے عین موقع پر پولیس نے پکڑ لیا۔ موقع پر گواہ بھی موجود تھے جنہوں نے یہ سارا قصہ دیکھا۔ میری تلاشی کے دوران میرے تھیلے سے شراب کی دو بھری ہوئی بوتلیں برآمد ہوئیں۔

پولیس نے مجھ پر تین اکٹھے جھوٹے مقدمے بنا لیے تھے تاکہ میں کسی بھی طرح ان کے چنگل سے نہ نکل سکوں۔ وہاں انہوں نے خون آلود قمیض بھی دکھائی۔ میں یہ سب ڈرامہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ یہ سب کیا ہے۔ اور سوچنے لگا' یہ سب کہیں ہو تو نہیں گیا۔ بہر حال پولیس نے یہ سب کچھ بنا کر مجھے رگڑا دے دیا اور جیل میں ڈال دیا۔ کیونکہ نواب آف کالا باغ کا یہی حکم تھا۔

وہاں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل شوکت محمود بھی آئے۔ وہ مجھے لائلپور (فیصل آباد) سے جانتے تھے۔ کہنے لگے۔ ''ہاں ہاں میں اسے جانتا ہوں یہ بڑا ''چاقوبار'' قسم کا شاعر ہے اور مجھ سے بھی باتیں کرنے لگے کہ ''تم نے کیا حکومت کے خلاف لکھ دیا ہے۔'' جب پولیس والے چلے گئے تو مجھ سے کہا ''شاباش بیٹے'' وہ سب سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک بہت ہی صاف ستھرے قیدی کو جس کا نام آصف تھا میرے ساتھ مامور کیا۔ وہ کسی قتل کے مقدمہ میں ملوث تھا اور ایک بڑی سی بیرک کے صاف ستھرے گوشے میں مجھے پہنچا دیا۔

جیل میں قسم قسم کے قیدی موجود تھے۔ ان لوگوں سے آشنائی ہوئی تو وہ مجھ سے روزانہ نظمیں، غزلیں سنا کرتے اور میں ان کی فرمائش پر اپنی شاعری سنایا کرتا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کو پتہ چل گیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ ''بھئی ہماری رپورٹ ہو جائے گی تم یہاں یہ کام نہ کرو۔'' لہٰذا انہوں نے شاعری کے لیے ایک گھنٹہ مخصوص کر دیا کہ میں صرف ایک گھنٹہ ہی نظمیں غزلیں سنایا کروں گا۔ بہر کیف یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسی اثنا میں میاں محمود علی قصوری ہماری ضمانت کے لیے لوئر کورٹ چلے گئے جہاں وہ جایا نہیں کرتے تھے۔ لوئر کورٹ سے ضمانت مسترد ہو گئی۔ سیشن کورٹ گئے وہاں سے بھی مسترد ہوئی۔ پھر ہائیکورٹ میں آ گئے اور حکومت کے پلان کے مطابق وہ جلسوں کے دن گزرتے چلے گئے جن میں مجھے شامل ہونا تھا۔

اس واقعہ کے مدتوں بعد عوامی حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے مجھے پھر جیل جانا پڑا تو جیل کے اندر میری ملاقات اسی محمد وارث سے ہوئی جس نے میرے خلاف جھوٹا مقدمہ بنوایا تھا۔ وارث کسی جرم کی سزا میں جیل آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی مجھ سے معافی مانگی اور کہا کہ ''میرے خلاف اس نے حکومت کے دباؤ میں آ کر گواہی دی تھی۔'' میں نے اسے کہا۔ ''چھوڑو بھائی! سب اس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔'' وارث نے تقریباً پچیس برس بعد ۱۹۸۹ء میں روزنامہ ''مشرق'' میں ایک بیان دیا کہ ''اس کے سینے پر ایک بوجھ ہے اور وہ یہ کھلے عام اعتراف کرنا چاہتا ہے کہ اس نے حبیب جالب پر جھوٹا مقدمہ بنوایا تھا۔''

میں نے مجسٹریٹ لطیف انور کے سامنے بیان دیا کہ ''میں حزب اختلاف کے جلسوں میں نظمیں پڑھتا تھا اور یہ بات حکومت کے لیے پریشانی کا باعث تھی لہٰذا مجھے گرفتار کر کے یہ جھوٹا مقدمہ میرے خلاف قائم کیا گیا ہے۔'' میں نے عدالت کے کٹہرے میں اپنے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ

''میں نیشنل عوامی پارٹی کی صوبائی کونسل کا رکن ہوں۔ میں گزشتہ برس سے حزب اختلاف کے جلسوں میں اپنی دو نظمیں ''جمہوریت'' اور ''دستور'' پڑھا کرتا تھا۔ میں ملک میں مکمل جمہوریت کا حامی ہوں۔ متذکرہ واقعہ سے پندرہ دن قبل کراچی کے

جلسوں میں یہ نظمیں پڑھی گئیں اور عوام نے انہیں بے حد پسند کیا۔ حکومت اس صورت حال سے پریشان تھی اور مجھ پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ میں یہ نظمیں جلسوں میں نہ پڑھوں۔ اس پر ۲۹ اگست ۱۹۶۴ء کو میں نے شیزان میں ایک پریس کانفرنس کی جس میں پولیس کے رویے پر روشنی ڈالی۔''

میری ضمانت کی درخواست کے مقدمے کی پیروی کے لیے میاں محمود علی قصوری' شیخ رفیق احمد اور متعدد وکلاء نے اپنی خدمات مفت پیش کی تھیں۔ وہ سارا سارا دن عدالت میں حاضر رہتے اور قانونی نکات پر مغز کھپاتے تھے۔ میرے سیاسی و ادبی رفقائے کار' اہل خاندان اور عوام سب یہ چاہتے تھے کہ میں رہا ہو جاؤں۔ اس سلسلے میں پر خلوص کوششیں جاری تھیں۔ جوں جوں میری قید کا عرصہ طویل ہوتا گیا عوام میں حکومت کے خلاف مزید نفرت پیدا ہونے لگی۔ میرے ساتھ میرے اہل خانہ بھی سخت پریشان تھے کیونکہ ان کا واحد کفیل میں ہی تھا۔ جب حکومت نے یہ محسوس کیا کہ میرے وکلاء کے ٹھوس دلائل سے میری ضمانت ہو جائے گی تو اس نے میرے خلاف ایک اور چال چل دی۔ عدالت میں ایک جھوٹے گواہ منیر احمد کتب فروش کو پیش کیا گیا جس نے حلف اٹھا کر یہ بیان قلمبند کرایا کہ ''ملزم حبیب جالب نے میرے سامنے چاقو سے محمد وارث پر وار کیے۔''

اس بیان پر میرے وکیل نے جرح کی۔ گواہ اور محمد وارث کی دوستی کا ثبوت پیش کیا گیا۔ میری ضمانتوں کے مسترد ہونے کا اصل سبب یہ تھا کہ حکومت مجھے کسی صورت میں بھی محترمہ فاطمہ جناح کے جلسوں میں شریک ہونے دینا نہیں چاہتی تھی کیونکہ میری شاعری نے عوام میں حکومت کے خلاف نفرت کو بھڑکا دیا تھا لہٰذا جیسے ہی مادر ملت کے تین بڑے جلسے ہو گئے تو میری ضمانت بھی منظور ہو گئی۔

میں جیل میں ہی تھا کہ مجھے سزا کے طور پر ''قصوری چکی'' میں ڈال دیا گیا۔ مجھ پر یہ الزام تھا کہ میں یہاں شعر سناتا ہوں۔ جیل کی ایک بیرک میں عبدالصمد خان اچکزئی اکیلے رہتے تھے۔ وہ صبح مجھے ناشتہ دینے آتے تھے۔ ایک دن تو انہیں آنے دیا گیا لیکن دوسرے دن روک دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ وارڈن ان سے جھگڑا کر رہا ہے۔ میں نے انہیں سمجھایا تو وہ مانے۔

جیل کے جو غنڈے تھے وہ مجھ سے پوچھتے کہ ''آپ یہاں کیسے آئے کون سا جرم کیا ہے؟'' میں ان سے کہتا۔ ''شاعری کی وجہ سے آیا ہوں۔'' وہ پوچھتے۔ ''کون سی شاعری؟ ہمیں بھی سنائیں۔'' جب میں نے انہیں اپنی شاعری سنائی تو وہ بولے۔ ''پھر تو آپ ٹھیک ہی یہاں آئے ہیں۔ ایسی شاعری پر تو ظاہر ہے جیل ہی ہو سکتی ہے۔'' وہاں پر بھی میں لوگوں کے حوصلے بلند کرتا تھا اور ان سے کہا کرتا کہ ادھر اچھے کاموں کی وجہ سے آئیں گے تو لوگ سواگت کریں گے آپ کا احترام کریں گے۔ آپ جو اس وقت ڈرے ہوئے اور سہمے سے رہتے ہیں' ہر وقت یہی دعا کرتے ہیں کہ خدایا ہمیں یہاں سے باہر نکال جبکہ میں تو خدا سے یہی دعا کرتا ہوں

کہ بندوں کے حقوق کے لیے مجھے بار بار یہاں آنا پڑے تو میں آؤں گا۔ اس لیے میں قطعی خوفزدہ نہیں اور نہ ہی گھبرایا ہوا ہوں۔" وہ کہتے کہ "پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" میں نے ان سے کہا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ تم لوگوں کو تنگ کرتے ہو اس لیے یہاں سزا پا رہے ہو۔ اگر تم حقوق انسانی کے لیے جنگ لڑتے ہوئے جیل آؤ تو ہیرو کہلاؤ گے نام و عزت پاؤ گے۔" ان کی سمجھ میں بمشکل یہ بات آئی اور وہ مجھ سے روزانہ میری شاعری اور اس کے متعلق باتیں غور سے سنا کرتے تھے جب مادر ملت کے تینوں بڑے جلسے ختم ہو چکے تو میری ضمانت کا کیس بھی ہائیکورٹ میں لگ گیا۔ جسٹس عبدالعزیز خان تھے۔ میاں محمود علی قصوری نے میری ضمانت کے کیس میں اپنے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ "میں جالب اور اس کے پورے خاندان سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ کسی کو آنکھ تک نہیں مار سکتا چاقو کیسے مارے گا۔"

رہائی کے بعد

بہر کیف ہائیکورٹ سے میری ضمانت بمشکل تمام ہوئی۔ جس روز میری ضمانت ہوئی اسی دن لارنس گارڈن لاہور میں محترمہ فاطمہ جناح کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تھا۔ قصوری صاحب مجھے جیل سے لے کر سیدھے لارنس گارڈن پہنچے۔ وہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر بھرپور طریقے سے Welcome کیا اور نعرہ زن ہوئے۔ میرا تو یہ عالم تھا کہ لوگوں کی اپنے لیے محبت اور چاہت دیکھ کر میں حیرت زدہ تھا۔ مشاعرے میں تو دو چار سو آدمی سننے والے ہوتے ہیں لیکن یہاں ہزاروں کا جم غفیر تھا۔ اسٹیج پر مادر ملت بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے بھی اسٹیج پر چڑھا دیا گیا اور لوگوں نے مجھ سے نظم سننے کے لیے نعرے لگائے۔ میں نے مائیک پر آ کر ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "جیل کے اندر سے میں ایوب خان کا قصیدہ لے کر آیا ہوں۔ اس نے مجھے جو یہ شہرت بخشی ہے اور جو آج مجھے یہ مقام و مرتبہ ملا ہے اس کے صلے میں ایوب خان کا قصیدہ لکھا ہے جو آپ کو سناتا ہوں۔ میں نے وہ نظم سنائی۔

بیس گھرانے

بیس گھرانے ہیں آباد
اور کروڑوں ہیں ناشاد
صدر ایوب زندہ باد

آج بھی ہم پر جاری ہے

کالی صدیوں کی بیداد
صدر ایوب زندہ باد

بیس روپیہ من آٹا
اس پر بھی ہے سناٹا
گوہر سہگل آدم جی
بنے ہیں برلا اور ٹاٹا
ملک کے دشمن کہلاتے ہیں
جب ہم کرتے ہیں فریاد
صدر ایوب زندہ باد
لائسنسوں کا موسم ہے
کنونشن کو کیا غم ہے
آج حکومت کے در پر
ہر شاہیں کا سر خم ہے
درس خودی دینے والوں کو
بھول گئی اقبال کی یاد
صدر ایوب زندہ باد

عام ہوئی غنڈہ گردی
چپ ہیں سپاہی باوردی
شمع نوائے اہل سخن
کالے باغ نے گل کر دی

اہل قفس کی قید بڑھا کر
کم کر لی اپنی میعاد
صدر ایوب زندہ باد

یہ میثاق استنبول
کیا کھولوں میں اس کا پول
بجتا رہے گا محلو میں
کب تک یہ بے ہنگم ڈھول
سارے عرب ناراض ہوئے
سیٹو اور سنٹو ہیں شاد
صدر ایوب زندہ باد

گلی گلی میں جنگ ہوئی
خلقت دیکھ کے دنگ ہوئی
اہل نظر کی ہر بستی
جہل کے ہاتھوں تنگ ہوئی
وہ دستور ہمیں بخشا ہے
نفرت ہے جس کی بنیاد
صدر ایوب زندہ باد

مادر ملت کی کمپین جاری تھی۔ اس دوران مجھے یاد آتا ہے کہ ایک سی ایس پی آفیسر اصغر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "زمین لے لو لائسنس لے لو روپیہ پیسہ جتنا مرضی چاہے لے لو آپ مادر ملت کا دست و بازو نہ بنیں ان کو چھوڑ دیں اور نہ ہی ہمارے حق میں لکھیں۔ آپ ہسپتال میں داخل ہو جائیں اور کہیں کہ میں بیمار ہوں۔ آپ کی عزت نفس بھی مجروح نہیں ہوگی۔" میں نے اسے جواب

دیا کہ ”یہ تمام باتیں ہی غلط ہیں۔ میرے مزاج اور ضمیر کے خلاف ہیں۔ میں جو کر رہا ہوں وہی کروں گا۔“ میں نے حکومت کی یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ میرے ایک دوست غلام یزدانی ملک تھے۔ وہ اورینٹل کالج میں میرے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ وہ ایک دن میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے بکنا ہے تو میرے ذریعے بکنا۔ میں نے کہا 'تم فکر نہ کرو میں ایسا ہی کروں گا۔ یہ تو خیر ایک جملہ معترضہ تھا۔ میرا مطلب ہے کہ یہ پیش کشیں بھی ہوئیں لیکن میں ان کے سامنے نہیں جھکا۔ میں نے مادرِ ملت کا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ ہی رہا۔

مادرِ ملت

مادرِ ملت کی سن لیں۔ مادرِ ملت کا یہ عالم تھا کہ وہ چونکہ ضعیف العمر تھیں۔ تو وہ کہتیں کہ ”مجھ سے پہلے سب تقریریں کر لو۔ جب میں آؤں تو میں تقریر کر کے آگے نکل جاؤں۔“ گوجرانوالہ میں جلسہ تھا۔ مادرِ ملت سے پہلے خواجہ صدیق الحسن نے کہا کہ ”شاعرِ عوام حبیب جالب اپنا کلام سنائیں گے۔“ مادرِ ملت نے ”نو“ کہہ دیا۔ ان کا ”نو“ ٹیپ ہو گیا۔ خواجہ حیران ہوا اور میں اپنی جگہ شش و پنج میں کہ اب ہجوم سے نکلنا تو غلط ہے' پولیس بھی پیچھے لگی ہوئی ہے' مار ڈالے گی۔ لائلپور میں جب گیا تو وہاں ایک انور غازی آبادی بھی تھے جو میاں بشیر احمد کی نظمیں پڑھا کرتے تھے' انتخابی مہم کے انچارج میر عبدالقیوم کو ٹیلیفون آیا کہ ”انور غازی آبادی آ رہے ہیں ان کا خیال رکھنا۔“ خیال رکھنے سے مراد یہ تھی کہ ان کو پڑھوانا ہے۔ مادرِ ملت کا جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ میں ان کے آنے سے پہلے ہی نظمیں وغیرہ پڑھ کر الگ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مادرِ ملت آ گئیں تو ان کی تقریر سے پہلے مسلم لیگیوں نے کہا کہ ”اب انور غازی آبادی پڑھیں گے۔“ مادرِ ملت نے اس کو بھی ”نو“ کہہ دیا تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے جو مجھے ”نو“ کہا تھا اس پر یہاں بھی قائم ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کیا کہ یہاں انور غازی آبادی کے لیے کوئی رعایت کرتیں۔ مادرِ ملت بے حد متوازن اور منصف مزاج خاتون تھیں۔ بعد میں سید مطلوب حسین کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ مادرِ ملت نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا کہ ”اگر آج انور غازی آبادی کو پڑھا دیتے تو Poor جالب ناراض ہو جاتا۔“

یہ سن کر مادرِ ملت کی توقیر میرے دل میں اور زیادہ بڑھ گئی۔ ایک بار ان کے ایک سیکرٹری جس کا نام بھول گیا ہوں اس نے مجھے بتایا کہ مادرِ ملت مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ ”حبیب جالب ہمارے ساتھ ہے یا الگ ہو گیا ہے۔“ اس نے کہا کہ میں نے ان سے کہا کہ ”وہ ہمارے ساتھ ہی ہے ایوب خان کے ساتھ نہیں گیا۔“ یہ وہ زمانہ تھا جب ہم پر بہت دباؤ تھا حکومت کا جبر تھا مگر میں نے مادرِ ملت کا ساتھ دیا اور حکومت کی ہر طرح کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

ایک اور واقعہ یاد آتا ہے کہ میں ایک محفل میں نظم پڑھ رہا تھا کہ ایوب خان کا داماد وہاں آ گیا اور بیٹھ گیا۔ میں میاں افتخار الدین کے بیٹے عارف افتخار کی فرمائش پر کچھ نہ کچھ سنا دیتا تھا۔ داماد صدر بھی سنتا رہا۔ سننے کے بعد اس نے کہا کہ "یہ آپ ایکسپلائیٹ کر رہے ہیں۔" میں نے کہا کہ "ایوب خان مجھے ایکسپلائیٹ کیوں نہیں کر لیتے۔" عارف افتخار میرے جواب پر کافی گھبرایا اور کہنے لگا۔ "ارے بھئی' کیا پڑھ دیا ہے!" میں نے اس سے کہا۔ "ایک تو تمھیں یاد نہیں رہتا' تم نے خود کہا ہے کہ پڑھو اور میں تم سے سخت نالاں ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم میاں افتخار الدین کے لڑکے نہیں ہو۔" وہ معذرتیں پیش کرنے لگا۔

اس زمانے میں مجھے ذوالفقار علی بھٹو بھی سننا چاہتے تھے۔ عارف افتخار کے بقول بھٹو نے میرے بارے ان سے کہا تھا کہ "جالب اپوزیشن پوئیٹ ہے تو کیا' ہم اسے کیوں نہیں سن سکتے۔" بھٹو مجھے غائبانہ طور پر جانتا تھا لیکن ابھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

◆◆◆

فضا میں اپنا لہو

ایوب خان کے زمانے میں مولانا بھاشانی نے ہمیں جو "لیٹ ڈاؤن" کیا تھا۔ یہ بھی ایک قصہ ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے بھائی کے انتقال کے بعد سیاست سے کسی حد تک کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور الیکشن میں حصہ لینے کا ان کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ جمہوریت پسندوں کا مسئلہ یہ تھا کہ ایوب خان کے خلاف کوئی ایسا بھاری بھر کم امیدواران کے پاس نہیں تھا۔ اپوزیشن کے تمام رہنما اپنا سر جوڑ کر بیٹھے اور یہ فیصلہ کیا کہ انتخابات میں ایوب خان کے مقابل اگر کوئی امیدوار ہو سکتا ہے تو وہ محترمہ فاطمہ جناح ہی ہو سکتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ حسین شہید سہروردی کے گھر میں تمام اپوزیشن موجود تھی اور جب یہ فیصلہ ہو چکا تو ایک اور مسئلہ درپیش ہوا کہ محترمہ فاطمہ جناح اس کے لیے تیار نہ تھیں۔ یکے بعد دیگرے وہ اپوزیشن کے تمام رہنماؤں کو اپنے اس خیال سے آگاہ کر چکی تھیں کہ ان کا عملی سیاست میں حصہ لینے کا اب کوئی ارادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محترمہ کے پاس جو بھی انہیں آمادہ کرنے کے لیے جاتا مایوس ہو کر لوٹتا تھا۔ جمہوریت کی اس منزل پر اپوزیشن کے رہنماؤں میں مادرِ ملت کے انکار سے مایوسی پھیل گئی۔ بہت سی زبانوں پر تو یہ بات بھی آئی کہ غالباً ایوب خان اور اس کے حواریوں نے فاطمہ جناح پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا ہے۔ جب تمام رہنما فاطمہ جناح کو ایوب خان کے خلاف امیدوار بنانے میں ناکام ہو گئے تو یہ ذمہ داری مولانا بھاشانی نے اپنے سر لے لی اور وہ خود محترمہ جناح سے ملنے گئے۔

جب محترمہ جناح نے دیگر رہنماؤں کی طرح مولانا بھاشانی سے بھی معذرت چاہی تو مولانا نے کہا کہ "اور تمہارا بھائی نے ام کو مسجد سے اٹھایا اور سیاست میں لایا اور ام نے تمہارے بھائی کے ساتھ مل کر پاکستان بنایا تھا۔ اب پاکستان خطرے میں ہے اور تم الیکشن میں حصہ نہیں لینا چاہتی تو ٹھیک ہے میں بھی واپس مسجد میں چلا جاتا ہوں۔" محترمہ فاطمہ جناح نے مولانا بھاشانی سے کہا۔ "ٹھہرو ٹھہرو" اور اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اس وقت پاکستان میں سیاسی بیداری اتنی زیادہ نہیں تھی لہٰذا فوجی حکمران ہونے کے باوجود مغربی پاکستان کے زیادہ علاقوں میں ایوب خان اور ان کے حواریوں نے اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ ایوب کابینہ میں شامل وزراء اپنے اپنے علاقوں میں بہت اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ ان وزراء میں ذوالفقار علی بھٹو بھی تھے جنہیں ایوب خان کی قربت خاص میسر تھی اور ایوب خان کا ان پر یہ اعتماد تھا کہ انہیں ایوب خان نے صدارتی انتخابات میں اپنا متبادل امیدوار بنایا تھا۔ بھٹو ایک ذہین اور بلا کے منصوبہ ساز آدمی تھے۔ انہوں نے اس طور حکمت عملی تیار کی کہ ملک کی دیہی آبادی اور پنجاب کی اکثریت ایوب خان کی ہمنوا ہو گئی۔

اس وقت چار صوبے تو نہ تھے۔ مغربی پاکستان میں بلوچستان اور سرحد کے علاقے کسی حد تک ولی خان اور غفار خان کے زیر اثر ہونے کے باعث ایوب خان کے خلاف تھے مگر پھر بھی مغربی پاکستان کی مجموعی فضا ایوب خان کے حق میں ہی نظر آ رہی تھی۔ مغربی پاکستان کے برعکس مشرقی پاکستان کی فضا قطعی مختلف تھی۔ بنیادی جمہوریت کے الیکشن میں وہاں بھاشانی کے آدمی کامیاب ہوئے اور لگتا تھا کہ ایوب کان کو شکست ہو جائے گی مگر راتوں رات کیا ہوا؟ آج تک سامنے نہیں آ سکا۔

مولانا بھاشانی

اس راز سے پردہ ہنوز نہ اٹھ سکا۔ غفار خان' ولی خان' اجمل خٹک' ارباب سکندر خلیل اور محمود علی قصوری سب ہی حیران تھے کہ آخر ہوا کیا ہے۔ بھٹو نے مجھے اس واقعہ کے بارے میں تب بتایا جب لاڑکانہ میں فیض صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ تھا۔ ہم دونوں شاعر بھٹو صاحب کے مہمان تھے۔ صبح کے وقت میں اور بھٹو لان میں گھوم رہے تھے' میں نے ان سے پوچھا کہ "آپ نے مولانا بھاشانی کو شیشے میں کیسے اتارا تھا؟" بھٹو نے کہا۔ "بھئی وہ قصور میرا ہے' میں نے مولانا بھاشانی سے کہا تھا کہ ہم چین کی طرف جا رہے ہیں اور تم مادر ملت کے ساتھ امریکہ کی طرف جا رہے ہو۔ پھر میں نے اسے پیسے دیئے۔" یہ بھٹو نے مجھ سے کہا تھا۔ اسی طرح ایک بار میں چوہدری ظہور الٰہی اور ولی خان کے ساتھ ملتان جا رہا تھا۔ میں نے چوہدری ظہور الٰہی سے مزاحاً کہا (کیونکہ خبر بھی تھوڑی سی اڑ چکی تھی کہ چودھری ظہور الٰہی کھسک رہا ہے) "چودھری صاحب! آپ کو کیا ضرورت تھی پیسے لینے کی؟ آپ کی عمر بھی اتنی ہو چکی ہے۔" اس پر ولی خان نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ "آپ عمر کی بات کرتے ہیں یہاں تو نوے سال کا بک جاتا ہے۔ ولی خان کا اشارہ مولانا بھاشانی کی طرف تھا۔

الیکشن ہی کے زمانے میں میرا مشرقی پاکستان جانا ہوا۔ مولانا بھاشانی مجھے "غالب" کہا کرتے تھے۔ وہ غالباً اردو کے ایک ہی شاعر سے واقف تھے اس لیے انہیں جالب میں غالب ہی نظر آتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "غالب! تم کل صبح ہمارے گھر آؤ۔"

"جی ضرور" میں نے انہیں جواب دیا۔

میں مولانا کے ہاں گیا اور جب واپس آنے لگا تو مولانا نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں سمجھا کہ مولانا آج مجھ پر بہت مہربان ہیں کیونکہ سیاسی حلقوں میں مولانا کی کفایت شعاری ان کی سیاسی بصیرت سے زیادہ مشہور تھی لہٰذا میں ان کے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنے پر متعجب بھی ہوا۔ مجھے ان دنوں پیسوں کی ضرورت بھی تھی۔ مولانا بھاشانی کا جیب سے ہاتھ باہر نکلا تو اس میں ایک روپے کا نوٹ تھا۔

"غالب! یہ رکھ لو۔"

"کیوں تکلف کرتے ہیں مولانا"

"ارے بھائی غالب! یہ تمہارا کرایہ ہے' لو رکھ لو کام آئے گا۔"

"میں ایک شرط پر یہ روپیہ لوں گا مولانا۔ آپ اس نوٹ پر دستخط کر دیں تا کہ یادگار رہے اور میں اپنی آئندہ زندگی میں اس پر فخر کر سکوں۔" مولانا نے اس پر دستخط کر دیئے۔ اسی قسم کا دوسرا واقعہ بھی ہے کہ ایک بار میرے فنڈ کے لیے کچھ دوست رقم جمع کر رہے تھے۔ اس میں ذوالفقار علی بھٹو نے ساڑھے چار سو روپے جمع کرائے تھے۔ اس وقت بھٹو صاحب حکومت میں نہیں تھے۔

مولانا بھاشانی جو مشرقی پاکستان کے مقبول ترین رہنما تھے اور بی ڈی الیکشن میں ان کے امیدوار کامیاب بھی ہو گئے تھے تو پھر محترمہ فاطمہ جناح کیوں ہاریں؟ یہ سوال مدتوں ہم دوستوں کو پریشان کرتا رہا۔ اس وقت سنا تو یہی تھا کہ ایوب خان نے بھٹو کی معرفت مولانا بھاشانی سے کوئی سودے بازی کر لی تھی (جس کی بہت بعد میں بھٹو نے تصدیق بھی کر دی) یہ موضوع بے حد تکلیف دہ ہے۔

اپوزیشن کے سیاسی حلقوں میں فاطمہ جناح کی ناکامی کے بعد مایوسی پھیل گئی۔ ایک دوسرے پر الزامات لگائے جا رہے تھے۔ سیاسی حلقوں میں شکست و ریخت کا سماں تھا۔ ایوب خان اور ان کے ساتھی کامیابی کے نشے میں چور اپوزیشن کے حلقوں میں مزید دراڑیں ڈال رہے تھے' مگر اپوزیشن کے کچھ رہنماؤں نے اس وقت بھی بردباری اور استقامت کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اپنے اپنے محاذ پر ڈٹے رہے۔ اس سلسلے میں مولانا بھاشانی پر حرف زنی کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ اپوزیشن کے تمام رہنما ان پر اعتبار کرتے تھے۔ مگر ان کے مزاج کے لا ابالی پن سے ایک خطرہ ضرور پیدا ہوا گیا کیونکہ سیاسی حلقوں میں یہ بات عام ہو گئی تھی کہ مولانا بھاشانی راتوں رات ایوب خان سے مل گئے ہیں' جس کے نتیجے میں مادر ملت الیکشن ہار گئیں۔ اب نہ تو ایوب خان ہے نہ بھٹو اور نہ ہی بھاشانی مگر ماضی میں ہونے والی اس بڑی سیاسی خرید و فروخت کے نتیجے میں جمہوریت پر ایک کاری ضرب لگی۔ ہماری جماعت نیشنل عوامی پارٹی کے سارے ہی رہنما مولانا بھاشانی پر ہونے والی تنقید سے سخت پریشان تھے۔ لہٰذا انہوں نے ایک بار مولانا بھاشانی کو گھیر لیا۔ اجمل خٹک اور ولی خان نے تو سخت الفاظ میں ان باتوں کا ذکر کیا جو مولانا کے بارے میں ہو رہی تھیں مگر مولانا جواب دینے کی بجائے ٹالتے رہے۔ ولی خان نے کہا۔ "بھٹو صاحب کہتے ہیں کہ آپ نے پیسے لیے ہیں۔"

"ولی خان تم پختونستان مانگتا ہے ادھر آؤ ہم تمہارا مدد کرے گا۔" مولانا بھاشانی نے ٹالتے ہوئے کہا۔

''یہاں پختونستان کی بات نہیں ہو رہی ہم تو صرف نام پختونستان مانگتے ہیں۔ تم بتاؤ تم نے بھٹو صاحب سے پیسے لیے تھے؟'' ولی خان نے جواباً کہا۔

مولانا خاموش ہیں۔ میاں محمود علی قصوری نے بلند آواز میں کہا۔ ''مولانا جلدی بتاؤ آپ نے پیسے لیے ہیں؟''

مگر مولانا جواب دینے کے بجائے ٹالتے رہے۔ وہ گفتگو کو اس موضوع سے ہٹاتے رہے۔ ارباب سکندر کو اس بات پر غصہ آ گیا۔ انہوں نے تلخ انداز میں اونچی آواز میں مولانا سے کہا۔ ''مولانا! آپ نے پیسے لیے ہیں؟''

''یہ غلط ہے' ہم نے پیسا نہیں لیا۔''

''ہمارے پاس ثبوت ہے۔''

''کیا ثبوت ہے؟''

''جن لوگوں نے پیسے دیئے ہیں وہ کہتے پھر رہے ہیں کہ انہوں نے پیسے دیئے ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں وہ؟''

''وہ کہتے ہیں ان سے آپ نے پیسے لیے ہیں۔''

''ہم نے نہیں لیا۔ لڑکا لوگ نے لیا ہوگا۔'' مولانا کا اشارہ اپنے بیٹوں کی طرف تھا۔ یہ کہہ کر انہوں نے بات ختم کر دی۔

اگر مولانا بھاشانی نہ بکتا تو پاکستان میں آج جمہوریت ہوتی۔ مادر ملت تو مان ہی نہیں رہی تھیں کہ ''میں ہار گئی ہوں۔'' مگر ان کے ساتھی بہت کمزور تھے ان میں چودھری محمد علی بھی شامل ہیں۔ اب انکی ایجوکیشن سیاسی اور عملی نہیں تھی۔ ایوب خان کا عہد ایک بہت ہی خوفناک دباؤ کا عہد تھا۔ ''ردعمل کی تحریک'' کا دور تھا۔ بنیادی جمہوریت کا مطلب تھا کہ پاکستان کی بنیادیں ہلا دی جائیں اور وہ ہل گئیں۔

آمریت کے سائے

ایوب خان کی آمریت کے خلاف اتحاد بنتے رہے۔ ایک اتحاد سہروردی کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ وہ ایسٹ پاکستان کے ساتھ رابطے کا بہت مضبوط ذریعہ سمجھے جاتے تھے بلکہ ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ شیخ مجیب الرحمن جو کہ ایک ورکر کی حیثیت رکھتے تھے۔ سہروردی انہیں مشوروں میں کبھی شریک نہیں کرتے تھے۔ ایک روز ہم سہروردی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو شیخ مجیب الرحمن کرسی اٹھا کر آنے لگے تو سہروردی نے انہیں روک دیا اور کہا کہ ''یہاں کوئی اہم بات ہو رہی ہے۔'' حسین شہید سہروردی کا اپوزیشن میں بڑا اہم

رول تھا۔ لیاقت علی خان کے زمانے سے ہی وہ جمہوریت کی جدوجہد میں نمایاں طور پر حصہ لیتے چلے آئے تھے۔ ایوب خان کے دور میں اتنا خوفناک دباؤ تھا کہ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کو بولنے کی اجازت تک نہ تھی۔ میں کافی ہاؤس لاہور میں بیٹھا ہوا تھا کہ حسین شہید سہروردی کی گاڑی آ کر رکی۔ وہ اندر آئے۔ میں نے انہیں چائے وغیرہ پلائی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''چلو'' پولیس میرے پیچھے تھی اور مجھے روکا گیا لیکن میں ان کے ساتھ گاڑی میں زبردستی بیٹھ گیا۔ گاڑی میں وہ مجھ سے مختلف امور کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے انہیں شہر بدر طلباء کے بارے میں بتایا۔ وہ جانتے بھی تھے۔ دوسرے دن موچی گیٹ میں ہونے والے جلسے کے بارے بھی ان سے کچھ باتیں ہوئیں اور میں واپس آ گیا۔

دوسرے دن موچی گیٹ میں جلسہ تھا۔ حکومت نہیں چاہتی تھی کہ یہ جلسہ ہو' جلسہ منتشر کرنے کے لیے حکومت کے غنڈے جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ ان کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور ہمارا اسٹیج کشتی کی طرح ڈول رہا تھا۔ عوام کا سیلاب تھا' ان کے پیچھے وہ غنڈے تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ لوگوں کو بھگا دیں اور لیڈرز کو زدوکوب کریں۔ میں اس ''ڈوبتی ہوئی کشتی'' پر ایک بے فکر آدمی کی طرح کھڑا تھا۔ جب طوفان بڑھتا چلا گیا تو میں نے ان لوگوں کو للکارا جو یہ طوفان بدتمیزی برپا کر رہے تھے۔ میں نے مائیک پر آ کر کہا کہ

''یہ لوگ جو آمریت' بدتمیزی اور بدتہذیبی کا طوفان برپا کر رہے ہیں' یہ لوگ لاہور کے نہیں ہیں۔ یہ امیر محمد خان کے گاؤں سے آئے ہوئے ہیں۔ لاہور کے لوگ متمدن ہیں' مہذب ہیں' جمہوریت پسند ہیں۔ وہ کسی طور بھی یہ نہیں چاہتے کہ جلسہ درہم برہم ہو جائے اور آج میں دیکھتا ہوں کہ آپ مجھے یہاں اپنے عوامی شاعر کو سننا چاہتے ہیں یا نہیں۔''

اس کے بعد میں نے اپنی نظم ''دستور'' کے پہلے دو شعر پڑھے۔ پھر میں نے شہر بدر طلباء کے بارے میں کہا کہ یہ بارہ طلباء آنے والے عہد کے بہت بڑے محب وطن بڑے رہنما اور پاکستان کی سالمیت کے محافظ ہیں۔ انہیں حکومت ڈاکو بنانا چاہتی ہے۔ اس طرح کا سلوک تو کوئی اپنے بچوں کے ساتھ بھی کسی طرح روا نہیں رکھتا۔'' اس کے بعد میں نے ان طلباء کے لیے یہ اشعار پڑھے۔

فضا میں اپنا لہو جس نے بھی اچھال دیا
ستم گروں نے اسے شہر سے نکال دیا
یہی تو ہم سے رفیقانِ شب کو شکوہ ہے
کہ ہم نے صبح کے رستے پہ خود کو ڈال دیا

لوگوں نے بہت داد دی۔ پھر میں نے اپنی نظم ''دستور'' پڑھی۔ اس نظم کے بعد جلسہ پرامن ہو گیا۔ انتشار ختم ہو گیا اور طوفان تھم

کیا۔اس کے بعد حسین شہید سہروردی نے تقریباً ایک گھنٹے تک تقریر کی۔انہوں نے تمام ملکی اور بین الاقوامی حالات کا سیر حاصل تجزیہ کیا اور آمریت کے خلاف منظم و متحد ہونے کی تلقین کی۔جب وہ جلسہ ختم ہو گیا اور میں ان کے ساتھ فلیٹیز چلا گیا وہاں انہوں نے میری بڑی تعریف و توصیف کی اور کہا کہ جناب ہم تو وہ بات نہیں کہہ سکے جو آپ کہہ گئے۔آج تو آپ نے ہمارا جلسہ بچا لیا۔حسین شہید سہروردی بہت بڑا آدمی تھا۔اس نے بڑے حوصلے کے ساتھ میری تعریف کی تھی۔اس جلسے کی تمام روداد "پاکستان ٹائمز" میں بھی چھپی تھی۔ایوب خان کا زمانہ بہت ہی جمہوریت کش زمانہ تھا۔اس زمانے میں بڑے بڑے ذہین لوگ بھی ان کے دامن سے وابستہ تھے۔منظور قادر تھے ذوالفقار علی بھٹو تھے جو وزیر معدنیات تھے۔

سرکش لڑکی

ریاض شاہد مرحوم بڑے عزیز دوست تھے۔وہ کافی ہاؤس میں ہمارے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ریاض شاہد بے حد ذہین آدمی تھے۔بڑے افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔اداکارہ نیلو اپنے دور کی ایک اچھی رقاصہ تھیں اور ان کو اکثر فلموں میں اسی خوبی کی بنا پر کاسٹ کیا جاتا تھا۔اس زمانے میں شہنشاہ ایران کے اعزاز میں کوئی فنکشن تھا۔اس کے لیے نیلو کو تیار ہونے کو کہا گیا۔لیکن کہنے کا انداز مہذب نہیں تھا۔نیلو کے ریاض شاہد سے تعلقات بن رہے تھے۔ابتدائی تعلقات تھے یا ذرا آگے چلے گئے ہوں گے تو ریاض شاہد انہیں منہ پھاڑ کے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ "نہ جاؤ" لیکن نیلو نے محسوس کر لیا کہ ریاض شاہد نہیں چاہتے ہیں کہ اس تقریب میں شامل ہوں۔اس پر کالا باغ کی طرف سے جو لوگ اس کام کے لیے مامور تھے انہوں نے غنڈہ گردی کی انتہا کر دی۔اس کو برا بھلا کہا اور طمانچہ بھی مارا۔نیلو نے جواب میں خواب آور گولیاں کھا لیں۔میں اور ریاض اسے دیکھنے UCH گئے۔جب دیکھ کر واپس آ رہے تھے تو میں نے کہا۔"ریاض شاہد! نیلو نے بڑا ہی اینٹی امپریلسٹ رول ادا کیا ہے۔اس نے شہنشاہ ایران کے سامنے جو امریکی سامراج کا اس علاقے میں سب سے بڑا SHO ہے ناچنے سے انکار کر دیا ہے۔اس پر ایک نظم ہو گئی ہے۔اس نے کہا" سناؤ" تو میں نے یہ نظم کہی تھی۔

نیلو

تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

تجھ کو انکار کی جرات جو ہوئی تو کیونکر
سایہ شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے

اہل ثروت کی یہ تجویز ہے سرکش لڑکی
تجھ کو دربار میں کوڑوں سے نچایا جائے
ناچتے ناچتے ہو جائے جو پائل خاموش
پھر نہ تازیست تجھے ہوش میں لایا جائے

لوگ اس منظر جانکاہ کو جب دیکھیں گے
اور بڑھ جائے گا کچھ سطوت شاہی کا جلال
تیرے انجام سے ہر شخص کو عبرت ہو گی
سر اٹھانے کا رعایا کو نہ آئے گا خیال

طبع شاہانہ پہ جو لوگ گراں ہوتے ہیں
ہاں انہیں زہر بھرا جام دیا جاتا ہے
تو کہ ناواقف آداب شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

ریاض شاہد نے بعد میں اسی نظم کو سامنے رکھ کر ایک کہانی فلسطین کے پس منظر میں لکھی اور اس پر "زرقا" فلم بنائی۔ اس فلم میں یہی نغمہ ہٹ ہو گیا اور تاریخ کا حصہ بن گیا۔

حسن ناصر

اس زمانے میں حسن ناصر کو قلعہ لاہور میں شہید کیا گیا تھا۔ حسن ناصر نیشنل عوامی پارٹی کے آفس سیکرٹری تھے لیکن ان کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے تھا۔ وہ ایک ڈیموکریٹک پارٹی میں ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔ حسن ناصر بہت خوبصورت نوجوان تھا۔ بلا کا

ذہین آدمی اور بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ اس کا خاندان حیدرآباد (دکن) کے نوابوں کے خاندان سے تھا۔ حسن ناصر ہندوستان سے یہاں منتقل ہو گیا تھا اور اس کا یہاں کے لوگوں سے گہرا ربط تھا۔ وہ مزدور بستیوں میں رہتا اور ان کے لیے کام کرتا تھا۔ حکومت نے پولیس کو اس کے پیچھے لگایا ہوا تھا۔ اس دور میں سوشلزم کا لفظ استعمال کرنا اور خود کو سوشلسٹ یا ترقی پسند کہنا بہت حوصلے اور دل گردے کی بات تھی۔ حکومت اور حکومت نواز ایسے لوگوں کو غدار، ملحد اور پتہ نہیں کیسے کیسے القابات سے پکارتے تھے۔ سوسائٹی میں ان کا رہنا دوبھر کر دیا جاتا تھا۔ اس دور میں یہاں لاہور میں ترقی پسند مصنفین کا ایک اجتماع ہوا تھا۔ حکومت کے پالتو غنڈوں نے ترقی پسندوں کے جلسوں پر پتھراؤ کیا۔ لاٹھی چارج ہوا اور ترقی پسند رائٹرز کو زدوکوب کیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب رجعت پسند عناصر ترقی پسند نظریات رکھنے والوں کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حسن ناصر کو بھی حکومت نے گرفتار کر لیا اور شاہی قلعہ لاہور کے ٹارچر سیل میں رکھا گیا یہاں حسن ناصر پر اس قدر تشدد ہوا کہ وہ شہید ہو گئے اور پولیس نے اس کی لاش کو خود ہی دفنا دیا۔ اس کی ماں ہندوستان سے یہاں آئی۔ اس نے کہا کہ میرے بیٹے کی لاش کو دکھایا جائے۔ جو لاش دکھائی گئی اسے دیکھ کر اس نے کہا کہ یہ میرے بیٹے کی لاش نہیں ہے کیونکہ ماں اپنے بیٹے کو بالوں سے پہچان لیتی ہے۔ میاں محمود علی قصوری اور میجر اسحاق نے خاص طور پر اس مقدمے کی پیروی کی تھی اور ان کی کوششوں سے ہی اس کیس کے بارے میں بہت سی باتیں سامنے آئیں لیکن آمریت اور آمروں یعنی حکومت وقت سے کون جیت سکا ہے۔ لہٰذا حکومت کے Version کو ہی یہاں منوایا گیا جبکہ حسن ناصر کو ایوبی آمریت نے شہید کر دیا تھا۔

عابد حسن منٹو

یہ ایوب خان کے عہد کی کہانی چل رہی ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ جب مجھے پکڑ لیا گیا اور نظر بند کر دیا گیا تو میاں قصوری نے ہی میری وکالت کی تھی۔ وہ مجھے ضمانت ہونے پر جیل سے سیدھے مادر ملت کے جلسے میں لے کر آئے تھے۔ یہاں مجھے ایک شاعر سائل فارانی نے بتایا کہ ایک مشہور شاعر (اس کا میں نام نہیں لینا چاہتا) نے عابد حسن منٹو سے کہا تھا کہ آپ حبیب جالب کے خلاف محمد وارث کے حق میں گواہی دیں اور اسکی ضمانت نہ ہونے دیں۔ میں عابد حسن منٹو کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اس شاعر سے کہا کہ "میں حیران ہوں کہ آپ حبیب جالب کے خلاف میرے پاس آئے ہیں۔ مجھے تو یہ توقع تھی کہ آپ اس کے حق میں کہنے کے لیے آئیں گے۔" عابد حسن منٹو جب طالب علم تھے تو میرا اکثر کالجوں میں آنا جانا رہتا تھا۔ میں ان دنوں جوان تھا۔ نوجوان طلباء مجھے سنا کرتے تھے۔ میری شہرت لاہور میں یونیورسٹی کے اس مشاعرے میں پڑھنے سے ہوگئی تھی' جس میں زہرہ نگاہ بھی تھیں۔ عابد حسن منٹو لاء کالج میں پڑھتے تھے۔ ان کا الیکشن تھا' وہ اپنے کالج کی یونین کے لیے صدارتی امیدوار تھے۔ ان کی کمپین چل رہی تھی۔ میں وہاں سے

گزر رہا تھا۔ سید حافضل حیدر اور منشو نے مجھے دیکھ لیا اور مجھے کہا کہ آپ ہماری کیمپین میں حصہ لیں تو میں نے ان کے جلسے میں اپنا کلام سنایا تھا۔ ایک اچھے نظریاتی ہونے کی وجہ سے وہ Elect ہو گئے تھے۔ میرے ان کے ساتھ تعلقات اس زمانے سے چلے آ رہے ہیں۔ یہ ان کی عظمت ہے کہ وہ اس شاعر کے کہنے کے باوجود میرے خلاف پیش نہیں ہوئے۔ وہ جب بھی میرے کسی فنکشن میں آتے ہیں تو مجھ سے کہتے ہیں کہ "میں آپ کا مقروض ہوں آپ نے ہی مجھے Elect کروایا تھا اب میں آہستہ آہستہ یہ قرض اتار رہا ہوں۔

میں ان صحافیوں کا بھی شکر گزار ہوں کہ جس زمانے میں گورنر کالاباغ کے کہنے پر مجھ پر 302 کا کیس بنا تھا انہوں نے اس کیس کی شاندار رپورٹنگ کی اور اس کیس کے حقائق کو بے نقاب کیا تھا۔ ان میں عبداللہ ملک بھی شامل ہیں جو اس زمانے میں امروز کے چیف رپورٹر تھے انہوں نے میرے حق میں گواہی بھی دی تھی۔

شمیم احمد خان جو پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں سپیکر اسمبلی تھے انہوں نے بھی اس کیس میں میرے حق میں گواہی دی تھی۔ جب وہ طالب علم تھے تو ان کے الیکشن میں بھی میں نے حصہ لیا تھا۔ وہ کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انہیں پولیس پکڑ کر لے گئی۔ بہر حال یہ وہ جرات مند لوگ ہیں جنہوں نے سچ کا ساتھ دیا تھا۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔

دو لاحقے

ایک دوست نواب شاہد حسن ناطق تھے جو شاعر بھی تھے مگر وہ خارج البحر اور بے وزن شعر کہا کرتے تھے۔ ان کا دراصل دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ اسی لیے ان کے ہاں شاعری "متوازن" نہیں تھی۔ ایک دفعہ فضل کریم فضلی جا رہے تھے میں انہیں کافی ہاؤس میں لے آیا۔ اتنے میں نواب صاحب آ گئے۔ میں نے ان کا تعارف کروایا کہ "یہ ہیں نواب شاہد حسن خان ناطق دہلوی" فضلی صاحب نے کہا کہ کچھ شعر سنائیں تا کہ پتہ چلے کہ کیسے شاعر ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ایسے ہی شاعر ہیں پہلے کافی پیتے ہیں پھر شعر سناتے ہیں۔ انہوں نے کافی منگوائی۔ نواب صاحب نے پی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے اشعار سنانا شروع کئے اور پہلا شعر پڑھا۔

پائے حنائے زلف دیکھا چاہیے
تھا اے جاناں جاناں ہو گئیں

فضلی صاحب نے چلا کر کہا کہ "صاحب کیا کہا؟ کیا مطلب؟" تو نواب صاحب نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ "جناب میں دو دو لاحقے نہیں پالتا" کہ پہلے شعر سناؤں اور پھر مطلب بھی سمجھاؤں۔" یہ تھی ان کی ذہنی فضا...... انہوں نے بھی کورٹ میں جا کر

میرے حق میں گواہی دی تھی اور کہا کہ "جناب میرے سامنے جالب صاحب کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ میں وہیں موجود تھا۔ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔" میں نواب صاحب مرحوم کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میرے حق میں گواہی دی تھی۔

◆◆◆

بوٹاں دی سرکار

ایوب خان نے پاکستان توڑنے کی شروعات کی تھیں۔ اگرچہ یہ بنیاد اس وقت پڑ گئی تھی جب قائداعظم نے آنکھیں بند کیں اور ایک بیوروکریٹ غلام محمد کو ان کے ''قائم مقام'' ہونے کے تمام اختیارات منتقل ہو گئے تھے۔ اسی کے باعث جمہوریت کے امکانات ختم ہو گئے اور یہاں بیوروکریسی مسلط ہو گئی۔ آگے چل کر اسی کی ایک خوفناک شکل ایوب خان تھا۔ ہمارے ملک کے قریب ترین ملک روس تھا۔ وہ ہمارا ہمسایہ ہے جبکہ دنیا کے کسی دور کونے میں امریکہ ہے۔ چونکہ بیوروکریسی امریکن تھی ایوب خان اس کا سرخیل تھا اس لیے جان بوجھ کر قریبی ہمسایہ ملک کو نظرانداز کیا گیا۔ حکمت عملی بھی یہ ہوتی ہے کہ قریب ترین بڑے ہمسایہ ملک سے گہرے تعلقات و روابط استوار کیے جائیں لیکن یہاں تو کبھی انڈیا سے نہیں بنی۔ جب تک بیوروکریٹ رہے، ایسا نہیں ہوا اور جب تک ہیں نہیں ہوگا۔ بیوروکریسی ایک لعنت ہے جو ہمارے مسائل حل ہونے نہیں دیتی۔ میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ ہماری ہمسایہ ملکوں سے پائیدار دوستی ہو اور آزاد و خودمختار غیر جانبدار خارجہ پالیسی قائم ہو۔ اپنی اس رائے کا میں نے ہمیشہ برملا اظہار کیا۔ اس کے لیے میں نے بڑی مار کھائی ہے۔ کبھی مجھے انڈو چائنہ ایجنٹ کہا گیا تو کبھی انڈو سوویٹ لابی کا ایجنٹ پکارا گیا۔ ہم تو ایجنٹ کسی کے بھی نہیں تھے۔ ہم عوام کے ایجنٹ تھے اور آج بھی عوام کے ہی ایجنٹ ہیں۔ یہاں پر ایک ایسی خارجہ پالیسی کی بنیاد رکھی گئی جس میں امریکہ ہی ہمارا ''ان داتا'' ہے۔ امریکہ ہی ہمارا سرپرست ہے۔ امریکہ ہی ہمیں تنخواہ دیتا ہے اور امریکہ ہی کی امداد کے سہارے یہاں بیوروکریسی اور آمریت چل رہی اور ہم پر مسلط رہی ہے۔ ایوب خان کے زمانے میں بھی امریکہ کو پورے ملک پر مسلط کرنے کے لیے ایک فضا بنائی گئی تھی۔ جو آج تک جاری ہے۔ میں نے ایک نظم لکھی تھی کہ

امریکہ توں جنگ آوندی اے
بھکھ آوندی اے ننگ آوندی اے
روٹی کپڑا چھت نہیں آوندی
چھریاں تے رنگت نہیں آوندی
تاپ آوندا اے کھنگ آوندی اے

امریکہ	توں	جنگ	آوندی	اے
امن	محبت	پیار	نہیں	آوندا
کوئی	اوتھوں	غم خوار	نہیں	آوندا
اوتھوں	بارش	سنگ	آوندی	اے
امریکہ	توں	جنگ	آوندی	اے
بھکھ	آوندی اے	ننگ	آوندی	اے

''ادھے پوے'' کا آدمی

الطاف گوہر ایک ادیب اور دانشور ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق سے ان کا تعلق تھا۔ ہم سے ان کی بہت پرانی شناسائی ہے۔ بڑے مہذب انسان ہیں۔ وہ ایوب خان کے پرسنل سیکرٹری رہ چکے ہیں۔ پھر سیکرٹری اطلاعات ہو گئے تھے مگر ایک شاعر اور ادیب کے مابین جو تعلقات تھے وہ اس کا بے حد احترام کیا کرتے ہیں۔ اس زمانے میں وہ بھی مجھ سے نظمیں سنا کرتے جو میں نے ایوب خان کے خلاف لکھی تھیں۔ اگر ایسے موقع پر کوئی غصے میں آ جاتا (ایک بار تو نظم سنانے کے دوران ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی تھی) تو الطاف گوہر بیچ بچاؤ کرا دیتے تھے۔ وہ کہتے کہ ''شعر کے سامنے شعر لاؤ' نظم کے سامنے نظم لاؤ۔ یہ کوئی بات نہیں کہ آپ ایک شاعر کے ساتھ ہاتھا پائی کریں۔'' جب میں اپنی کتاب ''حرف سردار'' چھپوانے لندن گیا تو الطاف گوہر نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ

''امیر محمد خان آف کالا باغ مجھے ''گوہرا'' کہتے تھے۔ ایک دن اس نے کہا' ہاں بھئی گوہرے ادھر آؤ۔ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ ایک شاعر کو پکڑ لیا ہے اور الزام لگایا ہے کہ اس نے چاقو مارا ہے۔ اس کے تھیلے سے دو بوتل شراب برآمد ہوئی۔ وہ تو ''ادھے پوے'' کا آدمی ہے اس کے پاس سے دو بوتلیں کیسے نکل آئیں گی؟ لوگ تو آپ کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس نے کہا' اچھا! تو پھر کیا کیا جائے۔ میں نے کہا' صاحب! اسے چھوڑ دیا جائے۔''

یہ الطاف گوہر کا بیان ہے جو کہیں چھپ بھی چکا ہے۔ اسی زمانے میں بھٹو صاحب سے متعلق بھی ایک واقعہ ہے جو کچھ چھپ چکا ہے کہ ان کے پاس ایک بیگ تھا اور وہ کہیں جا رہے تھے۔ کسی نے کہا ''لائیے یہ مجھے پکڑا دیں۔'' تو انہوں نے کہا۔ ''میں بیوقوف نہیں ہوں کہ جالب کی طرح دن میں دو بوتلیں لے کر گھوموں۔ اس میں کیا ہے' کچھ بھی نہیں۔'' اس طرح کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ لوگوں نے اس کیس کا مذاق بنا لیا تھا کیونکہ سب جانتے تھے کہ مجھے مادر ملت کے جلسوں میں پڑھنے سے روکنے کے لیے مجھ پر

جھوٹا کیس بنوایا گیا تھا۔ یہ ایک ضمنی سی بات تھی۔ میں ان حضرات کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس جھوٹے کیس میں میرے حق میں گواہیاں دیں اور میرے لیے سوچا۔

بھٹو سے پہلی ملاقات

میں جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ ایوب خان کا دور بے حد اعصاب شکن تھا۔ بھٹو صاحب کا ایوب سے اختلاف ہو گیا تھا کیونکہ وہ تاشقند کے مسئلے پر ایوب خان سے متفق نہ تھے۔ ظاہر ہے جہاں اتفاق ہی نہ ہوگا تو پھر علیحدگی ناگزیر ہے۔ بقول بھٹو صاحب کے ''ایوب خان نے مجھے کمرۂ سبز میں بلا کر ڈانٹا تھا۔'' یہ وہی کمرہ تھا جہاں ایوب خان نے محمد علی بوگرہ کو بھی طمانچہ مارا تھا۔ وہ اپنے ساتھ اختلاف کرنے والے ساتھیوں کو وہیں بلایا کرتا تھا۔ وہ بھٹو صاحب سے بھی ناخوش ہوا۔ اس وقت ہم ایوب خان کے خلاف لڑتے لڑتے مضمحل ہو چکے تھے کہ بھٹو کی صورت میں ایک آواز ابھری کہ وہ جمہوریت کی تحریک کو آگے بڑھائیں گے۔ آمریت کے خلاف لڑیں گے۔ تو ہم نے ان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور جب ایوب بھٹو اختلاف ہوا تو یہ بات بھی چل پڑی تھی کہ بھٹو کو ملک بدر ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ بھٹو نے بعد میں بتایا تھا کہ ''ایوب خان نے کمرۂ سبز میں مجھ پر دباؤ ڈالا تھا کہ میں سیاست چھوڑ دوں اور علالت کا بہانہ کر کے ملک سے باہر چلا جاؤں۔'' ہمارے کان میں بھی یہ بھنک پڑ چکی تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو پر یہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ یہاں سے چلے جائیں تو میں نے اس فضا کے متعلق یہ نظم لکھی تھی۔

دست خزاں میں اپنا چمن چھوڑ کے نہ جا
آواز دے رہا ہے وطن چھوڑ کے نہ جا

دل تنگ کیوں ہے رات کی تاریکیوں سے تو
پھوٹے گی صبح نو کی کرن چھوڑ کے نہ جا

تیرے شریک حال ہیں منصور اور بھی
سونی فضائے دار و رسن چھوڑ کے نہ جا

اے دوست چشم غیر میں بے آبرو نہ ہو
اے درِ شہوارِ عدن چھوڑ کے نہ جا

ہر چند راستوں میں شکاری ہیں خیمہ زن

تو ہے اگر غزال ختن چھوڑ کے نہ جا
قالین کا شیر ناچ رہا ہے مصاف میں
مردان صف شکن کا چلن چھوڑ کے نہ جا
المانیہ کے پھول بھی گو دلفریب ہیں
اپنے وطن کے سرو و سمن چھوڑ کے نہ جا
مسحور ہے ابھی ترے نغموں سے انجمن
سب دے رہے ہیں داد سخن چھوڑ کے نہ جا
اے ذوالفقار تجھ کو قسم ہے حسین کی
کر احترام رسم کہن چھوڑ کے نہ جا

یہ نظم اس زمانے میں ''نوائے وقت'' کے آخری صفحہ پر چھپی تھی اور پانچ روپے میں ایک پرچہ بکا تھا۔ میری ذوالفقار علی بھٹو سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس نظم کے ذریعے میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ تم آمروں کے سامنے ڈٹے رہو اور ملک چھوڑ کے نہ جاؤ۔ ایک امید ایک آس تم سے بندھی ہے کہ تم غریب اور مفلوک الحال لوگوں کی آواز بن کر ابھرو گے کیونکہ ہمارا مشن یہی تھا۔ یہی نظریہ فن بھی ہے کہ آمریت کے خلاف اٹھنے والی ہر شکل اور صورت کا بھرپور ساتھ دیں۔ جمہوریت کی منزل کو پانے کے لیے جمہوری تحریک کو آگے بڑھانے والے ہی ہمارے ہم خیال ہو سکتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو ان دنوں فلیٹیز ہوٹل لاہور میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں سے ان کے ایک ساتھی امان اللہ خان نے مجھے فون کیا کہ بھٹو صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ میں وزراء سے ملا نہیں کرتا' وہ سابق ہوں یا وزارت میں ہوں۔ اگر وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو میرے پاس کافی ہاؤس میں آ جائیں۔'' میں نے سوچا' وہ نہیں آئیں گے مگر تھوڑی دیر بعد ان کی طرف سے فون آیا کہ وہ آ رہے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے میں نے کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے نوجوان دوستوں کو بریف کیا کہ بھٹو صاحب آ رہے ہیں۔ ایک پروٹوکول ہوتا ہے اس کا خیال رکھئے گا۔ آپ جو باتیں پوچھنا چاہتے ہیں اخلاق اور دائرہ ادب میں رہ کر پوچھئے گا۔ کوئی ایسی بات نہ پوچھی جس سے ہمارے مہمان کی دل شکنی ہو اور یہ کہ کافی ہاؤس کی بڑی عظیم روایت ہے جہاں بڑے بڑے عظیم المرتبت لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ جیسے فیض احمد فیض' ساحر لدھیانوی' چراغ حسن حسرت' عبداللہ

بٹ اور تقسیم سے پہلے ہندو مسلم اکٹھے بیٹھتے تھے۔ تو اس طرح میں نے سب کچھ سمجھا دیا کیونکہ بھٹو صاحب ایوب خان سے نئے نئے الگ ہوئے تھے اور نوجوان دانشور ادیبوں اور شاعروں ایوبی آمریت کے خلاف جو غم و غصہ تھا مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں بھٹو صاحب پر بھی انتہائی تنقید نہ ہو کہ جو اس وقت بے محل ہو گی۔ شکر ہے کہ دوستوں نے میری بات کو سمجھا۔

بھٹو صاحب اپنی گاڑی میں کافی ہاؤس آئے۔ وہ بہت پڑھا لکھا اور ذہین آدمی تھا۔ نوجوان ادیب ان سے گھل مل کر گفتگو کرتے رہے اور بڑے سلجھے ہوئے انداز میں ان سے گفتگو کا سلسلہ رہا۔ بھٹو صاحب کا طرز گفتگو اس طرح تھا جیسے وہ سب کو مطمئن کر رہے ہوں اور حالات ان کے کنٹرول میں ہوں پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔ ''اچھا تو دوستی ہوئی؟ میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ اگر میں آپ کو بلاؤں تو آپ آئیں گے؟'' میں نے کہا۔ ''جی ہاں'' پھر انہوں نے کہا کہ ''اب وہ نظم سنائیں جو آپ نے میرے لیے کہی ہے۔'' میں نے کہا ''جناب اس نظم کی افادیت نہیں رہی اور ویسے بھی آپ کے لیے کہی ہوئے نظم آپ کو سنانا سراسر خوشامد ہو گی جو کہ میری فطرت کے خلاف ہے۔'' وہ مسکرائے اور کہا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔'' اور چلے گئے۔

یہ میری بھٹو سے پہلی ملاقات تھی۔ میں ان کے جلسوں میں ایک سامع کی حیثیت سے جانے لگا۔ کیونکہ ہم سب ایوب خان کے حامیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ ہمارے اردگرد کا ماحول بے حد خوفناک تھا۔ آمریت کا خوف اور دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے میں آمریت کے خلاف اٹھنے والی کوئی بھی آواز آتی تو ہم خوش ہوتے تھے کہ چلو کوئی تو اپنا ہمنوا بھی ہے اور ہمارا حوصلہ بڑھتا تھا۔ اس لیے میں بھٹو صاحب کے جلسوں کا ہجوم دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ میری اس وقت یہ خواہش تھی کہ بھٹو صاحب کونشن لیگ کا لبادہ اتار دیں اور کھل کر میدان عمل میں آئیں۔

کھلونا لگی ہتھکڑی

ان ہی دنوں وائی ایم سی اے ہال میں حمید نظامی ڈے پر ایک جلسہ ہوا۔ اس کی صدارت ذوالفقار علی بھٹو نے کی تھی۔ اس جلسے کی نظامت کے فرائض شورش کاشمیری ادا کر رہے تھے۔ میں نے وہاں اپنی ضبط شدہ کتاب ''سر مقتل'' سے ایک نظم پڑھی اور پھر تقریر کرتے ہوئے بھٹو سے کہا کہ ''آپ ایوب خان کی کونشن لیگ سے نکل آئیں اور جمہوریت کی بات کریں۔'' تو انہوں نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا ''ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔'' میں نے وہاں ایک ضبط شدہ نظم سنائی لہٰذا یہ نظم سنانے پر مجھے حکومت نے ایک بار پھر گرفتار کر لیا اور پھر مجھے پرانی انارکلی تھانے میں رکھا گیا۔

ہمارے ایک دوست بھاٹی گیٹ کے طفیل پرویز محترم ہیں ہماری پارٹی کے آدمی تھے۔ وہ تھانے میں مجھ سے ملنے آئے اور

ہمارا ان کے ساتھ خفیہ کوڈ ورڈ تھا' دو روپے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہاں سے ''دو روپے'' لے لینا اور شاہنور اسٹوڈیو چلے جانا۔ وہاں شوکت حسین رضوی سے ملنا میرا ان سے سلام کہنا۔ میں ان کی فلم کا گانا لکھ رہا ہوں۔ ان سے کہنا' میں آجاؤں گا۔ طفیل پرویز محترم ''ہاں ہاں'' کرتا رہا۔ شاید وہ کچھ نہیں پایا اور کسی پولیس والے نے میرا اشارہ سمجھ لیا تھا پولیس والے فوراً مجھے میرے گھر لے گئے۔ مجھے ہتھکڑی لگائی ہوئی تھی۔ جب میں گھر کے قریب پہنچا تو میری بیوی نے عقلمندی کی کہ اس نے پچھلے دروازے سے میرا وہ بیگ جس میں میری ضبط شدہ کتابیں تھیں' نیچے پھینک دیا اور کسی سے کہہ دیا کہ اسے چھپا دینا۔ پولیس گھر کے اندر داخل ہوئی اور اس نے وہیں ہاتھ ڈالا جہاں بیگ پڑا ہوا تھا۔ کوئی زبردست مخبری ہوئی تھی۔ اب وہ بیگ وہاں نہیں تھا۔ وہ میری ضبط شدہ کتاب ڈھونڈ رہے تھے۔ سارے مکان کی تلاشی لی گئی۔ انسپکٹر زمان جو مجھے ملتان سے جانتا تھا' اس نے مجھے کہا۔ ''آپ کے ہاں سے جو بھی برآمد ہوگا وہی لکھیں گے کوئی چیز اپنی طرف سے نہیں ڈالیں گے۔'' انہیں یقین تھا کہ کتاب یہاں سے نکل آئے گی۔ میرے چچازاد بھائی محسن احسن میرے ساتھ ہی رہتے تھے ان کے کپڑوں کی تہہ میں ایک خنجر چھپا ہوا تھا۔ اس خنجر کی بھی ایک کہانی ہے...... جس پاکستان بن رہا تھا اور مشرقی پنجاب میں ہمارے گاؤں میانی افغاناں میں حملہ ہوا تو ہمارے چچا صادق علی حملہ آوروں میں گھر گئے۔ وہ بہت بہادر انسان تھے۔ وہ تنہا ایک لاٹھی کے ساتھ بلوائیوں سے لڑتے رہے اور انہیں زخمی کر کے بھگا دیا۔ حملہ آور اپنا خنجر وہاں چھوڑ گئے جو وہ یہاں ساتھ لے آئے تھے لیکن جب پولیس تلاشی لے رہی تھی تو اسے وہ خنجر دکھائی نہیں دیا۔ انہوں نے کپڑے ہی اس طرح اٹھائے کہ وہ تہہ میں پڑا رہا' نیچے نہیں گرا ورنہ خنجر کی برآمدگی پر مجھ پر ایک اور مقدمہ بن سکتا تھا۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ پولیس کو ناکامی ہوئی۔ جب میرے گھر کی تلاشی لے رہی تھی تو میری بچی جس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے اس وقت وہ ایک آدھ سال کی ہو گی۔ وہ میری ہتھکڑی سے کھیل رہی تھی۔ میں نے یہ شعر اس وقت کہے تھے۔

اس کو شاید کھلونا لگی ہتھکڑی
میری بچی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی
یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے
یہ ہنسی دے گئی کتنی طاقت مجھے
کس قدر زندگی کو سہارا ملا
ایک تابندہ کل کا اشارہ ملا

انسپکٹر نے پولیس والوں کو ڈانٹا کہ ہتھکڑی لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے ہتھکڑی کھول دی۔ تلاشی میں ناکامی کے بعد مجھے دوبارہ تھانے لایا گیا اور وہاں سے جیل بھیج دیا گیا۔ جیل کے اندر مجھے جس بیرک میں رکھا گیا اس کی زمین کچی تھی۔ میں رات کو سویا ہوا تھا کہ میری کروٹ کے نیچے آ کر ایک بچھو مر گیا۔ صبح اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل شوکت محمود آئے اور پوچھا۔ "جالب صاحب! کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ ایک لاش لے جائیں اس بچھو کی جو میری کروٹ کے نیچے آ کے مر گیا ہے بیچارہ" یہ جیل بوسٹل جیل تھی۔ انگریزوں نے یہ جیل بنائی تھی۔ اب تو وہاں شادمان کالونی بن گئی ہے۔ ان دنوں رسول بخش تالپور بھی جیل میں تھے۔ وہاں ان کا اثر و رسوخ تھا۔ وہ ہر شب آٹھ بجے مجھ سے ملنے آ جایا کرتے تھے۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک سلاخوں سے لگ کر وہ مجھ سے باتیں کیا کرتے تھے وہ اپنے ساتھ اگر بتی لایا کرتے تھے کیونکہ جیل کے اندر مچھروں کی بہتات تھی۔ میں وہ اگر بتی سلگاتا اور چادر تان کر سو جایا کرتا تھا۔

ان ہی دنوں ٹی ہاؤس میں میرے دوستوں نے "حبیب جالب فنڈ کمیٹی" بنائی۔ وہاں ایک بیرا الٰہی بخش تھا۔ (شاید اب بھی ہو) اسے کمیٹی کا فنانس سیکرٹری بنایا گیا تھا۔ ایک دن ٹی ہاؤس کے باہر بھٹو صاحب کی گاڑی آ کر رکی۔ انہوں نے کسی سے پوچھا کہ "یہاں الٰہی بخش کون ہے؟" الٰہی بخش بھاگا بھاگا باہر گیا تو بھٹو صاحب نے اسے میرے فنڈ کے لیے ساڑھے چار سو روپے دیئے۔ بھٹو سے میری دوستی ہو چکی تھی۔ ہمارے درمیان اچھے تعلقات تھے کیونکہ وہ ایوب کابینہ سے الگ ہو کر جمہوری تحریک کے لیے میدان عمل میں آ چکے تھے۔

میرے اس مقدمے میں ایک گواہ حیدر علی بھٹی بھی تھے اس کی حجام کی دکان تھی۔ وہ بی ڈی ممبر بھی تھا۔ شورش کاشمیری نے اس سے کہا کہ تم نے گواہی نہیں دینی اگر دی تو تم رہو گے یا ہم رہیں گے۔ اس نے گواہی کیا دی واویلا ہی کیا کہ "میں وہاں یہ دیکھ رہا تھا کہ لوگ ایوب خان زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔ میں نے حبیب جالب کی نظم نہیں سنی۔ مجھے بالکل پتہ نہیں کہ انہوں نے کیا پڑھا ہے۔"

شیخ رفیق احمد کی وکالت

میرا کیس چل رہا تھا۔ میرے دو وکیل تھے جو اس کیس کی وکالت کر رہے تھے۔ ایک شیخ رفیق احمد تھے جو آج کل پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل ہیں اور دوسرے ملک اسلم حیات تھے۔ میری ضمانت ہو گئی۔ کیس ہائیکورٹ میں تھا اور میں انڈر گراونڈ ہو گیا تھا۔ ہائیکورٹ سے میری ضمانت مسترد ہو گئی تو میں گرفتاری سے بچنے کے لیے مزید محتاط ہو گیا۔ ہائیکورٹ میں پیشی تھی اور مجھے ہائیکورٹ

میں حاضر ہونا ہی تھا۔ میں شیخ رفیق احمد سے ملا اور انہیں کہا کہ کل میری پیشی ہے اور کل پولیس والے مجھے پھر لے جائیں گے اور جیل کے اندر ڈال دیں گے اس لیے آپ میری حاضری لگوا کے وہاں سے نکلوا دیں تا کہ میں پھر غائب ہو جاؤں چونکہ مجھے اعجاز حسین بٹالوی نے کہا تھا کہ ''گرمی بہت ہے حاضری لگوا کے ادھر ادھر ہو جانا۔'' اسی لیے میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ آپ صبح آٹھ بجے ہائیکورٹ پہنچ جایئے مگر وہ بہت لیٹ آئے' ان سے پہلے پولیس آ گئی اور کہا کہ ''آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ ضمانت منسوخ ہو چکی ہے۔'' میں نے کہا کہ ''مجھے نہیں پتہ'' وہ بولے ''اچھا ٹھہرو'' وہ ہتھکڑی لے آئے۔ پولیس والے جب ہتھکڑی لگا کر جا رہے تھے تو سامنے سے شیخ رفیق احمد آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے پولیس کی حراست میں جاتے ہوئے دیکھ کر تحسین کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔

''او شیر دل ہی جیل جایا کرتے ہیں''

اور چلتے ہوئے دس پیکٹ K-2 سگریٹ کے دے دیئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اچھا جی آپ کا شکریہ۔ چلئے شیر ہی سہی ...... یوں ہم شیر بنا دیئے گئے۔ ہمارے والد صاحب نے جاتے ہوئے ہمارے کان میں کہا کہ ''مکان کا کرایہ نہیں دیا۔'' میں نے ان سے کہا کہ ''اسی لیے جیل جا رہا ہوں کہ مکان کا کرایہ نہ دینا پڑے۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام' میں تو جیل جا رہا ہوں جہاں کرایہ نہیں دینا پڑتا۔''

بڑی خوفناک گرمی تھی اور میں جیل میں تھا۔ ایوب خان کی حراست میں تھا۔ ہمارے کیس کے لیے ایک ٹریبونل بنایا گیا تھا اس کی عدالت شمع سینما لاہور کے سامنے تھی۔ وہاں میری پیشی تھی۔ میرے دونوں وکیل پیش ہوئے۔ شیخ رفیق احمد جو ہماری پارٹی کے پنجاب میں جنرل سیکرٹری بھی تھے اور ملک اسلم حیات جو جامی ہاؤس میں بیٹھا کرتے تھے' وہ وہاں کے بڑے اہم آدمی تھے اور اچھے خطیب بھی تھے' بعد میں وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ اب عدالت میں بحث شروع ہوئی۔ رفیق احمد کا یہ استدلال تھا کہ ''عدالت کے جج بے اختیار ہیں وہ ضمانت نہیں لے سکتے' یہ ان کے اختیارات میں نہیں ہے۔''

شیخ صاحب کے ذہن میں شاید یہ نہیں رہا کہ میری ضمانت ہائیکورٹ سے منسوخ ہو گئی تھی تو خصوصی عدالت بنائی گئی تھی جس کے بعد مجھے ایوب خان سے اپیل کرنے کے لیے کہا جاتا جو میں ہرگز نہ کرتا۔ اس وقت مجھے ان جج صاحبان کی صورتیں یاد آ رہی ہیں' وہ شیخ صاحب کا استدلال سن کر حیران ہو رہے تھے کیونکہ ایسی عدالتیں کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے ہی بنائی جاتی ہیں۔ حکومت چھوڑ دیتی ہے یا پھر جیل میں ڈال دیتی ہے۔ جج صاحبان شیخ رفیق احمد کے استدلال پر حیران ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ''جالب صاحب آپ کے وکیل کون ہیں؟'' اب اگر میں یہ کہتا کہ شیخ رفیق احمد میرے وکیل نہیں ہیں تو مجھے پارٹی سے نکال دیتے۔ ایسے میں

ملک اسلم حیات نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کہا کہ "جناب میں سینئر وکیل ہوں اور یہ شاعر ہے۔ بے ضرر آدمی ہے اور آپ ان کی ضمانت منظور کر سکتے ہیں۔" پھر جج کو اطمینان ہوا اور انہوں نے کوئی کلاز یا شق ایسی پڑھی اور سرکاری وکیل کو بتایا کہ یہ پڑھیں۔ انہوں نے پڑھا کہ آپ ضمانت لے سکتے ہیں' چھوڑ سکتے ہیں۔ شیخ صاحب چلائے۔ "لیکن......" شیخ کو خاموش کرواتے ہوئے جج بولا۔ "لیکن ویکن کیا؟" اور مجھے ضمانت پر رہا کر دیا۔

نائم اللیل

وہ پانچ روپے کی پوڑیاں میرے لیے لائے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں سے ضمانت نہیں ہوگی اور مجھے واپس جیل لے جایا جائے گا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میری ضمانت ہو گئی ہے تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ میں نے کہا۔ "تو یہ چاہتا ہے کہ میں پھر جیل چلا جاؤں' یہ پوڑیاں پولیس والوں کو دے دے اور ساتھ پانچ روپے بھی دو تا کہ وہ میری ہتھکڑی کھولیں۔ میں ضمانت پر رہا ہو گیا۔ پھر مقدمہ چلا کہ میں نے نظم پڑھی ہے یا نہیں۔ میرے وکیل ملک اسلم حیات تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "تم یہ کہنا کہ میں یہ نظم نہیں پڑھی۔" میں نے اس سے کہا کہ "میں یہ جھوٹ تو نہیں بول سکتا' تم کوئی اور طریقہ نکالو جس سے میں بری ہو جاؤں۔" انہوں نے کہا کہ "اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ تم نظم سے ہی انکار کر دو۔" وہ بات کر رہے تھے اور مجھے ایک طریقہ یاد آ گیا۔ میں نے کہا کہ سرکاری اتنے شور میں پینتالیس شعر کی نظم نہیں لکھ سکتا۔ آپ اس سے پوچھیے کہ آپ نے پانچ شعر کتنے منٹ میں لکھے' وہ کہے گا "پانچ منٹ میں" تو آپ کہیں کہ لکھو۔ میں مجسٹریٹ کے سامنے پڑھوں گا۔ اگر وہ پانچ شعر پانچ منٹ میں لکھ لے تو پھر ٹھیک ہے لیکن مجھے واثق یقین ہے کہ وہ نہیں لکھ سکتا کیونکہ اس نے یہ نظم کتاب سے ہی نقل کی ہے۔ یہی ہوا' ملک اسلم حیات کو جیسا میں نے سمجھایا تھا انہوں نے ویسے ہی مجسٹریٹ سے کہا کہ "جناب اس نے نظم کتاب سے لکھی ہے آپ اس سے پوچھیں کہ کتنے منٹ میں کتنے شعر لکھ لیں گے؟" مجسٹریٹ نے سرکاری وکیل سے پوچھا تو اس نے کہا کہ "پانچ منٹ میں پانچ شعر لکھ لوں گا۔" میں نے وہی نظم "چھ ستمبر" پڑھنا شروع کی۔

۶ ستمبر

کوئی بھلا دے بھلاتا ہے حسن بے

نہ بھولیں گے مگر لاہور زادے

وہ خونیں چھ ستمبر کی شب غم

وہ ہیبت ناک توپوں کی دھا دھم
گھرا شعلوں میں داتا کا نگر تھا
لیکن بے خبر تھا
ادھر تھی فوج اعدا خیل در خیل
ادھر نیندوں کے ماتے نائم اللیل
ادھر انبوہ آدم بے کراں تھا
ادھر انسان کا کم کم نشاں تھا
عدو اس حال کو بھی چال سمجھا
ہماری بے خودی کو ڈھال سمجھا
ہمارے مورچے اس نے سنبھالے
نہ لیکن بڑھ سکے اس کے رسالے
ہوئے ایسے وساوس میں گرفتار
کہ پا بر جا رہے مانند اشجار
ادھر سوئے ہوئے بھی جاگ اٹھے
ادھر گھبرا کے بزدل بھاگ اٹھے
ادھر تھا جذبہ شوق شہادت
ادھر مال و زر و زن کی محبت
تھا سیل کفر ایماں کے مقابل
مگر کب پیش حق ٹھہرا ہے باطل
تھا جس کے پاس وہ لے کے آیا
خدا کے نام پہ سب کچھ لٹایا

سر میداں تھے مصروف تگ و تاز
عساکر کے جواں مرداں سر باز
دعائیں تھیں زباں پر اہل دیں کی
الٰہی خیر اپنی سر زمیں کی
نکل آئے کفن سر سے لپیٹے
کسانوں اور مزدوروں کے بیٹے
وطن کا بچہ بچہ یوں پکارا
نہ جھکنے دیں گے اپنا چاند تارا
دیئے زیور تک اپنے بیبیوں نے
عروسوں، ماؤں، بہنوں، بیٹیوں نے
حماقت جو ہوئی نادانیوں سے
شجاعت بن گئی قربانیوں سے
بچایا تب کہیں جا کر وطن کو
جھکایا یوں لوائے اہرمن کو
جو کہتے تھے کہ جم خانے چلیں گے
وہاں عشرت کے پیمانے چلیں گے
ملے یوں خاک میں ان کے ارادے
کوئی جیسے پہاڑوں سے گرا دے
وہ جو لاہور لینے کو چلے تھے
کھلی جب آنکھ دلی میں پڑے تھے
یہاں جب جانسن نے مات کھائی

تو کوکن سے اپنی سر ملائی
ہزاروں میل سے اوتھان آیا
پیام صلح اپنے ساتھ لایا
ہوئے خوش تاشقند اعلان پہ ہم
رہی چشم گل و لالہ میں شبنم
ہوا کشمیر اک بھولی کہانی
شہیدوں کا لہو گویا تھا پانی
یہی خوں جنگ میں تھا کام آیا
یہی خوں مال پہ ہم نے بہایا
یہی خوں انتقام خوں بھی لے گا
ستم گر کی کلائی موڑ دے گا
نظام زر سے ہم خیرات کیوں لیں
سحر کا نور دے کر رات کیوں لیں
نظام زر سے ہر غارت گری ہے
کہ دشمن آدمی کا آدمی ہے
یہ سن لیں غور سے مالک ملوں کے
کہ سودے ہو نہیں سکتے دلوں کے
یہ کیسا دور نافر جام آیا
کہ غاصب بن گیا اپنا پرایا
حقوق آدمیت چھن گئے ہیں
برے دن آئے اچھے دن گئے ہیں

مسلط آمریت ہے وطن پر
خزاں کا راج ہے صحن چمن پر
جو حق انساں کو تھا صدیوں سے حاصل
ہوا ہے آج وہ حق حرف باطل
جو آزادی ملی تھی گھر لٹا کر
اب اس کو رو رہے ہیں منہ چھپا کر
وہ آزادی کہ جس کو خوں دیا تھا
بہر قیمت جسے حاصل کیا تھا
ہیں قابض اس پہ آزادی کے دشمن
شب غم چھائی ہے مسکن بہ مسکن
سکوں غائب مسرت بے نشاں ہے
جو مانگی تھی وہ آزادی کہاں ہے
اندھیرے ظلم کے چھائے ہوئے ہیں
خیال و فکر تھرائے ہوئے ہیں
نہیں ہے جرات تقریر و تحریر
زبان و خامہ کو ہے خوف تعزیر
جریدے اگلے وقتوں کے گزٹ ہیں
وزیر و شاہ کے قامت پہ فٹ ہیں
نظر آتی ہے اک تصویر ہر روز
وہی بے ربط سی تقریر ہر روز
لب فریاد پہ تالے پڑے ہیں
کہ جیسے ہم سر مقتل کھڑے ہیں

فضا غم کی بدل جائے گی آخر
ستم کی رات ڈھل جائے گی آخر

میں یہ نظم پندرہ منٹ تک پڑھتا رہا۔ سرکاری وکیل لکھ رہا تھا۔ مجسٹریٹ نے رکوایا اور سرکاری وکیل سے کہا۔ ''دکھایئے' کیا لکھا ہے؟'' سرکاری وکیل نے پندرہ منٹ میں صرف ساڑھے تین شعر لکھے تھے وہ ''نائم اللیل'' کے ہجے نہیں جانتا تھا۔ مجسٹریٹ نے یہ دیکھ کر کہا ''کتابوں سے نظمیں لکھ کر آ جاتے ہیں۔'' اور مجھے باعزت طور پر بری کر دیا۔ یہ نکتہ میں نے اپنے وکیل کو سمجھایا تھا۔ اب یہاں بڑے بڑے شاعر عدالت میں جا کر کہہ دیتے ہیں کہ ''یہ میری نظم نہیں ہے یا میں نے نہیں لکھی۔'' احمد فراز نے اپنی ایک نظم پر ہونے والے کیس میں یہی کہا تھا اور جج صاحب بہت حیران ہوئے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے تو عابد حسن منٹو جو کہ احمد فراز کے وکیل تھے انہوں نے کہا ''بھئی آپ بیٹھ جائیں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں ہے' مسئلہ تو یہ زیر بحث ہے کہ آپ کو حبس بے جا میں دو دن کیوں رکھا گیا؟'' بہرکیف میں نے یہ جھوٹ نہیں بولا کہ میں نے نظم نہیں لکھی ہے یا میری نظم نہیں ہے اور میں تاریخ میں یہ جھوٹ بولنے سے بھی بچ گیا۔

◆◆◆

رستہ نہیں بدلتے

میں ایک تسلسل کے ساتھ عملی سیاست سے وابستہ رہا ہوں اور حکومت وقت کو یہ قطعی طور پر پسند نہیں تھا اس لیے مجھ پر رزق کے دروازے بھی بند ہوتے چلے گئے۔ پنجاب کے تقریباً تمام اضلاع سے ایک ایک بار مجھے صوبہ بدر کیا گیا تھا۔ مشاعرے حکومت کی سرپرستی میں ہوتے تھے۔ ادیب اور شاعر میری مخالفت کرتے تھے کیونکہ میں اپنی نظم ''دستور'' سناتا تھا وہ ڈی سی کے ساتھ رابطہ کرکے میرا مکمل بائیکاٹ کروا دیتے۔ دنیا میں دو ہی ادارے ہوتے ہیں ایک حکمرانوں کا دربار اور دوسرا عوام کا دربار۔ عوام کے دربار میں میری پذیرائی ہوتی چلی گئی۔ میرا انداز باعزت اور باوقار تھا اور میرا اسٹیٹس ان درباری شاعروں سے زیادہ تھا جو حکمرانوں کے دربار سے وابستہ تھے۔ یہ سب شاعر وظیفہ خواروں میں شامل تھے اور مجھے پولیس نے اتنا ٹارچر نہیں کیا جتنا ان ادیبوں اور شاعروں نے کیا ہے۔ رائٹرز گلڈ بنی۔ اس کے تحت ادیبوں' شاعروں نے غیر ممالک کے دورے کیے۔ ان کو مراعات بھی ملیں مجھے لائق تعزیر سمجھا گیا۔

میں نے جس طرح ایوب خان کے عہد میں ابتر زندگی گزاری اور اپنی جدوجہد کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھا۔ یہ ایک بڑا جان لیوا واقعہ ہے۔ ایوب خان کا دور بہت خوفناک دور تھا۔ ایوب خان اپنے اقتدار کے لیے تمام غیر جمہوری اور غیر انسانی ہتھکنڈے استعمال کرتا رہا۔ حفیظ جالندھری اور بہت سارے دوسرے شاعر اس کے ساتھ تھے۔ ان کی شاعری کو عوام میں پذیرائی حاصل نہیں تھی کیونکہ وہ عوام کے مزاج کے خلاف تھی۔ اس میں عوام کا دل نہیں دھڑکتا تھا اور سچائی نہیں ہوتی تھی۔ بناوٹ کے انداز میں کسی آمر کا قصیدہ لکھنا اور عوام کی آزادی اور ان کے حقوق کی بات کرنا' ان دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ میری نظمیں سادہ الفاظ میں ہوتی تھیں۔ ان کی تکنیک بھی نئی تھی۔ پرانے شاعروں کی نظموں کی طرح نہیں تھی۔ اس لیے وہ لوگوں کے دلوں میں اتر گئیں۔

مشیر

ایک دفعہ حفیظ جالندھری مجھے کچہری بازار لائلپور میں ملے۔ میں نے سلام عرض کیا۔ انہوں نے کہا۔ ''جلدی جلدی بات کرلے میں بہت مصروف ہوں۔'' میں نے پوچھا' حضور کیا مصروفیت ہے؟ انہوں نے اوپر آسمان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ ''میں اس کا مشیر ہو گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ خدا کے مشیر ہو گئے ہیں؟'' کہنے لگے۔ ''فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا مشیر ہو گیا ہوں۔ وہ

کسی وقت بھی مجھے بلا لیتے ہیں۔ رات کو دن کو اور مجھ سے پوچھتے ہیں' حفیظ بتاؤ میں کیا کروں تو میں ایوب خان کو عرض کرتا ہوں کہ مسلمان ڈنڈے کا ہی گاہک ہے اس پر ڈنڈا ہی رکھو اور یہ جو وکلاء قانون کے عمل درآمد کی بات کرتے ہیں ان کو بھی سخت سے سخت سزا دے اور یہ جو طالب علم یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف جلوس نکالتے ہیں ان کو بھی اندر ڈال دے' یہ سب ڈنڈے کے گاہک ہیں۔"

حفیظ جالندھری صاحب جب یہ سب فرما رہے تھے تو ایک نظم کا خاکہ میرے ذہن میں بن گیا۔ میں نے اس نظم کا نام "مشیر" رکھا۔

میں نے اس سے کہا
یہ جو دس کروڑ ہیں
جہل کا نچوڑ ہیں
ان کی فکر سو گئی
ہر امید کی کرن
ظلمتوں میں کھو گئی
یہ خبر درست ہے
ان کی موت ہو گئی
بے شعور لوگ ہیں
زندگی کا روگ ہیں
اور تیرے پاس ہے
ان کے درد کی دوا
میں نے اس سے کہا

تو خدا کا نور ہے
عقل ہے شعور ہے
قوم تیرے ساتھ ہے

تیرے ہی وجود سے
ملک کی نجات ہے
تو ہے مہر صبح نو
تیرے بعد رات ہے
بولتے جو چند ہیں
سب یہ شرپسند ہیں
ان کی کھینچ لے زباں
ان کا گھونٹ دے گلا
میں نے اس سے کہا

سوائے سہروردی کے کسی نے ایبڈو کا کیس نہیں لڑا تھا۔ تمام سیاست دان چپ ہو گئے تھے، سرنگوں ہو گئے تھے۔

جن کو تھا زباں پہ ناز
چپ ہیں وہ زباں دراز
چین ہے سماج میں
بے مثال فرق ہے
کل میں اور آج میں
اپنے خرچ پہ ہیں قید
لوگ تیرے راج میں
آدمی ہے وہ بڑا
در پہ جو رہے پڑا
جو پناہ مانگ لے
اس کی بخش دے خطا

میں نے اس سے کہا

ہر وزیر ہر سفیر
بے نظیر ہے مشیر
واہ کیا جواب ہے
تیرے ذہن کی قسم
خوب انتخاب ہے
جاگتی ہے افسری
قوم محو خواب ہے
یہ ترا وزیر خاں
دے رہے جو بیاں
پڑھ کے ان کو ہر کوئی
کہہ رہا ہے مرحبا
میں نے اس سے کہا

چین اپنا یار ہے
اس پہ جاں نثار ہے
پر وہاں جو نظام
اس طرف نہ جائیو
اس کو دور سے سلام
دس کروڑ یہ گدھے

جن کا نام ہے عوام
کیا بنیں گے حکمراں
تو یقیں ہے یہ گماں
اپنی تو دعا ہے یہ
صدر تو رہے سدا
میں نے اس سے کہا

یہ نظم مجھے حفیظ جالندھری نے ہی عطا کی تھی۔ ان کی گفتگو سے متاثر ہو کر ہی میں نے یہ نظم کہی تھی۔ یہ ایسے شاعر تھے جو حکمرانوں کے دربار سے وابستہ تھے اور آمروں کے خیر خواہ تھے جبکہ دوسری جانب تاریخ میں وہ شاعر بھی گزرے ہیں جنہوں نے جھومتے ہوئے پھانسیوں کو چوما ہے۔ انہوں نے آمریت اور شہنشاہیت کے خلاف شاعری کی ہے۔ ایران میں پہلوی دور کے شاعر تھے اور یہ سلسلہ ہندوستان کے حسرت موہانی سے لے کر مخدوم محی الدین تک آتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے بھی انگریزی سامراج کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ ان کا بھی ایک بہت بڑا رول ہے۔ وہ ایک بے بدل صحافی تھے۔ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اس زمانے میں علامہ اقبال کہیں نظر نہیں آتے ہیں البتہ انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ "زمیندار" اخبار کو کرم آباد سے لاہور لے آؤ جو انگریزوں کے خلاف تحریک کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔ اس سے بحیثیت ایک شاعر ہونے کے علامہ اقبال کا قد کم تو نہیں ہو جاتا لیکن میں بات عملی سیاست کی کر رہا ہوں۔ پاکستان میں جو سیاسی تحریکات چلیں ان میں شعراء اور ادباء مراعات یافتہ ہوتے گئے اور میں تنہا ہی موچی گیٹ میں آمریت کے خلاف نظمیں پڑھتا رہا اور قید و بند صعوبتیں اٹھاتا رہا۔ زہرہ نگاہ کے شوہر ماجد نے مجھے لندن میں بتایا تھا کہ "ایک دفعہ فیض صاحب نے ہمارے گھر میں کہا تھا کہ میں حبیب جالب کے سامنے جاتے ہوئے شرماتا ہوں اس کی بڑی قربانیاں ہو گئی ہیں۔" اس سے فیض صاحب کا قد کم نہیں ہو گیا بلکہ ان کی عظمت میں اضافہ ہی ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑے لوگ بڑے دل کے ہوتے ہیں۔

ایوب خان کا عہد بڑی صعوبتوں کا عہد تھا لیکن عوام کے اندر بھی ایسا جوش و جذبہ اور غم و غصہ تھا جو میرے اس انداز زندگی کو پسند کر رہا تھا۔ ٹیلیویژن، ریڈیو اور حکومت کے دوسرے نشر و اشاعت کے ادارے مجھ پر بند تھے لیکن عوام میں میرا شعر چلتا تھا اور مجھے محفلوں میں گھروں میں چھپ چھپ کر لوگ سنا کرتے تھے۔ میرے شاعر دوست جن سے مجھے داد کی ضرورت تھی وہ خوفناک حد تک

خود پسند اور آمریت پسند ہو گئے وہ اپنے کیریئر کو بنانے والے کیریرسٹ تھے۔ انہیں ایسا ڈھب آتا تھا کہ ہر دور میں ہی ''ان'' ہوتے تھے۔ ایوب خان کے عہد میں بھی یہی لوگ تھے۔ حکومتوں کو اپنے نشر و اشاعت کے ادارے چلانے کے لیے ایسے ہی ادیبوں اور شاعروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے ذہن کے مطابق تو آج تک کوئی حکومت یہاں نہیں آئی ہے جو آزادی اظہار کا احترام کرے۔

اپوزیشن لیڈر بھٹو

ایوب خان کا عہد میرے دل و دماغ پر ایک سزا کے طور پر گزرا ہے۔ وہ ایک عہد سزا تھا۔ ہماری پارٹی (NAP) دونوں طرف مغربی پاکستان کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان میں بھی تھی۔ جب مجیب الرحمن پورا چھا تھا اس وقت بھی نیشنل عوامی پارٹی کا ایک امیدوار ایم پی اے بنا تھا۔ NAP خیال کے اعتبار سے ذہین لوگوں کے لیے بڑی قابل قبول تھی۔ ایک دفعہ بھٹو نے میرے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ''مجھے نیشنل عوامی پارٹی میں لے چلو اور اس کا جنرل سیکرٹری بنوا دو۔'' میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ یہ پارٹی جمہوری پارٹی ہے اس میں یوں ہی آدمی سیکرٹری یا صدر نہیں بن سکتا' آپ سال سوا سال اس میں رہیں۔ عوام سے آپ رابطہ کریں' پارٹی کے لوگوں سے آپ ملیں' آپ سے متاثر ہو جائیں گے تو پھر ہم صوبوں سے ایک عہدیدار لیتے ہیں۔ پنجاب سے اگر سیکرٹری ہے تو صدر دوسرے صوبوں سے ہوتا ہے۔ آپ کے لیے ہم فضا ہموار کریں گے۔ فلیٹیز ہوٹل سے کار میں بیٹھ کر میں اور بھٹو صاحب' میاں محمود علی قصوری کی کوٹھی میں آئے۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ بھٹو صاحب ہماری پارٹی میں آ جائیں گے تو ایک ڈیمو کریٹ بن جائیں گے اور ان کا ہم مزاج تبدیل کر دیں گے' ہماری پارٹی بھی ان کی وجہ سے پھیلے گی' مگر جب ہم اندر گئے تو میاں محمود علی قصوری ہمیں عادتاً سی آر اسلم اور سردار شوکت علی کے حوالے کر کے اندر چلے گئے۔ گفتگو شروع ہوئی۔ سی آر اسلم اور سردار شوکت علی نے کہا کہ ''خارجہ پالیسی ایوب خان کی بہت اچھی ہے' ہم اس کو ملک کے لیے بہتر سمجھتے ہیں۔ آپ جاگیردار ہیں' سرمایہ دار ہیں۔'' بھٹو صاحب نے کہا کہ ''چین سے دوستی کی پالیسی میں نے بنائی تھی' ایوب خان کو کیا پتہ!'' وہ اس کو رد کرتے رہے کہ آپ ہمیں قابل قبول نہیں ہیں اور وہ جو میں نے خواب دیکھا تھا کہ بھٹو پارٹی میں آئیں گے اور پارٹی پھیلے گی تو وہ ٹوٹ گیا۔ میں نے کہا' بھٹو صاحب میں چلا۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ بھٹو نے با آواز بلند کہا۔ ''بیٹھو'' خورشید محمود قصوری میرا سر دبانے لگے۔ بات بن نہ سکی۔ میاں محمود علی قصوری جب آئے تو بات بگڑ چکی تھی۔ ہماری پارٹی کی پنجاب کی قیادت بھٹو صاحب کو لینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ واپسی پر بھٹو نے مجھ سے کہا کہ ''آپ کی پارٹی کے لوگوں میں کوئی پرو ماسکو ہے تو کوئی پرو چائنہ ہے۔ اب کیا کیا جائے؟'' میں نے ان سے کہا کہ

اب آپ اپنی پارٹی بنائیں۔ جمہوریت کے لیے ہم کوئی متحدہ محاذ بنائیں گے۔ پھر انہوں نے پیپلز پارٹی بنائی۔ ہماری پارٹی کی پنجاب میں قیادت منقسم ہو گئی تھی۔ سی آر اسلم اور سردار شوکت علی دوسری طرف تھے' میاں محمود علی قصوری اور طرف۔

پیپلز پارٹی جب بن گئی تو بھٹو صاحب جیل میں چلے گئے۔ اس رات جب وہ جیل جا رہے تھے تو ہم سب اس وقت ڈاکٹر مبشر حسن کی کوٹھی پر موجود تھے۔ بھٹو اب کھل کر ایوب خان کے خلاف میدان عمل میں آ گئے تھے۔ مجھے اس رات کا منظر یاد ہے کہ احمد رضا قصوری گا رہا ہے "دمادم مست قلندر" اور "ذوالفقار علی بھٹو" کپڑ کو لاڑکانہ ٹیلیفون کر رہا ہے۔ "ایوب خان کے گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے' احمد رضا قصوری دمادم مست قلندر گا رہا ہے۔ حبیب جالب بھی میرے ساتھ ہی بیٹھا ہے۔ کبریا خان اور اسلم گورداسپوری بھی موجود تھے۔ بھٹو صاحب نے مجھ سے کہا کہ "آپ میرے ساتھ ملتان کے جلسے میں چلیں۔" "میں چونکہ پیپلز پارٹی میں نہیں تھا' میں اپنی پارٹی میں ہی تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ صاحب آپ مجھے تو باہر ہی رہنے دیں' اگلے اسٹیشن پر تو آپ کو قید ہو جانا ہے۔ میں نے تو یوں ہی کہا تھا کیونکہ پکڑ دھکڑ تو ہو رہی تھی۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ گورنمنٹ انہیں ملتان کے جلسے میں نہیں جانے دے گی تو یہی ہوا۔ بھٹو صاحب نے ڈاکٹر مبشر سے کہا کہ "ٹیکسی کا انتظام کرو' ہم جائیں گے۔" انہوں نے ٹیکسی پکڑ لی اور میں اپنے گھر چلا گیا۔ رات کو مجھے نیند کیا آتی' میں تو بیتاب تھا۔ جانتا تھا کہ یہ ہو جائے گا۔ ساڑھے تین چار بجے میری آنکھ کھلی تو میں فوراً اسلم حیات کے گھر گیا۔ دیکھا کہ ان کا لڑکا باہر ٹہل رہا ہے۔ میں نے پوچھا' بھئی کیا ہوا؟ کہنے لگا۔ "پولیس والے میرے ابا کو لے گئے ہیں۔"

میاں محمود علی قصوری

میاں محمود علی قصوری حسب عادت تمام سیاسی ورکرز کے مقدمات فری لڑا کرتے تھے۔ وہ حقوق انسانی کے بہت بڑے وکیل تھے۔ کسی بھی جماعت کا آدمی ہوا سے حکومت نے تبلیغ کے سلسلے میں یا کسی اور ضمن میں جیل میں ڈالا ہے تو اس کا وہ صرف خط پڑھ کر ہی کیس لڑتے تھے۔ عبدالباقی بلوچ کا کیس بھی انہوں نے لڑا جو انڈر گراؤنڈ تھے اور میاں غلام جیلانی کے گھر میں تھے۔ غلام جیلانی خود کو پارٹی میں ایک تنہا آدمی تصور کرتا تھا۔ وہ اپنے موقف پر ڈٹ جاتا تھا اور تنہا اپنا ایک جھنڈا لے کر سڑک پر نکل آتا تھا۔ ان کے ہاں عبدالباقی بلوچ پر گولیاں چلوائی گئی تھیں۔ ایک صحافی تھے وہاں' وہ شہید ہو گئے تھے۔ باقی بلوچ زخمی ہوا تھا مگر بچ گیا تھا۔ محمود علی قصوری ہمارے بزرگ تھے۔ متحدہ ہندوستان میں انگریزی سامراج کے خلاف جدوجہد کرنے والوں میں میاں محمود علی قصوری کے والد بزرگوار کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہ بھی بہت بڑے نڈر آدمی تھے۔ تحریک آزادی کے مجاہد تھے۔ میاں محمود علی قصوری کو انسانی حقوق کی نگہداری کا درس ورثے میں ملا تھا۔ انہوں نے بھٹو کی بھی وکالت کی تھی۔ ان دنوں بیگم نصرت بھٹو نے مجھے کہا تھا کہ "جالب بھائی! کیا

بھٹو صاحب کبھی جیل سے باہر نہیں آئیں گے؟" میں نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہم سلاخیں توڑ دیں گے زنداں توڑ دیں گے اور انہیں آپ کے پاس لے آئیں گے ہم انہیں آزاد کرائیں گے۔ بھٹو صاحب اپنی پارٹی میں ہوتے ہوئے بھی ہمارے قریب تھے۔ میاں محمود علی قصوری کی جدوجہد بڑی طویل تھی' ان کی خواہش تھی کہ وہ پارلیمنٹ کے ممبر بنیں۔ یہ خواہش ہر آدمی کی ہوتی ہے۔ اب انہیں یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ NAP میں رہ کر کبھی ممبر نہیں بن سکتے۔ ان کے NAP سے اختلافات بھی چل رہے تھے۔ ان کو NAP کا صدر نہیں بنایا گیا تھا' ان کی جگہ ولی خان کو صدر بنا دیا گیا تھا۔ میرے خیال میں میاں صاحب کو صدر بنانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ہم ان کے ساتھ تھے کیونکہ ان کا بہت بڑا Contribution تھا لیکن ہمارے دوست ہمیں صرف شاعر ہی سمجھتے تھے یعنی ہماری حیثیت "صرف شاعر" کی تھی۔ اس لیے ہمیں نیشنل عوامی پارٹی میں "دوستوں" نے کوئی جگہ نہیں دی۔ ولی خان جب صدر ہوئے تو انہوں نے مجھے سنٹرل کمیٹی کا ممبر نامزد کیا تھا۔ میاں محمود علی قصوری اور ان کے رفقا نے یہ بات صیغہ راز میں رکھی تھی کہ وہ پیپلز پارٹی میں جا رہے ہیں۔

دو تین دن پہلے میاں محمود علی قصوری نے اپنی ہی کوٹھی میں تقریر کی تھی کہ "اس وقت ولی خان کو چھوڑنا اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف ہے۔" میرے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ وہ پیپلز پارٹی میں چلے جائیں گے۔ میں جب ایک دن صبح سویرے ان سے ملنے ان کی کوٹھی میں پہنچا تو میں نے وہاں ایک بڑا ہجوم دیکھا۔ یہ ہجوم دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہماری پارٹی کے دروازوں پر کبھی اتنا ہجوم تو نہیں ہوا۔ یہ کیا وجہ ہے؟ پتہ چلا کہ بھٹو صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا' میاں صاحب الیکشن لڑنا چاہتے ہیں' بھٹو صاحب ان کی کمپین کا آغاز کرنے آئے ہیں' کیونکہ وہ ان کے وکیل ہیں۔ ان کو آنا چاہیے۔ جب کچھ منٹ گزر گئے تو احمد رضا قصوری نے مجھ سے کہا کہ "میاں محمود علی قصوری تو پیپلز پارٹی میں آ گئے ہیں' تم کب آؤ گے؟" میں نے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟ کبھی سمندر بھی ندی میں گرے ہیں؟" اتنے میں محمود علی قصوری آ گئے وہ مجھ سے کہنے لگے۔ "بھئی ہم تو آ گئے ہیں۔ اب زیادہ بلند آواز میں ہمارے خلاف باتیں نہ کرو۔" میاں صاحب مجھے اندر لے گئے' بھٹو صاحب بیٹھے ہوئے تھے' ان کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ "بھٹو صاحب! یہ ہماری سنٹرل کمیٹی کے ممبر ہیں' ان کو بھی قومی اسمبلی کا ٹکٹ دینا ہے۔" بھٹو صاحب نے کہا۔ "آپ ان کی سفارش کیوں کرتے ہیں' یہ تو میرا دوست ہے۔ میں اس کے جلسے میں بھی آؤں گا۔ پیسے بھی لگاؤں گا' تقریر بھی کروں گا۔" میں نے کہا۔ "صاحب! میں تو آپ کی پارٹی میں نہیں آ رہا' مجھے تعجب ہے کہ میاں محمود علی قصوری کیسے آ گئے؟" میں نے جب یہ بات کی تو بھٹو کو بڑی حیرت ہوئی اور میں نے انہیں بہت کچھ سنایا اور وہ کہنے لگے۔ "اچھا ٹھہریں...... اچھا بات کریں...... بات کریں...... میں تو اپنے کمرے میں چلا۔" بھٹو کو میرا جواب سن کر بہت شاک ہوا تھا کہ ایک شاعر کو میں نے دعوت دی اور اس نے مجھے صاف انکار کر دیا اور یہ لوگ جو بیٹھے

ہوئے تھے ان کا کہنا تھا کہ حبیب جالب ہماری جیب میں ہے۔ بھٹو نے ایک بار پھر کہا کہ ''بھئی جالب کو لاؤ' جالب کو کیوں نہیں لائے؟'' کسی نے بھٹو صاحب سے کہا کہ ''جالب کی اپنی ایک انا ہے اس کی ایک الگ حیثیت' شاعر کی حیثیت ہے۔ جب تک آپ نہیں جائیں گے یا آپ کا پیغام نہیں جائے گا وہ کبھی نہیں آئے گا۔'' دوستوں نے یہ بھی کہا کہ ''جالب کو ہم پکڑ کر لاتے ہیں۔'' چنانچہ میرا ایک بہت جگری دوست تھا وہ مجھے ایور نیو اسٹوڈیو سے ٹیکسی میں لے گیا۔ اب میاں محمود علی قصوری کے رفقاء کی بکی ہو رہی تھی۔ وہ سب ایک دوسرے کو کہتے تھے کہ ''جالب میری جیب میں ہے' ضرور آئے گا۔'' اس مقصد کے لیے ایک دوسرے مجھے لے جا رہا تھا۔ میں نے راستے میں اس سے کہا کہ ذرا پاک ٹی ہاؤس سے پانی پی لیتے ہیں' پھر چلتے ہیں۔ میں پاک ٹی ہاؤس کے اندر گھس گیا اور وہاں سب ادیبوں کو جمع کر لیا اور ان سے کہا کہ میں پیپلز پارٹی میں نہیں جانا چاہتا مگر یہ صاحب مجھے اغواء کر کے لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اس سے کہا کہ ''آپ نے ان کی دہشت نہیں دیکھی' آپ انہیں کیوں لے جا رہے ہیں' نہیں لے جا سکتے۔'' چنانچہ پھر میاں محمود علی قصوری میرے گھر آئے۔ پروفیسر امین مغل میرے محلے میں ہی رہتے تھے۔ کل کی حد تک ان کی سیاست تھی اور وہ NAP میں بھی بڑے اہم آدمی ہو گئے تھے۔ اس کو بھی ہم پسند کرتے تھے۔ کیونکہ اچھا قابل آدمی تھا۔ اس کو میں نے بلا بھیجا اور کہا کہ میاں محمود علی قصوری مجھے لینے کے لیے آئے ہیں۔ تم مجھے ذرا حوصلہ دینا اور میرا ساتھ دینا۔ میں انہیں انکار کروں گا۔ مجھے بات کرنے میں مدد ملے گی۔ وہ آ گئے۔ میں نے انکار کر دیا۔ یوں NAP کی پنجاب کی قیادت پیپلز پارٹی میں چلی گئی اور میں نہیں گیا۔

◆◆◆

عہد کرب

پیپلز پارٹی میں شامل نہ ہونے کی معقول وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو سامنے کی ہے کہ میرے دوستوں نے مجھے اعتماد میں نہیں لیا تھا اور دوسری وجہ یہ کہ میاں محمود علی قصوری پیپلز پارٹی میں شامل ہونے سے صرف تین دن پہلے یہ بات کر رہے تھے کہ ولی خان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور پھر چھوڑ دیا۔ میاں محمود علی قصوری بہت اعلیٰ انسان تھے اس میں شک نہیں ہے۔ جب آدمی مرجاتا ہے تو پھر جمع تفریق کر کے اس کی خوبیاں اور خامیاں دیکھی جاتی ہیں۔ جب خوبیاں پچاس فیصد سے اوپر چلی جائیں تو پھر آدمی بڑا ہی ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے قصوری صاحب کی خوبیاں پچاس فیصد سے اوپر چلی گئی ہیں' اس لیے وہ بڑے آدمی تھے اور اپنی وضع کے عظیم المرتبت انسان تھے لیکن ان کی پیپلز پارٹی میں شمولیت سے دو تین دن پہلے کی تقریر مجھے یاد آتی رہی اور ہانٹ کرتی رہی اور پھر میں نے سوچا کہ اس نے یہ کیا کیا لیکن میرے پیپلز پارٹی میں شامل نہ ہونے کی اصل اور بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے ترقی پسند اور کمیونسٹ دوستوں کا نیشنل عوامی پارٹی میں ایک سیل تھا' اس کو ہم سنٹرل کمیٹی کہتے تھے' اس میں امین مغل تھے' سیف خالد تھے' شمیم اشرف ملک تھے' اجمل خٹک فرام سرحد' میر غوث بخش بزنجو فرام بلوچستان' پروفیسر مظفر احمد فرام ایسٹ پاکستان اور باقر شاہ فرام سندھ اور پنجاب کے گروپ میں ہم تھے۔ ہم پیپلز پارٹی کے ساتھ نہیں جانا چاہتے تھے۔ ہم اپنے طور پر بڑی مضبوط پارٹی بنا چکے تھے جس کی قیادت ولی خان کر رہے تھے۔ جب مظفر احمد کو ایسٹ پاکستان میں یہ پتہ چلا کہ محمود علی قصوری اور اس کے رفقاء پیپلز پارٹی میں چلے گئے ہیں تو اس نے ولی خان کو ٹیلیفون پر پوچھا کہ ''حبیب جالب تو نہیں گئے؟'' تو انہوں نے کہا کہ وہ نہیں گیا۔ مظفر احمد نے کہا۔ ''چلیں کوئی بات نہیں' سب چلے بھی جائیں حبیب جالب تو ہے۔'' NAP میں ہماری ایک سائنٹیفک لائن تھی۔ ہم آمریت کے خلاف تھے۔ ہم آزاد اور خود مختار پالیسی چاہتے تھے۔ ہم بارڈر پر جو ملک ہیں جن میں بڑا ملک روس تھا اس سے دوستی کے خواہاں تھے' انڈیا سے دوستی چاہتے تھے۔ اپنے مسائل کو پرامن انداز میں حل کرنے کی بات کرتے تھے۔ یہ ہمارے لوگوں کی لائن تھی۔ چنانچہ ہم نیشنل عوامی پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے ممبر ہو گئے تھے اور نیشنل عوامی پارٹی میں ہی رہے۔

ایک اور آمر

بھٹو صاحب اپنی پارٹی بنا چکے تھے۔ اس سے پہلے ایوب خان پر جو زوال آیا' اس کے خلاف جو تحریکات چلیں تو اس نے استعفیٰ

دے دیا اور ایوب خان نے اس وقت کے اسپیکر عبدالجبار کو اقتدار نہیں دیا تھا وہ جاتے ہوئے بھی اقتدار فوج کو ہی دے کر گیا۔ جنرل یحییٰ خان اقتدار پر قابض ہوا۔ اگر ایوب خان اسپیکر کے حوالے اقتدار کر دیتا تو کچھ جمہوریت کا عمل شروع ہو جاتا۔ مارشل لاء کی صورت حال کا سامنا تھا۔ اس دباؤ کی بھی ہم نے مخالفت جاری رکھی۔ ہماری جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے جنرل یحییٰ خان کی بھرپور مخالفت کی تھی اور کہا۔

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے کا اتنا ہی یقیں تھا
کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تئیں تھا
آج سوئے ہیں تہہ خاک نجانے یہاں کیوں
کوئی شعلہ کوئی شبنم کوئی مہتاب جبیں تھا
اب وہ پھرتے ہیں اسی شہر میں تنہا لیے دل کو
اک زمانے میں مزاج اس کا سر عرش بریں تھا
چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے جالب نہیں بھولے
تھا وطن ذہن میں اپنے زنداں تو نہیں تھا

یحییٰ خان نے الیکشن کا اعلان کیا تو سیاسی جماعتوں کے منشور سامنے آ گئے۔ بھٹو نے اپنا منشور دے دیا۔ مجیب الرحمن نے اپنا منشور دے دیا۔ الیکشن ہو چکا تھا۔ اس کے نتائج سامنے آ چکے تھے۔ مجیب الرحمن جیت گیا تھا۔ اسمبلی کا سیشن ہو رہا تھا تو گولی کا راستہ اختیار کر لیا گیا۔ بھٹو صاحب یحییٰ خان کے بھی ساتھ تھے۔ نورالامین بھی تھے۔ بھٹو صاحب اسمبلی سے باہر فیصلے چاہتے تھے۔ چھ نکات پر معاملہ اٹکا ہوا تھا۔ اس اٹکان میں ولی خان کو بھی لندن سے بلا لیا گیا تھا کہ مجیب الرحمن سے بات کرلے۔ مجیب الرحمن نے کہا کہ "ہم تو بتیس میل پیدل چل کر قائداعظم کی تقریر سننے گئے تھے۔ تم کانگریس کے آدمی ہو۔ تم کیسے کہتے ہو کہ ہم محب وطن نہیں ہیں یا ہم پاکستان کو توڑنا چاہتے ہیں۔ یحییٰ خان ہمیں حکومت نہیں دینا چاہتا۔" مشرقی پاکستان ہماری سنٹرل کمیٹی کے لوگ گئے تھے۔ یہاں سے سردار شوکت حیات' مولانا مفتی محمود' مولانا نورانی اسمبلی کے سیشن کے لیے گئے تھے جو تین مارچ کو ہونا تھا۔ یکم مارچ کو NAP کا

اجلاس ہوا۔ جب آدھا سیشن ختم ہوا تو ایک بجے ہم شاد باغ ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ دوسرے سیشن کے لیے ہمیں تین چار بجے جانا تھا۔ وقفے کے دوران پتہ چلا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہو گیا ہے۔ اب ہمارے ہوٹل کے بیرے جو خوش تھے کہ حکومت مجیب الرحمن کو ملے گی اور پاکستان کے لوگ آئیں گے اور انہیں ٹپ ملے گی تو وہ مایوس ہو گئے۔ ان کے چہروں سے غم و غصہ دیکھ کر ہمیں خوف آنے لگا۔ ہم نے اپنے ہوٹل سے دیکھا کہ لوگ جمع ہو رہے ہیں اور قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا کے خلاف بھرپور مظاہرہ کر رہے ہیں۔ جس کے پاس جو کچھ تھا وہ لے کر سڑکوں پر نکل آیا تھا۔ بانس، سریا اور لاٹھیاں لہرا رہی تھیں۔ یہ عمل رات کے ساڑھے آٹھ بجے تک جاری رہا۔ نو بجے ہمیں گولی چلنے کی آواز آئی۔ گولیوں سے لوگ جاں بحق ہوتے رہے۔ آدھ پون گھنٹہ خاموشی اس کے بعد ایک اور جتھا آیا۔ پھر شور اور ہنگامہ ہوا۔ لوگ نعرہ زن ہوئے۔ وہ مجیب الرحمن کی حکومت چاہتے تھے۔ وہ فوج کو نہیں چاہتے تھے۔ ہم شاد باغ ہوٹل میں دو تین دن تک رکے رہے۔ ہماری واپسی کا مسئلہ تھا ہمارے ساتھ جنرل جیلانی گئے ہوئے تھے۔ وہ نیشنل عوامی پارٹی کی سنٹرل پارٹی کے ممبر تھے ان کا ایک Subordinate بنگال میں جی او سی لگا ہوا تھا اس نے انہیں کہا کہ سر میں آپ کو تو بھجوا دیتا ہوں۔ انہوں نے کہا: ''ابھی وہ جالب صاحب ہیں۔ شمیم اشرف ملک، ڈاکٹر نذیر، مفتی محمود، مولانا نورانی اور سردار شوکت حیات اور دوسرے لوگ ہیں۔ ہم انہیں کیسے چھوڑ کر جائیں۔'' پھر تین مارچ کو ہمارے لیے جہاز میں انتظام ہو سکا اور ہم واپس لاہور پہنچ گئے۔

دل دو نیم

لاہور میں بھی ہم جلوس نکالتے رہے، ہمارا وہی مطالبہ تھا کہ اسمبلی کا اجلاس بلاؤ۔ ہمارے ساتھ اصغر خان سمیت تیس چالیس افراد اور بھی تھے جو واویلا کرتے تھے۔ انہی دنوں کسان ہال میں طلبہ کا ایک جلسہ ہوا۔ کسان ہال ان دنوں بن رہا تھا۔ وہاں میں نے کہا کہ پولیس والو میرا بیان لکھو کہ اس وقت چپ رہنا بد دیانتی ہے اور جیل کے باہر رہنا بے غیرتی ہے کہ یحییٰ خان، نور الامین اور ان کے ساتھی ملک توڑ رہے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خون سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

بھٹو صاحب اور ان کی پارٹی اس نقطہ نظر کے خلاف جلسے کر رہے تھے اور اسمبلی سے باہر بات کرنا چاہتے تھے۔ ان کی تقریر کراچی کے نشتر پارک میں ہوئی کہ جو ادھر یعنی ڈھاکہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے جائے گا وہ واپسی کا ٹکٹ لے کر نہ جائے' میں ان کی ٹانگیں توڑ دوں گا یہ کر دوں گا' وہ کر دوں گا۔ ''ادھر تم ادھر ہم'' والا نعرہ بھی سننے میں آیا۔ آخر کار ہم پکڑ لیے گئے' جیل میں ڈال دیے گئے۔ کیمپ جیل لاہور میں صورت حال یہ تھی کہ ہمارے ساتھ بڑے ذہین اور تیز اور Devoted اسٹوڈنٹس بھی بند تھے۔ ہم ان کے ساتھ بیٹھ کر حالات کا تجزیہ کیا کرتے تھے کہ باہر کیا ہو رہا ہے' کیا ہونے والا ہے۔ جیل میں دوسرے قیدی ہمیں زہر آلود نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اسی لیے ہم باہر کم نکلتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار دو قیدی مجیب الرحمن کے خلاف باتیں کر رہے تھے اور اپنی حکومت اور فوج کے حق میں بول رہے تھے کہ وہ حصہ ہمارا ہے اور وہ پاکستان ہے۔ یہ سب غدار ہیں۔ ایک بار آل انڈیا ریڈیو سے ذکر ہوا کہ حبیب جالب کو بھی قید کر دیا گیا ہے تو وہ بھی انہوں نے سنا۔ میں قریب سے گزرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ آواز ریڈیو کی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو سے خبریں نشر ہو رہی تھیں۔

۱۹۷۱ء میں وہ کنارا تو جیل ہی رہا تھا' ادھر تو فوج لڑ رہی تھی' کہ ادھر مغربی پاکستان کے بارڈر پر بھی جنگ شروع ہو گئی۔ میاں محمود علی قصوری ہمارے وکیل تھے' وہ بنگلہ دیش کے خلاف تھے' بھٹو صاحب اور اپنی پارٹی کی وجہ سے۔ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے شیخ رفیق وغیرہ کلکتہ کی طرف پہنچ رہے تھے۔ وہ تجزیہ کر رہے تھے کہ امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ اس طرح سے آئے گا اور اس طرح سے چین آ جائے گا اس طرح سے انڈیا کی پسپائی ہو جائے گی اور ہم کلکتہ پہنچ جائیں گے۔ ہم اسے محض خواب و خیال ہی سمجھتے تھے۔ ہم بھی جیل میں طلباء کے ساتھ مل کر حالات کا جائزہ لیتے تھے۔ رات میں مکمل بلیک آؤٹ رہتا تھا۔ میں آدھی رات کے وقت طلباء کو جگاتا کہ اٹھو اور حالات کا تجزیہ کرو۔ سوچو' کیا ہو رہا ہے؟ ہم کہاں پہنچے ہیں؟ پھر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے کہ وہ بڑھ رہے ہیں' یعنی انڈیا والے اور پاکستان کی پسپائی ہو رہی ہے۔

میں جیل میں بند تھا' ایسے میں ہمارے والد میاں محمود علی قصوری کے پاس گئے۔ والد صاحب کو یہی پتہ تھا کہ وہ ہمارے محسن ہیں' ہمارے محافظ' قانون کے بادشاہ ہیں۔ قصوری صاحب نے والد صاحب سے کہا کہ میں اب جالب کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ وہ تو غدار ہے اور بنگلہ دیشی ہے۔ میں بھی اسے نہیں چھڑا سکتا۔ اب تو خدا ہی اسے چھڑائے گا۔ ''یہ سب کچھ سن کر میرے والد میرے پاس جیل پہنچے اور بولے کہ ''یحییٰ خان مجاہد اسلام ہے۔ یہ کاغذ ہے اس پر ایک نظم یحییٰ خان کے حق میں لکھو اور باہر آ جاؤ۔'' میں نے والد صاحب سے کہا کہ ابا یہ تو معافی نامہ ہے اور لوگ کہیں گے کہ حبیب جالب کا باپ بزدل ہے۔ یہ بزدلی کی بات ہے۔'' ابا میرا جواب سن کے

بولے۔ ”تم بڑے بیہودہ ہو اور میاں قصوری صاحب نے بھی تمہارے لیے مدد کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس جیسے انصاف پسند اور پکے مسلمان ’عظیم المرتبت وکیل نے جو تمہارا محسن ہے‘ کہہ دیا ہے کہ اب اسے کوئی نہیں چھڑا سکتا‘ میں بھی اسے نہیں چھڑا سکتا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ وہ نہ چھوٹے‘ وہ جیل ہی میں رہے۔“ پھر میرے والد بولے۔ ”اب تو باہر نہیں آئے گا۔ یہیں سڑے مرے گا اور تو یہیں سڑ مر۔“ مجھے خوب برا بھلا کہہ کے وہ جا رہے تھے تو میں نے ان سے کہا کہ ابا میں پندرہ روز میں آ رہا ہوں۔ بس پندرہ روز سے زیادہ نہیں لگیں گے۔

پندرہ بیس دن میں ہی ڈھاکہ سرنڈر ہو گیا اور یہاں باقیماندہ پاکستان کی سب سے بڑی پارٹی پیپلز پارٹی کو اقتدار مل گیا۔ بھٹو صاحب چونکہ فوج کے ساتھ تھے اور پھر ظاہر ہے ان کی پارٹی بھی بڑی تھی۔ ہم بھی رہا کر دیے گئے۔

رہائی پر میرے بیوی بچے باہر کھڑے تھے۔ کشور ناہید بھی مجھے لینے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ میں نے رہا ہونے سے انکار کرتے ہوئے جیلر سے کہا کہ پہلے میرے تمام ساتھیوں کو بھی چھوڑو۔ ایک فاروق ملک ہے‘ ایک مسیح ہے جو پیپلز پارٹی کا آفس سیکرٹری تھا‘ وغیرہ۔ ان سب کو جب تک باہر نہیں نکالو گے میں باہر نہیں آؤں گا۔ اس بارے میں خوب جھگڑا رہا۔ میری بیوی مجھے کہہ رہی تھی کہ ”تجھے تو اندر رہنے کا شوق ہے۔“ اس کو کشور ناہید نے بھڑکا دیا تھا کہ جالب خود باہر نہیں آتا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ میں ایک آدھ گھنٹے بعد آ جاؤں گا۔ جب تک اپنے ساتھیوں کے بارے میں احتجاج نہیں کروں گا یہ لوگ انہیں جلدی نہیں چھوڑیں گے اور یوں میرے ساتھی بیس پچیس دن یہیں جیل میں سڑتے رہیں گے۔ جیلر نے مجھ سے کہا کہ ہمیں آرڈر ہے کہ آپ کو باہر چھوڑ دیں۔ اب اگر آپ یہاں رہنا چاہتے ہیں تو میرے دفتر میں رہ سکتے ہیں‘ اندر تو میں آپ کو نہیں رکھ سکتا۔ خیر میں نے حکومت سے وعدہ لیا اور میرا احتجاجی عمل کارآمد ثابت ہوا اور میرے ساتھی بھی ایک دن بھی چھوڑ دیے گئے۔ میری رہائی پر میرے ابا مجھے عجیب و غریب نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ یہ عجب چیز ہے جو اس مرحلے سے بھی نکل آیا۔

ہمیں کوئی غیب کا علم تو نہیں ہوتا۔ بس سائنٹیفک اپروچ کے مطابق حالات کے تجزیات ہوتے ہیں۔ عوامی لیگ کا حق بنتا تھا کہ ملک کی حکومت انہیں دی جاتی۔ یہاں میں ولی خان کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے بھٹو صاحب کی طرح جھگڑا نہیں ڈالا۔ دو صوبوں یعنی سرحد اور بلوچستان میں NAP کی اکثریت تھی اور وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ دونوں صوبوں کی چابی میرے پاس ہے مگر نیشنل عوامی پارٹی نے ۱۹۷۳ء کا آئین بنانے میں بڑی مدد کی۔ کیونکہ NAP کے لوگ اگر اس آئین پر دستخط نہ کرتے تو آئین نہیں بن سکتا تھا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت میں ہمارا رول وہی اپوزیشن والا ہی رہا۔ نیشنل عوامی پارٹی چونکہ اپنے مزاج اور خیالات کی وجہ

سے امریکہ اور روس کے ایجنٹوں کو پسند نہیں تھی۔ دو صوبوں یعنی بلوچستان اور سرحد میں NAP کی حکومت بن گئی تھی لیکن شہنشاہ ایران جو کہ امریکہ کا ایس ایچ او تھا اسے بلوچستان میں NAP کی حکومت پسند نہیں تھی کیونکہ اس طرح ایرانی بلوچستان پر بھی جمہوریت کی روشنی پڑتی تھی اور وہاں بھی اس کی آواز جاتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک ساتھ پورے ملک میں یہ عمل شروع ہو گیا کہ چاروں صوبوں میں پیپلز پارٹی ہی کی حکومت ہو۔ یوں ہم ایک مرتبہ پھر انتہائی عتاب کی زد میں آ گئے۔ اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے اپنے خیالات اور نظریات کی وجہ سے۔

ایک خواب

مولانا عبدالستار خان نیازی کو ''کالا باغ'' (گورنر امیر محمد خان) نے غنڈوں سے پٹوایا تھا تو میں نے یہ بند اس کے بارے کہا تھا کہ

عام ہوئی غنڈہ گردی
چپ ہیں سپاہی باوردی
شمع نوائے اہل سخن
کالے باغ نے گل کر دی
اہل قفس کی قید بڑھا کر
کم کر لی اپنی میعاد
صدر ایوب زندہ باد

میرے ابا مجھ سے کہا کرتے تھے کہ ''تم کن بدمعاشوں کے ساتھ پھرا کرتے ہو۔ رات کو دیر سے گھر آتے ہو۔'' تو ایک دن میں مولانا عبدالستار خان نیازی کو اپنے گھر لے گیا۔ میں نے کہا۔ ''ابا یہ ہے وہ بدمعاش جس کے ساتھ پھرتا ہوں۔'' میرے ابا مولانا نیازی کو دیکھ کر کہنے لگے۔ ''لاحول ولا قوۃ...... یہ تو پاکیزہ آدمی ہے۔ اتنے بڑے مولانا ہیں اور تم یہ کیا بکواس کرتے ہو۔'' مولانا عبدالستار نیازی نے میرے ابا سے کہا کہ ''یہ لڑکا اچھا ہے' ہمارا دوست ہے' آپ فکر نہ کیا کریں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ہمارے گھر میں ہماری عزت بحال کرائی۔ پھر جب ہم حیدر آباد جیل سے رہا ہو کر آئے تو انہوں نے جمعیت العلمائے پاکستان کی جانب سے اپنے مرکزی دفتر میں ایک استقبالیہ دیا اور وہاں انہوں نے تمام احباب کو یہ واقعہ سنایا کہ ''میں عالمِ خواب میں تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کی زیارت ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جالب کہاں ہے' کیا حال ہے اس کا۔'' عبدالقادر حسن نے یہ واقعہ ''افریشیا'' میں لکھا بھی تھا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ کتنی بڑی خوش نصیبی ہے کہ وہ بڑے بڑے پابند صوم وصلوٰۃ زاہدوں اور پرہیزگاروں کا نہیں پوچھتے اور ایک گنہگار کو پوچھ لیتے ہیں۔ یہ جو ایک گیٹ اپ بنایا ہوتا ہے کچھ لوگوں نے کہ میں بڑا عالم ہوں' میں بڑا مولوی ہوں' میں بڑا خدا کے قریب ہوں' اس پر اتنا ناز اں نہیں ہونا چاہیے۔ پتہ نہیں کس کی کون سی ادا وہاں پسند آجائے۔ مولانا عبدالستار خان نیازی سے ہماری دوستی اب تک ہے۔ پھر یہ حکمران ہو گئے' وزیر ہو گئے۔ بہر کیف وہ ہمارے دوست ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کچھ لوگ وزارتوں سے بڑے ہوتے ہیں۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تیری رضا ہے تو کر

◆◆◆

حرفِ سردار

پیپلز پارٹی کی حکومت کی طرف سے بلوچستان میں جمہوریت کے خلاف عمل شروع ہو چکا تھا اور ہماری جدوجہد جمہوریت کی بقا کے لیے وہی تھا۔ یوں ہم ایک بار پھر عذاب میں مبتلا کر دیے گئے۔ اس سلسلے میں متحدہ محاذ میں بھی جانا پڑا۔ قومی اسمبلی میں قائدِ حزبِ اختلاف ولی خان تھے۔ جماعت اسلامی کا ایک ہی نعرہ تھا کہ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' خیر حالات پر غور کرنے کے لیے NAP کے لوگوں کو چاروں صوبوں سے بلوایا گیا اور کوئٹہ میں NAP کی سنٹرل کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ جس میں مسئلہ پیش کیا گیا کہ بھئی دیکھیے ایک طرف بھٹو کا یہ عذاب ہے۔ عتاب ہے اور وہ مارتا مارتا ہم کو دیوار تک لے آیا ہے۔ دوسری طرف جماعت اسلامی کا ایک ہی نعرہ ہے کہ ''پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ'' اب آپ لوگ غور کریں کہ ہم کدھر جائیں۔ لہٰذا چاروں صوبوں کے لوگوں نے کہا کہ متحدہ محاذ بنایا جائے۔

پاکستان کا مطلب کیا.......

متحدہ محاذ بن گیا اور ہم بھی اس کے تابع ہو گئے۔ ادھر جماعت اسلامی میں یہ نعرہ لگتا رہا۔ ''پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ'' مجھے یاد آ رہا ہے کہ سہروردی صاحب کے سیکرٹری آفتاب تھے۔ ان کی بیگم بھی ایک بار جلوس میں تھیں۔ بڑی نازک اور خوبصورت سی۔ ہم بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ جب انہوں نے سنا کہ ایک ہی نعرہ لگائے چلا جا رہا ہے کہ ''پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ'' تو وہ بولیں کہ ''پاکستان کا مطلب کیا...... کے بعد اور بھی بہت سی باتیں ہیں' مسائل ہیں' جنہیں نعرہ بننا چاہیے۔ مثلاً کوئی آدمی جواب میں کہے یہاں بھوک ہے' تنگی ہے' افلاس ہے' جمہوریت نہیں ہے' بے گھری ہے' تعلیم اور علاج معالجہ وغیرہ کے مسائل ہیں۔ مگر یہاں ایک ہی نعرہ مسلسل لگ رہا ہے۔'' اس پر میں نے کہا۔ ''بی بی! میں ایک نظم بناؤں گا جو باتیں آپ کہہ رہی ہیں' وہ میں اس نظم میں کہوں گا۔ اس طرح میں نے یہ نظم کہی۔

پاکستان	کا	مطلب	کیا؟
روٹی	کپڑا	اور	دوا

گھر رہنے کو چھوٹا سا
مفت مجھے تعلیم دلا
میں بھی مسلماں ہوں واللہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

امریکہ سے مانگ نہ بھیک
مت کر لوگوں کی تضحیک
روک نہ جمہوری تحریک
چھوڑ نہ آزادی کی راہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

کھیت وڈیروں سے لے لو
ملیں لٹیروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو
رہے نہ کوئی عالی جاہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ
سرحد سندھ بلوچستان
تینوں ہیں پنجاب کی جان

اور بنگال ہے سب کی آن
آئے نہ ان کے لب پہ آہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

بات یہی ہے بنیادی
لوگوں کو ہو آزادی
آمر کی ہو بربادی
حق کہتے ہیں حق آگاہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

میرا یہ لہجہ جماعت اسلامی والوں کو بہت کھٹکا کہ اوپر کیا کہتا ہے اور بعد میں کیا باتیں کرتا ہے اور انہوں نے اعتراض کیا کہ ایسی نظم کو جلسوں جلوسوں میں نہیں پڑھنا چاہیے۔ ہم چونکہ پابند تھے۔ اس طرح یہ متحدہ محاذ چلتا رہا۔

حیدرآباد سازش کیس

اسی دوران ہماری جماعت نیشنل عوامی پارٹی کی سنٹرل کمیٹی نے ایک ریزولیشن پاس کیا۔ جس میں بلوچستان کی صوبائی اور آئینی حکومت کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا گیا تھا۔ یہ ریزولیشن بھی خوب زیر بحث آیا اور اس ریزولیشن کو بھی غداری قرار دیا گیا۔ پھر اس وقت چار قومیتوں کا ذکر کرنا بھی انتہائی مشکل تھا لیکن ولی خان "چار الگ الگ رنگ کے پھول ایک گلدستہ" کچھ اس طرح بات بنایا کرتے تھے۔ اسی دوران ہمارے کمیونسٹ دوست جام ساقی نے ایک پمفلٹ چھاپ دیا۔ جس میں چار قومیتوں کا ذکر تھا کہ یہ چار قومیتیں جنہیں ہم مانتے ہیں۔ سپریم کورٹ میں تو پہلے سے ہی موجود تھا کہ یہ پارٹی محب وطن نہیں ہے غدار ہے۔

بلوچستان گورنمنٹ کے حق میں NAP کی سنٹرل کمیٹی ریزولیشن پاس کر چکی تھی۔ جس کے متعلق اہل اقتدار کہتے تھے کہ یہ آئین پاکستان کے خلاف ہے ملک کی سالمیت کے خلاف ہے۔ ولی خان پر لوگوں کو بغاوت پر اکسانے کا چارج تھا۔ اوپر سے جام

ساتی کا چار قومیتوں والا پمفلٹ بھی آ گیا۔ مجھے یاد ہے کہ راولپنڈی میں میٹنگ تھی۔ اب ولی خان نے کہا کہ یہ پمفلٹ ججوں کے پاس پہنچ گیا ہے۔ اب میں کیا دفاع کروں گا۔ اب میں ایک تقریر ہی کر آیا ہوں۔ ولی خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "عدلیہ کا ستون بھی گیا اور جمہوریت کا ستون بھی گیا۔ یہ آخری ستون تھا' یہ بھی لرزہ براندام تھا' یہ بھی گر گیا اور یہاں انصاف اور وکیل کرنے کا حق نہیں۔" وہ تقریر کر کے آ گئے اور پارٹی بین ہو گئی۔

بلوچستان گورنمنٹ کے حق میں پاس کردہ ریزولیوشن کو بنیاد بنا کر پولیس والے' ایف آئی اے والے' پنجاب سے کرنل لطیف' قسور گردیزی اور مجھے پکڑنے آ گئے۔ جس دن میری گرفتاری ہوئی اس دن میرے بارہ سالہ بیٹے طاہر عباس مرحوم کا سوئم تھا۔ میرا گھر پہلی منزل پر تھا۔ نیچے سے پولیس والے آواز دے رہے تھے۔ اوپر سے میرے چھوٹے بھائی سعید پرویز نے جھانکا۔ سادہ لباس میں چند افراد کھڑے تھے۔ وہ سمجھا کوئی افسوس کرنے آئے ہیں۔ میں نیچے اترا تو ڈی ایس پی چودھری بشیر احمد اور اسلم خان وغیرہ موجود تھے۔ میں نے کہا "آپ افسوس کرنے آئے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "افسوس بھی ہے مگر ہم آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔" میں نے کہا کہ ٹھیک ہے چلتے ہیں مگر مجھے ابھی ناشتہ کرنا ہے اور پھر چلتے ہیں۔ میں پہلے سے ہی اس گرفتاری کا منتظر تھا۔ میں نے پولیس کے افسران سے کہا کہ ایک گھنٹہ لگے گا۔ آپ انتظار کریں یا اوپر آ جائیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں گرفتاری کا حکم ہے۔ میں نے کہا کہ پھر آپ مجھے اٹھا کر گاڑی میں پھینکیں اور چلیں۔ اس پر اسلم خان نے کہا کہ "چلیں آپ آدھے گھنٹے میں تیار ہو جائیں۔" خیر میں فارغ ہو کر ان کے ساتھ چل دیا۔

دور تک پولیس ہی پولیس تھی۔ گرفتاری تو متوقع تھی مگر میں راستے میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیس کیا بنایا ہوگا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک دہشت کی فضا طاری تھی۔ آگے پیچھے پولیس ہی پولیس۔ ذہن میں ریزولیوشن آیا ہی نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کوئی گھٹیا قسم کا کیس نہ بنا دیا ہو۔ کوئی ایسا کیس نہ ہو جو میری شان کے خلاف نکلے۔ ریگل سینما کے پیچھے ایف آئی اے کا دفتر تھا۔ پولیس والوں نے مجھے لے جا کے وہاں ایک بے آباد کمرے میں پہنچا دیا۔ ساتھ پولیس والے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اب وہ کہنے لگے "کوئی شعر سنائیں۔" مجھے ان کا مطالب ایسا لگا جیسے یہ بھی ٹارچر کا ایک انداز ہو۔ میں نے کہا کہ بھئی ایک وقت ہوتا ہے شعر کا۔ میرا بارہ سال کا لڑکا مر گیا ہے۔ اس کا آج سوئم تھا اور آپ مجھے یہاں پکڑ لائے ہیں۔ اس پر پولیس والے کہنے لگے۔ آپ تو بہت بہادر ہیں۔ میں نے کہا' ٹھیک ہے مگر طبیعت حاضر نہیں ہے بیٹا۔ میں اس وقت شعر سنانے کے قابل نہیں ہوں۔ میں بڑے ادب سے بڑی تہذیب سے بات کر رہا ہوں۔ وہ پر ہنسنے لگے۔ ڈی ایس پی مجھے وہاں بٹھا کر چلے گئے۔ اب انہیں ڈی آئی جی کا انتظار تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈی

آئی جی آیا۔ انہوں نے بلایا۔ وہاں اسلم خان اور چودھری بشیر بھی تھے۔ ڈی آئی جی کہنے لگا۔ آپ کا نام؟ میں نے کہا۔ آپ میرا نام نہیں جانتے؟ کہنے لگے' جانتے ہیں مگر یہ Procedure کا حصہ ہے۔ میں نے کہا' نام وام بعد میں بتاؤں گا پہلے مجھے آپ ناشتہ کروائیں۔ کیونکہ یہ مجھے لے آئے ہیں اور میں نے ناشتہ نہیں کیا۔ میں شوگر کا مریض ہوں اور میں آپ سے بات نہیں کر سکتا۔ انہوں نے پوچھا' کیا کھائیں گے؟ میں نے کہا' انڈے سے لے آؤ۔ کچھ دیر بعد ناشتہ آ گیا۔ میں نے شوگر کی گولی کھائی اور ناشتہ کیا۔ اب فرمائیں۔ چودھری بشیر کہنے لگا۔ ''بھئی فرمانا کیا اور کیا کہنا' آپ کے ساتھیوں نے ہمارے ساتھ معاملہ کر لیا ہے۔ وہ باہر پھر رہے ہیں۔ آپ ہمارے قابو نہیں آئے۔ آپ کو جب لینے گئے' ڈھونڈنے نکلے' آپ نہیں ملے۔ اب آپ چار سطریں لکھ دیں کہ ولی خان غدار ہے۔ میں اس کے ساتھ نہیں ہوں۔ اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو جیل میں سڑیں گے اور آپ کو پھانسی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کو یہ بھی ہو سکتا ہے' وہ بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا کہ جب میں یہ لکھوں گا تو اس ایک لفظ کے ساتھ ہی میری موت واقع ہو جائے گی اور اگر نہیں لکھوں گا تو شاید جیل میں چھ سات سال زندہ رہ جاؤں اور شاید امر ہو جاؤں۔ یہ کام جو آپ چاہتے ہیں یہ کام میں نہیں کر سکتا اور نہ ہی کروں گا۔ اس پر ڈی آئی جی نے کہا۔

He is Cronick .... اسے لے جاؤ۔

Cronick کا لفظ اس نے استعمال کیا۔ باہر نکلا تو میں نے چودھری بشیر سے کہا' اب میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟ چودھری بشیر نے مجھے کئی بار پہلے بھی پکڑا تھا۔ وہ کہنے لگا' تم یار میرے ہی قابو آ جاتے ہو۔ میں نے کہا' ٹھیک ہے چودھری' چلو کوئی بات نہیں۔ اب بتاؤ مقدمہ کیا بنایا ہے؟ تو اس نے کہا' یار وہی ریزولیشن والا قصہ ہے جو تم لوگوں نے پنڈی میں پاس کیا ہے۔ اب میں نے آپ کو حیدر آباد ٹریبونل میں لے جانا ہے۔ پھر وہ مجھے اسسٹنٹ کمشنر کے پاس لے گئے' عبدالحکیم کے پاس۔ عبدالحکیم میرے دوست تھے' اچھے آدمی تھے۔ کافی ہاؤس میں ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ بھائی جالب کو اندر بلاؤ۔ میں اندر گیا۔ وہ بولے ''مجھے بڑا افسوس ہے کہ مجھے تمہاری گرفتاری پر دستخط کرنا پڑ رہے ہیں۔'' میں نے کہا' کوئی اور دستخط کرتا' تم کر لو۔ انہوں نے دستخط کیے۔ ایک سگریٹ کا پیکٹ دیا کہ یہ پیتے ہوئے چلے جاؤ۔

اسی طرح مجھے یاد آ رہا ہے جب ہم پشاور میں قیوم خان کے خلاف الیکشن لڑ رہے تھے تو کے ایم چودھری کے بندے مجھے لینے آ گئے۔ تب لالہ ایوب جو گرین ہوٹل کا مالک تھا اور ہماری پارٹی کا ساتھی بولا کہ یہ تمہارا دوست ہے؟ میں نے کہا کہ پولیس والا میرا دوست کہاں! اس کے ہاں پہنچے اور پھر میں چودھری کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے کہا کہ تمہارا نام اتنا لمبا چوڑا بتاتے تھے۔

صرف محمود چودھری بتاتے تو میں فوراً جان لیتا۔ وہ کہنے لگا کہ تیرے منہ سے شعلے نکل رہے ہیں تو میں نے سوچا کہ میرا دوست یہاں تقریریں تو بہت کر چکا میں تمہیں کھانا تو کھلا دوں۔ میں نے کہا' ٹھیک ہے کھانا تو رات کو چلے گا۔ رات کو ملٹری انٹیلی جنس اور پتہ نہیں کون کون تھے وہاں۔ بحث شروع ہوگئی۔ بحث میں میں نے دھاندلی کا ذکر کیا۔ بھئی تم نے تو قیوم خان کا ساتھ دیا۔ پھر تمہارا Candidate تو ہار ہی نہیں سکتا۔ وہ کہنے لگا۔ یار بات سنو' سیاست کی بات نہ کرو۔ شعر و شاعری ہو جائے۔ میں نے کہا' میری تو شاعری میں بھی سیاست ہے۔ یوں بات ختم ہوئی۔ پھر میں نے سنایا دنایا۔ ایک دفعہ آزاد کشمیر میں کے ایم چودھری آئی جی تھے وہ مجھے پنڈی سے لے کر مظفر آباد گئے۔ میں کچھ خوفزدہ سا وہاں پہنچا۔ کچھ اسٹوڈنٹس بھی میرے ساتھ تھے۔ میں اسٹوڈنٹس میں بھی بڑا پاپولر تھا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ صدارت آئی جی کر رہا تھا۔ مشاعرے کے منتظمین بھی بڑے پریشان تھے۔ میں نے کہا کہ جناب پاکستان میں میری نظمیں بین ہیں آزاد کشمیر میں بھی آزاد ہوں اور میری شاعری بھی۔ میں نے وہاں جو سنانا تھا سنا دیا سب کچھ اور صدر مشاعرہ میرے ساتھ ساتھ مصرع بھی اٹھا رہا تھا۔

کے ایم چودھری نے حیدر آباد جیل میں میری مخالفت نہیں کی کہ یہ انکم ٹیکس کتنا دیتا ہے' اس کے اثاثے کیا ہیں۔ اس وقت ارباب سکندر نے اٹھ کر کہا کہ حبیب جالب کو بی کلاس دی جائے۔ ارباب سکندر ایڈووکیٹ بھی تھا۔ میری والدہ اس وقت زندہ تھیں۔ وہ ایف آئی اے کے دفتر میں مجھے ملنے آئیں۔ وہ بھٹو کو برا بھلا کہنے لگیں۔ اماں چھوڑو۔ رہنے دو۔ بس کرو۔ میں نے اپنی والدہ کو سمجھاتے ہوئے کہا' مجھے حیدر آباد لے جانا تھا۔ چودھری بشیر بولا کہ بھئی جالب ہم تمہیں ریل گاڑی میں نہیں ہوائی جہاز میں حیدر آباد لے جائیں گے۔ اب بھیجا تو انہوں نے ہوائی جہاز میں ہی تھا کیونکہ دوسرے دن پیشی جو تھی۔ ایک انسپکٹر میرے ساتھ کر دیا گیا وہ مجھے پچھلے راستے سے لے گیا تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ ہوائی جہاز میں وہ انسپکٹر میرے ساتھ بیٹھا راستے میں مجھ سے باتیں کرنے لگا کہ دیکھو' جو میرے ساتھ ٹھیک رہتا ہے میں اس کے ساتھ ٹھیک رہتا ہوں۔ جو میرے ساتھ ذرا سی ایسی ویسی بات کرتا ہے تو میں بھی ایسا ویسا ہو جاتا ہوں۔ میں نے ہنستے ہوئے اسے کہا کہ بھئی تم کیا باتیں کر رہے ہو۔ یہاں ہوائی جہاز میں تمہیں مجھ سے کیا خطرہ ہے۔ کیا میں چھلانگ لگا کر بھاگ نکلوں گا۔

کراچی ایئر پورٹ پر جہاز کے عین سامنے سیڑھی کے قریب ہی پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔ مجھے اس میں بٹھایا گیا۔ ایئر پورٹ سے سائرن والی گاڑی کے پیچھے میری جیپ تھی جس کے پیچھے بھی پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ یوں مجھے حیدر آباد لایا گیا۔ راستے بھر مجھے عجیب احساس ہوتا رہا۔ حیدر آباد میں مجھے پولیس ایک تھانے میں لے آئی۔ وہیں رات رکھا۔ تھانے کے دوسرے کمرے میں غلام

احمد بلور تھا۔ پھر ہم سب اکٹھے ہوتے گئے۔ ولی خان' قسور گردیزی اور دوسرے لوگ۔ یوں ہم سب ایک کارواں کی صورت حیدرآباد جیل لائے گئے۔ حیدرآباد جیل میں جہاں پنڈی سازش کیس کے لیے فیض احمد فیض اور جنرل اکبر والا ٹربیونل بنایا گیا تھا وہیں ہمارا ٹرائل تھا۔ ہمارے لیے بیرک نئی بنائی گئی تھی وہیں محمود مسعود کا دفتر تھا۔ چاروں گوشوں پر ایف ایس ایف کے گن مین ہر دم تیار چاک وچوبند کھڑے رہتے۔ دائیں طرف پھانسی گھاٹ تھا۔

اس سے پہلے جو بات میں نے کہی تھی کہ چودھری بشیر نے کہا تھا کہ آپ کے ساتھیوں سے معاملہ ہو گیا تھا تو ہمارے پنجاب کے سیکرٹری تھے۔ سیف خالد مرحوم' ان کے بھتیجے کی شادی تھی۔ وہاں میری ان کے ساتھ بات چیت ہوئی کہ غلام نبی میمن اٹارنی جنرل نے میرا نام نکلوا دیا ہے۔ میں نے کہا کہ تمہارا نام نکل گیا ہے پھر میں تو شاعر واعر ہوں میرا نام تو بالکل نکل گیا ہوگا۔ دراصل ان لوگوں کے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ ان کو ''لائن'' آ جاتی تھی۔ جب کوئی مشکل وقت آ جاتا تھا۔ میں تو پنجاب NAP کا صدر نہیں تھا۔ قسور گردیزی صدر تھے۔ وہ اندر تھے مگر سیکرٹری پنجاب سیف خالد باہر رہے۔ جب ہم اندر چلے گئے تو ان کے پیپلز پارٹی کے حق میں بیانات آنے شروع ہو گئے۔ تو اذہب وغیرہ یہ لوگ ہمیں ملنے تک نہیں آئے۔

ایک مبتذل نظم

حیدرآباد جیل سے کبھی کبھی مجھے ہسپتال لے جانا ہوتا تھا تو راستے میں ایک دفعہ ایس پی پولیس نے مجھ سے کہا کہ مجھے آپ کا کلام بہت پسند ہے۔ خاص طور پر وہ ''قائد عوام'' والی نظم۔ مجھے غصہ بھی آیا اور میں نے کہا کہ آپ نے میرے کلام کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ آپ نے وہ نظم منتخب کی ہے جو میری ہے ہی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بنظر غائر میرے کلام کو پڑھا ہی نہیں ہے۔ وہ نظم جو آپ میری بتا رہے ہیں' میں اس کی بار بار تردید کر چکا ہوں۔ یہ بات آپ کے خوف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں کبھی نظم کہہ کر اس کو Disown نہیں کرتا ہوں۔ جو میری نظم ہوتی ہے میں اسے بر سر عدالت بھی مانتا ہوں۔ وہاں بھی اپنے نام سے سنانے کو تیار ہوں۔ میں اپنی کسی نظم سے انکاری نہیں ہوا لیکن جو نظم آپ میری بتا رہے ہیں اس میں تو اوزان کی غلطیاں ہیں اور یہ تہذیب سے گری ہوئی نظم ہے۔ یہ نظم اگر غالب کی بھی ہوتی تو میں اسے اپنے نام کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتا تھا۔ یہ میری نہیں ہے۔ شاعر کی اپنی ایک شاعرانہ انا ہوتی ہے وہ کبھی کسی دوسرے کی چیز کو اپنی نہیں کہے گا۔

بیگم نصرت بھٹو نے مجھے میاں محمود علی قصوری کے گھر پر بھائی کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ''جالب بھائی! بھٹو صاحب اب کبھی جیل سے باہر نہیں آئیں گے؟'' میں نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہم جیل کی سلاخیں توڑ دیں گے اور بھٹو صاحب کو باہر لے آئیں

گے۔ جب ایک خاتون بھائی کہتی ہو اس کی بیٹی کے خلاف اور اس کے شوہر کے خلاف ایسی گھٹیا گفتگو کسی شاعر کو زیب نہیں دیتی۔ میں نے اس نظم کی تردید ملک محمد حسین چیف رپورٹر ''نوائے وقت'' کے ذریعے کرادی تھی اور شمیم انور خان جو ڈپٹی سپیکر تھے ان کو بھی میں نے کہا تھا کہ بھٹو صاحب سے کہنا کہ میں ان کے بارے میں ایسی نظم نہیں لکھ سکتا کیونکہ ماضی میں تعلقات رہے تھے۔ سیاسی اختلافات اپنی جگہ مگر میں ایسی گھٹیا حرکت نہیں کرسکتا۔ یہ میرے شاعرانہ مقام و مرتبہ کے منافی ہے۔

جیل میں باتیں

حیدرآباد جیل میں سیاسی حالات پر بہت بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ وہاں سب ہی اپنے خیالات کا اظہار اپنے اپنے انداز میں کیا کرتے تھے۔ خیر بخش مری اور بزنجو کا اپنا نظریہ حیات تھا اور جو کچھ انقلابی تھے ان کا اپنا ایک نظریہ خیال تھا۔ افراسیاب خٹک کے اپنے خیالات تھے۔ وہاں رسول بخش پلیجو ہمارے ''وکیلوں'' کی صف میں تھے۔ ان کا اپنا موقف تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ شاونزم کو Sharp کرنے سے سوشلزم پیدا ہوگا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جاگیردار بھی رہیں اور ہاری بھی رہیں اور جو غیر سندھی ہیں ان کا اخراج ہو جائے وہ شاونسٹک سوچ کو ہی تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سوشلزم شاونزم کو شارپ کرنے سے آئے گا۔ میں نے میر غوث بخش بزنجو صاحب سے ان کے خیالات کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا تھا کہ ''یہ غلط کہتا ہے۔ ہم تو پاکستان کی تمام ورکنگ کلاس کو ملا کر پاکستان میں اس کی حاکمیت چاہتے ہیں۔'' یہ خیالات ہماری نیشنل عوامی پارٹی میں نہیں ہیں۔ خیر بخش مری صاحب سے میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ آپ کا یہ جو کہنا ہے کہ پنجاب کا عام شہری اور مزدور کسان بھی پنجابی سامراج کا حصہ ہے یعنی لوٹ کھسوٹ میں اس کا بھی حصہ ہے تو پھر ہمارا کیا موقف ہونا چاہیے۔ مثلاً ہم گوجرانوالہ میں تقریر کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ تم سامراج کا حصہ ہو اور تم سب سامراجی ہو پاکستان کے دوسرے تمام صوبوں کو لوٹ رہے ہو تو اس بات کی پذیرائی کون کرے گا۔ کوئی ایسا انداز بنائیں کہ جس سے لوگ ہم سے متنفر نہ ہو جائیں کیونکہ وہاں کے لوگ اور اخبارات اپنے آپ کو محب وطن کہتے ہیں۔ ان کے اندر حب وطن کی لہر Rule کر گئی ہے۔ ایک بار میں نے عطاء اللہ مینگل سے بھی کہا تھا کہ مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ مینگل کا اپنا ایک اسٹائل تھا۔ وہ یہاں لاہور میں آئے تو ڈسٹرکٹ بار میں انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ہم بلوچستان کا نام پاکستان رکھ دینا چاہتے ہیں اور یہ غلط ہے کہ ہم الگ ہونا چاہتے ہیں اور اس طرح محبت بھی نہ کریں پاکستان سے۔ جیسے ایک سکھ نے اپنے بچے کو اتنا پیار کیا کہ پیار کرتے کرتے اسے مار ہی دیا تھا۔ آپ کو دوسروں کی معروضات سننی چاہئیں۔ ہمارے احساس محرومی کو ختم کریں۔ ہمیں اپنا بھائی سمجھیں۔ ہمیں برابر کا حق دیں۔''

جیل میں مختلف باتیں مختلف انداز میں ہوتی تھیں۔ بہر حال ایک دو آدمیوں کو چھوڑ کر اکثریت کے اندر Bitterness پیدا نہیں ہوئی تھی جو کہ بعد میں پیدا ہوگئی تھی کیونکہ حکمران اور بیوروکریسی کی اکثریت پنجاب سے ہی تھی۔ ضیاء الحق وغیرہ فوج کی وجہ سے پنجاب کے Symbol بن گئے تھے۔ لہٰذا جن میں احساس محرومی پیدا ہوا ان کو پاکستان کی یکجہتی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان اسلام آباد ہی ہے اور اسلام آباد کی ہی اصل حاکمیت ہے بلوچستان یا کوئی دوسرا صوبہ اس میں شامل نہیں ہے۔ کسی حد تک ان کی یہ بات درست بھی تھی کیونکہ جب مارشل لاء ہو اور مارشل لاء میں جب اکثریت پنجاب کے لوگوں کی ہو تو شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ سندھ کے اندر پولیس میں زیادہ تعداد پنجابیوں کی ہے۔ اب جو گالی وہاں تھانیدار دیتا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ گالی پنجاب سے آئی ہے تو ہم لوگ یعنی قسور گردیزی' لطیف والی اور میں جیل کے اندر ایسی صورت حال میں ایک معذرت خواہانہ رویہ ہی رکھتے تھے اور انہیں یقین دلاتے تھے کہ ہم پنجاب کے لوگ آپ اور عوام کے ساتھ رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ ہم تو ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ آپ کے ساتھ زیادتیاں ہوں۔

قفس آشیانہ

حیدرآباد جیل میں پچپن افراد تھے۔ چاروں صوبوں سے' پنجاب سے قسور گردیزی کرنل لطیف اور میں ...... ہم چونکہ ایم این اے ایم پی اے نہیں تھے تو ہم بی کلاس میں تھے اور بزنجو صاحب' مینگل اور ولی خان اے کلاس میں تھے۔ یہاں میں ذکر کر دوں کہ آئی جی' کے ایم چودھری' جسٹس یعقوب کا بھائی تھا۔ وہ دہلی میں فرسٹ سیکرٹری تھا۔ جب میں ۱۹۵۶ء میں ہندوستان مشاعرے پڑھنے گیا تھا' وہاں مجھے ایک دفعہ وہ کافی ہاؤس لے گیا۔ میں نے اس سے کہا' دیکھو لوگ مجھے یہاں وِش کریں گے' مجھے سنیں گے اور میں لوگوں سے کہوں گا کہ جب تک چودھری نہیں کہے گا میں نہیں سناؤں گا۔ اس سے کہیں' یہ میرا میزبان ہے۔ یہی ہوا۔ لوگوں نے فرمائش کی۔ میں نے کہا' اس سے پوچھو میرے میزبان سے۔ تب میں نے لوگوں کی فرمائش پر سنایا۔ ایک میز پر مجھے کھڑا کر دیا گیا۔ دوسرے دن ''ٹائمز آف انڈیا'' اور ''ہندوستان ٹائمز'' نے ایک ایک کالم لکھا۔ میں نے کے ایم چودھری سے کہا کہ تم خاصا فعال کام کرتے ہو مگر اس کا Impact نہیں بنتا' جتنا میں نے ایک گھنٹے میں کام کر دکھایا ہے۔ اس پر اس نے میری مخالفت نہیں کی۔

حیدرآباد جیل میں ہمارا کام لکھنا پڑھنا تھا۔ دن بھر یوں وقت گزرتا۔ شام پھر اکٹھے ہوتے۔ ایک جگہ گراؤنڈ میں بیٹھتے تھے۔ ولی خان والی بال کھیلتے تھے۔ ایک عطاء اللہ جان تھا' بہت لمبا آدمی۔ وہ والی بال کا بڑا ماہر تھا۔ ہم والی بال میں شامل ہو جاتے تھے اور بال کورٹ کے پار پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ بزنجو صاحب والی بال کے بڑے ماہر تھے اور اصل میں تو وہ فٹ بال کے بڑے

کھلاڑی تھے۔ اپنے زمانے میں بلوچستان کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے۔ ان کا سرخ و سفید رنگ' مرچیں بہت کھاتے تھے۔ پھر وہ اپنا خیر بخش مری' خوبصورت' وہ بھی سرخ و سفید رنگ والا اور اپنے خیالات میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔ مطالعہ بے پناہ' Latest کتاب ہمیشہ اس کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ جیل میں کل پچپن افراد تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جن کی عمریں بھی چھوٹی تھیں' کوئٹہ میں ان پر ہمارے پنجابی بھائیوں نے بڑا تشدد کیا تھا۔ جب وہ پنجابی زبان میں گالی دیتے تھے تو وہ سمجھتے تھے کہ سارا پنجاب ہمیں مار رہا ہے۔ سارا پنجاب ہمیں گالی دے رہا ہے۔ ان کے خیالات یہی تھے۔ حیدرآباد میں ہم دو پنجابی تھے۔ میں اور قسور گردیزی۔ کبھی کبھی غصے میں وہ لوگ ہمیں بھی گردن زدنی سمجھتے تھے۔ یہیں لطیف افغانی بھی تھا۔ وہ ان کے ساتھ اردو بولتا تھا۔ ہم سے پنجابی میں بات کرتا تھا۔ جیل کے اندر کی فضا ایسی تھی کہ ہم وہاں چاروں صوبوں کے ہمدرد ایک ساتھ جیل کاٹ رہے تھے مگر بلوچستان کے لوگ اتنے دکھی تھے' ان پر اتنا تشدد ہوا تھا کہ ہم بھی انہیں کچھ بہتر نہیں لگتے تھے۔ اتنے ظالم تو نہیں لیکن اچھے نہیں لگتے تھے۔ قسور گردیزی جیل میں ایک ہر دل عزیز شخصیت تھا۔ اس کے لطائف' اس کی گفتگو سن کے سب خوش ہوتے تھے۔ ہم ذرا کم آمیز سے ہو گئے تھے۔ وہاں گل خان نصیر تھے۔ ان سے فارسی کا دیوان حافظ سنتے تھے۔ ان کا فارسی تلفظ بڑا خوبصورت تھا۔ بلوچستان کے بہت سے پڑھے لکھے لوگ فارسی بھی خوب جانتے ہیں۔

حیدرآباد جیل میں معراج محمد خان اور علی بخش تالپور بھی تھے۔ یہ گروپ بھی اسی ٹربیونل کے سامنے پیش کرنے کے لیے شامل کیا گیا تھا۔ پتہ نہیں ان پر یہ چارج تھا کہ ان کا بلوچستان میں کوئی ٹریننگ سنٹر ہے یا پتہ نہیں کہاں ہے۔ شیر محمد مری بھی اسی گروپ میں شامل تھے۔ لوگ انہیں جنرل شیروف کہتے تھے۔ شیر محمد مری پر بہت تشدد ہوا تھا۔ انہیں بوری میں بند کر کے دریا میں کشتی سے باندھ کر ڈبوتے تھے اور ٹھنڈے پانی میں ننگا کر کے کھڑا کرتے تھے۔

اب مقدمہ چلانے کے لیے وکیلوں کو رکھنا تھا۔ فیسیں طے کرنا تھیں۔ اسلم ریاض حسین اس ٹربیونل کا چیئرمین تھا۔ وہ بڑا ذہین آدمی تھا۔ اس نے وکلاء کی فیسیں طے کرنے میں اس کیس کو لمبا کیا۔ وہ بہت ہی خوش نصیب اور رحیم چیئرمین ثابت ہوا۔ جس نے ہمارے غصیلے نوجوانوں سے گالی نہیں کھائی نہ ہی اس نے سخت رویہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ اس نے اس مقدمے کا سسٹم اس طرح استوار کیا کہ وہ دس سال بھی چلتا رہتا تو بے نتیجہ ہی رہتا۔ مقدمہ کیا تھا بس ایک ''سلسلہ'' تھا۔ دوران سماعت ''پیغام'' بھی آتے رہے کہ ''بات کرو' بات کرو'' ولی خان اور خیر بخش مری نے سخت رویہ اپنا لیا تھا کہ ''ہم کوئی بات نہیں کریں گے۔ ہم تو یہیں پڑے رہیں گے۔'' بھٹو صاحب کہتے تھے کہ ''یہ کیسے لوگ ہیں جو جیل میں کمبل ہو گئے ہیں ان کو ہم سے بات کرنی چاہیے۔'' وہ اپنے ایجنٹس کو بھیجتے تھے۔

انہوں نے خیر بخش کے بھائی کو بھیج دیا۔ خیر بخش مری نے اسے گالیاں دیں کہ "خبردار آئندہ کبھی ادھر نہ آنا۔"

جیل کی دیواروں میں مائیک لگے ہوئے تھے۔ ہم آپس میں جو بات بھی کرتے باہر گراؤنڈ میں آ کر کرتے تھے۔ وہاں خاص ہال بنے ہوئے تھے جہاں بیٹھ کر باتیں کی جا سکتی تھیں لیکن ہم وہاں کوئی بات نہ کرتے تھے۔ جیل میں ہمارے ساتھ افضل خان جیسے صاحب ثروت ساتھی بھی تھے۔ ہم جیسے ورکرز کا وہ خاص خیال رکھا کرتے تھے۔ افضل خان نے کتابیں وغیرہ منگوانے کے لیے ہمیں پانچ چھ سو روپے دیے تھے۔

◆◆◆

گوشے میں قفس کے

میری قید کے طویل عرصے میں میری بیوی پہلی بار مجھ سے ملنے وہاں پہنچ سکی۔ کراچی میں ایک میرا دوست تھا' جو میرا کلاس فیلو تھا اور ڈاکٹر تھا۔ اس نے آ کر مجھے بتایا کہ ''آپ پریشان کیوں ہیں' آپ کی بیگم جلد ہی آپ سے ملنے آئیں گی۔'' میں نے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے پتہ چلا ہے کہ وہ آئیں گی؟'' وہ کہنے لگا کہ ''آپ فکر نہ کریں وہ کل تک آ جائیں گی۔'' میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ رات کو وہاں پہنچی تو اس کو مجھ سے ملنے نہیں دیا گیا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ کراچی واپس چلی گئی۔ دوسرے دن وہ آئی۔ ہم دونوں ملاقات کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ ہمارے پاس ایک سی آئی ڈی کا پولیس مین بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ''یہ باتیں جو تم مجھ سے کر رہی ہو یہ سب سن رہا ہے اور یہاں مائیک بھی لگے ہوئے ہیں۔ یہ وقت جو ہم پر آن پڑا ہے اسے تو گزارنا ہے۔ تمہارے رونے سے تو میں آزاد نہیں ہو سکتا۔ تم نے مجھے دیکھ لیا ہے اب یہاں نہ آنا اور بچوں کے ساتھ حوصلے سے رہنا۔ مجھے پتہ نہیں کب تک یہاں رہوں۔ ہو سکتا ہے دس سال تک مقدمہ چلے۔ پہلے ہمارا وکیل جرح کرے گا پھر سرکاری وکیل کچھ کہے گا۔ یہ تو لامتناہی سلسلہ ہے۔'' یہ سب باتیں میں نے اسے سمجھائیں اور کچھ حوصلہ دے کر واپس بھیجا۔

درس گاہ

جیل میں میرے ساتھی جو میرے دوست بھی تھے' ان میں نوجوان بھی تھے۔ وہ میرے مداح تھے۔ ہم ان کی باتیں سنتے وہ ہماری سنا کرتے تھے۔ میں کبھی ان سے کہا کرتا تھا۔ ''کوئی لتا کو ڈھونڈ کر لاؤ۔'' ایک وہاں نوجوان وہاب تھا جو ان سے ذرا سینئر تھا وہ بھی بڑا باذوق تھا چنانچہ وہاں دو گروپ بن گئے۔ ایک لتا کو چاہتا تھا دوسرا ناہید اختر کو پسند کرتا تھا۔ میں ان سے کہتا ''بھائیوں کہاں لتا اور کہاں ناہید۔'' وہاب ریڈیو پر سوئی گھماتے جہاں کوئی نہ کوئی لتا کا گانا لگا ہوتا۔ وہ چلاتا تھا ''جالب صاحب! لتا آ گئی' لتا آ گئی۔'' میں نے وہاں یہ نظم لکھی تھی۔

تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے
تیری اگر آواز نہ ہوتی

بجھ جاتی جیون کی جوتی
تیرے بچے سر ہیں ایسے
جیسے سورج چاند ستارے
تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے

کیا کیا تو نے گیت ہی گائے
سر جب لاگے من جھک جائے
تجھ کو سن کر جی اٹھتے ہیں
ہم جیسے دکھ درد کے مارے
تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے

میرا تجھ میں آن بسی ہے
انگ وہی ہے رنگ وہی ہے
جگ میں تیرے داس ہیں اتنے
جتنے ہیں آکاش پہ تارے
تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے

جیل میں گل خان نصیر ہمیں دیوان حافظ پڑھایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار ریڈیو کابل سے حافظ کی غزل تحت اللفظ سنائی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ستار بجتی تھی۔ وہ تلفظ اور لہجہ اتنا خوبصورت ہوتا کہ وہ آواز دل میں اتر جاتی تھی۔ گل خان نصیر قرآن شریف کے حافظ بھی تھے، ہم ان سے قرآن بھی پڑھا کرتے تھے۔ ہم نے ایک درسگاہ کا ماحول بنا لیا تھا۔ چوہدری عبدالحمید ''کارواں'' کے مالک

ہیں ان سے ہم نے قرآن شریف کا ترجمہ و تفسیر مولانا ابوالکلام کا لکھا ہوا منگوایا۔ قرآن تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور ابوالکلام کی شرح جو ہے وہ بھی بہت خوبصورت انداز میں لکھی گئی ہے۔ تاریخ فرشتہ کی دونوں جلدیں بھی منگوا کر پڑھیں جیل میں وقت بہت ہوتا ہے اس لیے جیل خود بخود لائبریری بن گئی تھی۔ ہمارا اور کوئی کام ہی نہیں تھا سوائے لکھنے اور پڑھنے کے۔ ''گوشے میں قفس کے'' جو دیوان ہے میں اسی جیل میں لایا تھا جیسا کہ میرے والد صاحب نے لکھا ہے کہ ہم لوگ غزنی سے آئے ہیں تو غزنی سے محمود غزنوی بھی آیا۔ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ اس کے بارے میں تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ محمود غزنوی صاحب کو دولت سے بہت محبت تھی۔ پیشے کے وہ تاجر تھے ایک اور تاجر سے انہوں نے اس کا مال اس لیے ہتھیا لیا تھا کہ وہ اس کی سلطنت سے گزر رہا تھا۔

عہد سزا

ہم سب شام کو گراؤنڈ میں اکٹھے ہوتے تھے اور سیاسیات عالم پر گفتگو کرتے تھے۔ لیڈرز آپس میں بحث مباحثہ کرتے' کہیں کہیں ہم بھی لقمہ دے دیتے تھے۔ قسور گردیزی اس محفل کی جان تھے۔ وہ لطائف سناتے تھے اور لوگوں کو ہنساتے تھے۔ جیل میں رہتے ہوئے ہنسنے ہنسانے کا کام بھی بے حد مشکل ہوتا ہے۔ عطاء اللہ مینگل بڑے حوصلہ مند آدمی تھے۔ وہ دن میں ایک آدھ بار بھٹو کو برا بھلا کہتے اور اپنے غم و غصے کا اظہار کر لیتے تھے۔ یہ ان کی عادت بن چکی تھی۔ مثلاً کوئی ''نام'' رکھ دیا اور دن میں دو ایک بار کہہ کر مطمئن ہو گئے۔ اب قسور گردیزی صاحب لطائف سنا رہے ہیں' سب ہنس رہے ہیں کہ ایک آدمی نے آ کے کہا کہ ''عطاء اللہ مینگل کے لڑکے کو فوج نے گولی ماردی' وہ قتل ہو گیا۔'' یہ سب نے سنا۔ عطاء اللہ مینگل نے بھی یہ سننے کے بعد کہا۔ ''ہاں تو شاہ جی آپ کون سا لطیفہ سنا رہے تھے؟'' سننے والا جس کا بیٹا قتل ہو گیا ہے وہ خود کہہ رہا ہے کہ آپ بہت اچھا لطیفہ سنا رہے تھے۔ اب کی ہنسی گم ہے۔ ہم اسے حوصلہ دیں مگر اس نے کہا کہ ''بلوچستان اور پاکستان کے تمام لڑکے میرے لڑکے ہیں' میرے بیٹے کو گولی لگ گئی تو کیا ہے۔ میں ذاتی غموں کی پرواہ نہیں کیا کرتا ہوں۔ ہاں قسور صاحب وہ لطیفہ کیا ہے؟'' لطیفہ کیا ہونا تھا' محفل ہی برخاست ہو گئی۔

خصوصی عدالت سے بات آگے چلتی رہی۔ زندگی جیل میں گزرتی رہی۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ ایک نوجوان تھا۔ ہم پیشی بھگت کر آ رہے تھے تو افضل خان نے ان سے کہا کہ ''ہمارے ملنے والے آئے تھے' آپ نے انہیں ہم سے ملنے نہیں دیا۔ یہ تو آپ نے بڑی زیادتی کی ہے۔'' افضل اس سے بحث کر رہا تھا۔ وہ وردی پہنے ہوئے تھا۔ خیر بخش مری بھی آ گئے۔ انہوں نے کہا۔ ''افضل خان! چھوڑو بحث کو یہ ابھی نوجوان ہے' سمجھ جائے گا۔'' اس نوجوان سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا کہ

I will teach you Lesson (میں تمہیں سبق سکھا دوں گا)

اتنا کہنا تھا کہ خیر بخش مری نے اس پر ایک کراٹے کا وار کر دیا۔ وہ نیچے زمین پر گر گیا۔ یہ ان کا اپنا خاص بلوچستان کا اسٹائل تھا۔ اسے غصہ تھا کہ میں نے شائستہ انداز میں کہا کہ "یہ نوجوان ہے۔" اور یہ کہتا ہے کہ "سبق سکھا دوں گا۔" چنانچہ ایک آدھ طمانچہ مارنا واجب ہو گیا تھا۔ اب اس کی جان ہی نکلنے لگی تھی کہ کرنل سلطان جو بلوچستان سے ہی تعلق رکھتے تھے انہوں نے آ کر اسے نکالا اور پکڑ کے دور پھینکا۔ جیل کا عملہ دور ہی دور سے گالیاں دے رہا تھا۔ میں اور قسور گردیزی ایک درخت کے نیچے کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہم سے تو چھڑایا نہ جا سکتا تھا۔

غلام مصطفیٰ جتوئی اس وقت سندھ کے چیف منسٹر تھے۔ چنانچہ اس نوجوان سپرنٹنڈنٹ جیل نے جا کر ان کے سامنے یہ مقدمہ پیش کیا۔ میں نے سنا کہ غلام مصطفیٰ جتوئی نے جواب دیا تھا کہ "بھئی یہ تمہارے قیدی نہیں ہیں' صرف تمہاری تحویل میں ہیں۔ تم کس لیے ان سے لڑتے ہو؟ تمہارا کیا کام ہے ان سے لڑنے کا۔ ان کی بات سنو۔ ہم ان کے ساتھ نہیں لڑتے تو تم کیسے ان کے ساتھ لڑو گے؟ گورنمنٹ نے انہیں جیل میں "مہمان" کی حیثیت سے رکھا ہوا ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے سب کے نام لیے کہ اس نے مجھے مارا اور اس نے بھی مارا۔ جب اس کی شکایت کا نوٹس نہ لیا گیا تو پھر وہ عید کے روز ہم سے ملنے کے لیے آیا۔ ہم نے سوچا مل لیتے ہیں۔ میں نے لڑکوں سے بھی کہا کہ بھائی اس سے مل لو کوئی ہرج نہیں۔

سرکاری وکیل جو تھا اس کے سامنے جب بھی بھٹو کا نام آتا تھا' وہ فوراً کہتا کہ "بھٹو کا نام کیوں لے رہے ہو؟" میر غوث بخش بزنجو جو بھٹو کی گورنمنٹ میں رہے تھے اور اس کے بہت ہی قریب تھے' انہوں نے کہا "یار وہ میرا دوست تھا' میں اس کا گورنر رہا ہوں۔ تم بھٹو کا لفظ ہی استعمال نہیں کرنے دیتے اور اتنے برانگیختہ ہو جاتے ہو۔" ہمارے لڑکے ججوں کو دیکھ کر شور مچاتے تھے۔ "چمچہ جج مردہ باد" جسٹس اسلم ریاض تو اس مقدمے کے آغاز میں ہی جا چکے تھے۔ ان پر یہ وقت ہی نہیں آیا تو وہ جج حکومت ہی کے تھے کیونکہ حکومت نے ایک جعلی مقدمہ بنایا تھا۔ ایک جائنٹ سیکرٹری اس کا Complainent تھا۔ وہ ولی خان کے خلاف تھا۔ اس کے آنے پر ولی خان اندر چلے جاتے تھے۔ غوث بخش بزنجو انہیں مناتے اور ان دونوں کے درمیان ایک پل بن جاتے تھے۔ پھر کارروائی شروع ہوتی تھی۔ سب کا بیان ہوا۔ ولی خان کا بیان تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا تھا جو نوٹ نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ کہا یہ گیا کہ اس کو نوٹ نہیں ہونے دیں گے' حذف کر دیں گے۔ ولی خان نے بڑی پرمغز تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ نظریہ پاکستان کیا ہے؟ ہم کیا سمجھتے ہیں اور یہ (حکومت والے) نظریہ پاکستان کو کیا سمجھتے ہیں۔ ہم انصاف اور مساوات کو نظریہ پاکستان سمجھتے ہیں۔ یہ تقریر بڑی عالمانہ تھی۔ ان کی یہ تقریر اخباروں میں بھی چھپی تھی۔ اس کیس میں ملوث ہر بندے نے بڑا سوچ سمجھ کر بیان دیا اور وہ تاریخ کا حصہ بن گیا۔ معراج

محمد خان نے کہا کہ "میں بھٹو کے ساتھ تھا اس نے ایسے مظالم مجھ پر کئے اور بھٹو ہی نے پاکستان کو توڑا۔ میں اس کی گواہی دیتا ہوں۔ لاؤ اسے میرے سامنے۔" تو پولیس کے جوان آگئے اور انہوں نے معراج محمد خان کو وہاں سے ہٹا دیا۔ نجم سیٹھی بھی ان کے ساتھ تھے یہ وہ لوگ ہیں جو سوچتے ہیں کہ انقلاب کیسا آتا ہے۔ انقلاب کی باتیں کرتے ہو۔ وہ انقلاب کی باتوں میں ہی پکڑے گئے تھے۔ منظر بشیر کا بھانجا بھی تھا۔ وہ بھانجا "ادھر" ہو گیا یعنی وعدہ معاف گواہ بن گیا تھا۔ پولیس والے تو مجھے بھی وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتے تھے اگر میں حکومت کی طرف سے ولی خان کے سامنے یہ بیان دیتا کہ یہ غدار ہے تو وہ میری اصل موت ہوتی۔ اس موت سے بچنے کے لیے میں نے کہا کہ یہ جو موت ہے "شہادت کی موت" ہے میری زندگی کی موت ہے۔ بشیر ریاض جو محترمہ بے نظیر بھٹو کا پریس سیکرٹری تھا۔ یہ وعدہ معاف گواہ بن گیا تھا۔ اس نے کٹہرے میں کھڑے ہو کر بیان دیا کہ ولی خان نے لندن میں پلان بنایا تھا۔ لندن ہی کی کسی محفل میں بشیر ریاض بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "اب تو کیا باتیں کر رہا ہے بڑھ چڑھ کے۔ میں نے تجھے وعدہ معاف گواہ کی شکل میں دیکھا ہے تو کون سا صحافی ہے، بکواس بند کر۔" مسعود محمود بھی وہاں آتا تھا۔ ہم نے کبھی اس کی پرواہ ہی نہیں کی تھی۔ مسعود محمود نے ہی بھٹو کو مروایا تھا۔ وہ اس ایف آئی آر Complainent تھا جس کے تحت بھٹو کو پھانسی ہوئی تھی۔

جیل کے اندر بہت ساری بحثیں ہوتی تھیں۔ سیاسیات عالم اور پاکستان کی سیاست پر آپس میں گرما گرم بحث ہوتی تھیں۔ ہفتے میں ایک بار شعر و سخن کی محفل جمتی تھی۔ اس میں یہی تھا کہ جس نے جو سنانا ہے وہ سنا لے۔ علی بخش تالپور بڑا باذوق اور نفیس الطبع آدمی تھا۔ وہ کتابیں منگواتا تھا۔ وہ سندھ کا بڑا لینڈ لارڈ تھا۔ راؤ سکندر مجھے کہا کرتا تھا "او بیوقوف...... اوئے بیوقوف" میں اسے کہا کرتا تھا کہ تمہارے ساتھ جیل میں پڑا ہوں۔ اس لیے بیوقوف ہی ہوں۔ اگر عقلمند ہوتا تو جیل کے باہر ہوتا۔ وہ پھر کہتا۔ او...... آخ ...... تو نہیں سمجھا۔ تو بیوقوف ہے۔ میں نے کہا۔ "اچھا بھئی تو دوست ہے، کہہ لے میں بیوقوف ہی سہی۔" اس کا بیوقوف کہنے کا مطلب اس وقت سمجھا جب میری رہائی کا وقت آیا۔ جسٹس اسلم ریاض جو شاعر تصدق حسین ریاض کے بیٹے تھے انہوں نے مشتاق راج ایڈووکیٹ سے کہا کہ "جالب کی ضمانت میں لیتا ہوں اس کی تم درخواست لے آؤ۔" میں نے ولی خان سے پوچھا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے اور یہ کیا ہو رہا ہے۔ کہنے لگے۔ "ٹھیک ہے، ہم آزماتے ہیں کہ ضمانت ہوتی ہے یا نہیں۔" میں نے کہا۔ کہاں ہوگی یار خان صاحب، یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ضمانت چیک آ گئی اور میری چار لاکھ کی ضمانت ہوگئی۔ میں نے ولی خان سے پوچھا کہ یہ ضمانت کون دے گا؟ کہنے لگے۔ "کوئی نہ کوئی دے دے گا۔" اس وقت یہاں لاہور میں ہمارے دوست لطیف بٹ تھے۔ اس نے دو راتوں کو پکڑا۔

ایک رانا نذرالرحمن اور دوسرا رانا ظفراللہ خان۔ ان دونوں نے دو دو لاکھ کی ضمانتیں دیں۔ کرنل لطیف افغانی کی بھی ضمانت کا انتظام ہو گیا۔ میری رہائی ہو گئی۔ ویسے میں نے چار لاکھ روپے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نے فلم "سات لاکھ" کے گانے لکھے ہیں۔ جب میں جیل سے جانے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے "جنرل شیروف" کو جیل کے اندر "آب نشاط" میسر تھا۔ یہ سہولت حکومت کی طرف سے نہیں تھی بلکہ علی بخش تالپور جو سندھ کے لینڈ لارڈ تھے ان کے کارندے تھیلے میں بوتلیں ڈال کر لایا کرتے تھے۔ ہمارے سیل کے ساتھ ہی "جنرل شیروف" کا سیل تھا تو وہ وہاں وہ "پیتے" تھے۔ اور راؤ سکندر مجھے بیوقوف کہتے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جالب پیتا ہے اسے یہاں میسر نہیں ہے۔ اس بات کی عابد حسن منٹو نے بھی تعریف کی تھی کہ "جالب تو شاعر ہے اسے جیل کے اندر بھی "آب نشاط" کی ضرورت محسوس ہوتی ہو گی۔ اس کا پینا بھی کوئی اب واقعہ نہیں ہے لیکن جب بھی جیل میں گیا اس نے پینا اپنی کمزوری نہیں بنایا اور نہ ہی حکام کے ہاتھوں اس کمزوری کے باعث جھکا۔" میں اس بات کو برا نہیں سمجھتا تھا کہ ان کو میسر ہے اور میں وہاں نہیں پی سکتا۔ میں نے اس کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ اس لیے وہ مجھے بیوقوف کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ افضل خان کے سیبوں کے باغ تھے۔ وہ جب تک جیل میں رہے وہ سیب منگواتے تھے اور ہر ایک کو ایک سیبوں کا ٹوکرا دیا کرتے۔ ہفتے یا پندرہ دن بعد ایک دنبہ پکواتے۔ سب فرش پر بیٹھ کر مل کر کھاتے تھے۔ یہ خوبصورتی تھی وہاں کہ ہم آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔

رہائی

اب ضمانت ہو گئی تھی لیکن پیشی بھگتنے کے لیے لاہور سے حیدرآباد جانا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر افتخار احمد جو وہاں ایک ہسپتال کے انچارج تھے۔ میں نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ ایک سرٹیفکیٹ بھیج دیا کریں کہ میں بیمار ہوں۔ وہ سرٹیفکیٹ بھیجتے رہے۔ پھر وہ مجھ سے نظریں چرانے لگے۔ آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے' تو مجھے حیدرآباد جانا پڑتا تھا۔ ٹرین میں سیٹ نہیں ملتی تھی۔ بعض اوقات تو لاہور سے کھڑے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ رسول بخش تالپور کو پتہ چلا کہ میں یہاں پیشی بھگتنے کے لیے آتا ہوں تو اس نے مجھ سے کہا کہ "ہمارا گھر یہاں ہے تو یہاں ٹھہرو۔ مت لاہور جایا کرو۔ جب تک یہ مقدمہ چل رہا ہے میرے پاس رہو۔" ہم نے ان کی بات مان لی۔ علی بخش تالپور بھی ہمارے دوست تھے وہ بھٹو کے زیر عتاب تھے۔ ان کے گھر سے کھانا آجاتا تھا۔ ولی خان میں ایک سچائی تھی' اس نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ "بھئی میرا جیل آنا بڑا واقعہ نہیں ہے' تمہارا جیل آنا بڑا واقعہ ہے کہ تمہارے بعد تمہارے گھر والوں کو کھانا ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

ایک وکیل احسان وائیں تھے' ہمارے دوست تھے۔ میں بار بار اس کے بارے میں کہتا تھا اس کو اپنے وکیل کے طور پر رکھنا ہے

تو ولی خان ناراض ہوئے کہ آپ بار بار اس کو رکھنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ ہمیں پتہ ہے کہ وہ آپ کو لاہور سے لایا کرے گا۔ آپ کا خیال رکھے گا۔" لیکن اس کے برعکس ہی ہوا احسان وائیں کو فیس ملتی تھی۔ وہ ہمیں نہیں لائے نہ ہی کبھی انہوں نے ہمیں پوچھا۔ ان کے علاوہ مشتاق راج اور عابد حسن منٹو بھی ہمارے وکیل تھے۔

داد و فا

جب ہماری حیدرآباد سازش کیس میں ضمانت پر رہائی ہوئی تو جیل کے "گیٹ پر نواز بٹ اینڈ کمپنی" کھڑی تھی جو کبھی کبھی ہمیں جیل میں ملنے کے لیے آتے تھے اس دن وہ استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ اس دن انہوں نے ہمیں اچک لیا۔ انہوں نے پروگرام بنایا کہ گاڑی کھاتہ حیدرآباد میں ہمیں Reception دیا جائے گا۔ میں نے کہا 'ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی اخبارات میں Reception کی خبریں بھی چھپ گئیں۔ اس دن پولیس نے گاڑی کھاتہ کے دفتر کو گھیرا ڈال لیا تو اب مجھ سے کہنے لگے۔" جناب اب تو گاڑی کھاتہ میں جلسہ نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا 'آپ تو سڑکوں پر جدوجہد کرنے کے آدمی ہیں۔ یہ جدوجہد کریں۔ پولیس دو ایک لاٹھیاں آپ کو مارے گی۔ مجھے مارے گی۔ مجھے تو انہوں نے پیش کرنا ہی کرنا ہے۔ اس وقت پروگرام بدلنا میں توہین سمجھتا ہوں۔ میں تو وہاں جاؤں گا۔ مجھے یہ غصہ بھی تھا کہ انہوں نے باہر جا کر دھواں دھار تقریریں بھی کیں۔ بیانات بھی لکھوائے کہ بورژوا جمہوریت کے خلاف ہم سڑکوں پر انقلاب لائیں گے وغیرہ وغیرہ....... میں نے کہا۔ اب میں نہیں جانتا' آپ کی اس بات کو۔ کہنے لگے 'نہیں نہیں .... یہ ہے وہ ہے۔ آپ رسول بخش تالپور کے گھر چلیں ہم وہیں آپ کو Reception دیں گے۔" میں نے ان سے کہا کہ" میں تو وہاں ٹھہرا ہوا ہوں اور پھر وہ ایک زمیندار اور جاگیردار ہے۔ آپ اس کے گھر یہ جلسہ کیوں کر رہے ہیں؟" مگر وہ سب وہاں آ گئے۔ رسول بخش تالپور کراچی میں تھے۔ ان کو ٹیلیفون پہ ٹیلیفون کر رہے ہیں کہ حبیب جالب بھی چاہتے ہیں کہ میرے اعزاز میں استقبالیہ آپ کے ہی گھر میں ہو۔ یہ انہوں نے جھوٹ بولا تھا۔ اب رسول بخش تالپور نے کہا کہ اگر حبیب جالب بھی یہی چاہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ تھی "انقلابیوں کی شان"۔ اب وہاں جلسہ برپا کر دیا اور تقریریں شروع ہوئیں۔ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ نے اول درجے کے جاگیرداروں کے ساتھ اے کلاس میں جیل کاٹی ہے اور یہ ہے ...... وہ ہے۔" مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی جرم کیا ہو۔ میں گنہگار ہوں۔ وہ کہے جا رہے تھے کہ "آپ وہ آدمی ہیں ...... جدوجہد .... انقلاب .... ہم جاگیرداروں کو نیست و نابود کر دیں گے۔ ان کا قلع قمع کر دیں گے۔" اب جاگیردار کے گھر میں ہی یہ جلسہ ہو رہا ہے۔ تقریریں دھواں دھار ہو رہی ہیں۔" جاگیردارانہ سماج .... طبقاتی نظام .... امریکی سامراج کے ایجنٹس

......کہاں ہے یہ...... "سب کچھ انہوں نے کہہ دیا تو اب میری باری آئی۔ میں نے اٹھ کر کہا۔

"حضرات! آپ کی باتیں سن کر مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی گناہ کر کے یہاں آیا ہوں۔ جیل میں کسی اسمگلنگ کے کیس میں گیا ہوا تھا۔ آپ نے مجھے جو Reception دیا ہے' آپ نے اپنی باتوں کی آپ ہی نفی کر دی ہے۔ ایک جاگیردار کے گھر بیٹھ کر جاگیرداروں کو گالیاں دی ہیں۔ آپ نے تو گاڑی کھاتہ مزدوروں کے دفتر میں جلسہ کرنا تھا۔ وہاں پولیس سے خوفزدہ ہو گئے اور یہاں آ گئے ہیں' اس پر مجھے وہ سکھ یاد آ گیا جو سمندر میں ڈوبتے ہوئے بچے کو بچا کر لایا تھا۔ اب اس کے والدین اس سکھ کے گلے میں ہار ڈال رہے ہیں' کوئی اسے کوکا کولا پلا رہا ہے' کوئی تعریف کر رہا ہے کہ سردار جی آپ بڑے بہادر آدمی ہیں۔ آپ نے ہمارے بچے کی جان بچائی ہے۔ اس نے کہا" وہ سب ٹھیک ہے پہلے یہ بتاؤ مجھے دھکا کس نے دیا تھا۔" تو میں وہ سکھ نہیں ہوں جو آپ کو یہ بتاؤں کہ مجھے آپ نے دھکا دیا تھا۔ میں تو اب یہ بات مشہور کرتا رہوں گا کہ میں تو بیوقوف نہیں ہوں لیکن تم مجھے گاڑی کھاتے میں لے کر نہیں گئے' تمہاری جو سڑکوں پہ جدوجہد تھی اس کی قلعی کھل گئی ہے۔"

اس کے بعد میں حیدر بخش جتوئی کے مزار پر جا پہنچ گیا اور وہاں پھولوں کی چادر چڑھا کر نظم پڑھ کر لوٹ رہا تھا کہ پولیس میرے پیچھے لگ گئی اور مجھے رسول بخش تالپور کے گھر پہنچا کر واپس گئی۔ سال ڈیڑھ سال تک نواز بٹ وغیرہ مجھے ملنے نہیں آئے۔ جب رہائی ملی تو انہوں نے موقع غنیمت جانا کہ ایک جلسہ جمالیں۔ یہ ہمارے دوست اتنا تیز بھاگنے والے اب پتہ نہیں کہاں کہاں کاروبار میں جتلا ہیں۔ کس کس آدمی کے ساتھ وہ کارخانہ داری میں حصے دار ہیں۔ ہمارے تو بچوں کو بھی خبر نہیں تھی اور نہ ہمیں یہ احساس تھا کہ ہم نے انہیں پڑھنے کے لیے روس بھیجنا ہے۔ یہ اور ان کے بچے روس بھی ہو آئے۔ ہمیں یہی کہا گیا تھا کہ "تم کام کرو بس تمہارا کام یہی ہے جلسہ جماؤ۔ جلسے میں آؤ۔ تقریر کرو اور جیل چلے جاؤ۔" لیکن ہمارے پاس ایک چیز تھی اور وہ تھی شعر کہنے کی صلاحیت جس نے ہمیں بچائے رکھا۔ یہ جب کہیں جاتے ہیں تو یہ نہیں بتاتے کہ ہم جا رہے ہیں ورکرز کو پوچھتے بھی نہیں ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ورکرز ان کی جیب کی گھڑی ہیں۔ ہاتھ کی چھڑی ہیں۔ جدھر لے جائیں گے ادھر چلے جائیں گے۔ اگر کوئی Thoughtfull ورکر ہے تو وہ اڑ جاتا ہے۔ پھر یہ اس کو اتنا مارتے ہیں اور نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس قدر غفلت برتتے ہیں۔ اس سے بے نیازی اختیار کرتے ہیں۔ ایسی ظالمانہ بے نیازی کہ اس کے اعضائے جسمانی توڑ تاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ ہماری انہوں نے ہر جگہ توڑ پھوڑ کی لیکن ہم میں کچھ ایسی سکت یا صلاحیت تھی کہ ہم نے اپنے ہاتھ پاؤں جوڑ کے اپنے آپ کو مجتمع کیا اور کام کرتے رہے۔ حیدرآباد جیل میں قید رہنے کے اثرات کافی دیر تک ہم پر رہے تھے۔ عدالت کے روبرو میں نے کہا تھا کہ

یہ منصف بھی تو قیدی ہیں ہمیں انصاف کیا دیں گے
لکھا ہے ان کے چہروں پر جو ہم کو فیصلہ دیں گے
اٹھائیں لاکھ دیواریں طلوع مہر تو ہو گا
یہ شب کے پاسباں کب تک نہ ہم کو راستہ دیں گے
ہمیں تو شوق ہے اہل جنوں کے ساتھ چلنے کا
نہیں پروا ہمیں یہ اہل دانش کیا سزا دیں گے
ہمارے ذہن میں آزاد مستقبل کا نقشہ ہے
زمیں کے ذرے ذرے کا مقدر جگمگا دیں گے

میکسم گورکی کا ناول "ماں" پڑھا تھا۔ اس میں جو ججوں کی تصویریں گورکی نے بیان کی ہیں وہی چہرے مجھے عدالت میں نظر آئے۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ قیدی ہیں' یہ مجرم ہیں' ہم مجرم نہیں ہیں۔ اور میں نے کہا تھا کہ

ہمارے قتل پر جو آج ہیں خاموش کل جالب
بہت آنسو بہائیں گے بہت داد وفا دیں گے

جیل کے اندر ایک کاپی پر جو کچھ میں لکھتا رہا' اس کا نام میں نے "گوشے میں قفس کے" تجویز کیا جس کو مکتبہ کارواں کے چوہدری عبدالحمید نے چھاپا تھا۔ جب ہم جیل سے آئے تو ایک محفل سیف خالد کے ہاں بھی منعقد ہوئی تھی' وہاں اور دوست بھی جمع تھے۔ سیف خالد نے مجھ سے کہا کہ "میں نے لندن میں سنا کہ حبیب جالب جیل چلا گیا ہے اور میں نہیں جا سکا۔ مجھے میرے بھتیجے غلام علی مومن کے سسر نے یہ خبر سنائی تھی۔ میرا نام تو انہوں نے کاٹ دیا تھا۔" میں نے کہا کہ یار چپ رہ تیرا نام تو اسی غلام علی مومن نے کٹوایا تھا' تم نے تو خود مجھے بتایا تھا۔ اب یہ اظہار تاسف کیا کرتا ہے کہ میں تیرے ساتھ نہیں تھا۔ بھول جاتے ہیں یار لوگ۔ یہ ہمارے دوست اور ہمارے ساتھی تھے۔ میں نے کچھ اشعار یوں کہے ہیں۔

اور سب بھول گئے حرف صداقت لکھنا
رہ گیا کام ہمارا ہی بغاوت لکھنا
لاکھ کہتے رہیں ظلمت کو نہ ظلمت لکھنا

ہم نے سیکھا نہیں پیارے بہ اجازت لکھنا

نہ صلے کی نہ ستائش کی تمنا مجھ کو
حق میں لوگوں کے ہماری تو ہے عادت لکھنا

ہم نے جو بھول کے بھی شہ کا نہ قصیدہ لکھا
شاید آیا اسی خوبی کی بدولت لکھنا

اس سے بڑھ کر مری تحسین بھلا کیا ہو گی
پڑھ کے ناخوش ہیں مرا صاحب ثروت لکھنا

دہر کے غم سے ہوا ربط تو ہم بھول گئے
سرو قامت کو جوانی کو قیامت لکھنا

کچھ بھی کہتے ہیں کہیں شہ کے مصاحب جالب
رنگ رکھنا یہی اپنا اسی صورت لکھنا

◆◆◆

جنوں کی حکایتیں

میاں محمود علی قصوری کو بھی بھٹو نے بڑا ذچ کر کے نکالا تھا۔ میری ملاقات میاں صاحب سے ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ تو بھٹو کو دس بارہ سال سے جانتے تھے۔ اس پر انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کہاں کسی کی بات سنتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ میاں صاحب کے مکان کو جلانے کی بات چل نکلی۔ مصطفیٰ کھر پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ میں اور چوہدری اصغر خادم صبح سویرے میاں صاحب کے مکان پر گئے اور ان سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ کھڑے ہیں کوئی آپ کے مکان کی ہوا کی طرف بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میاں صاحب نے جواب دیا کہ ''بھئی میری اتنی بڑی کوٹھی ہے۔ یہ کہاں جل جائے گی۔'' انہوں نے کہا۔ ''اچھا بھئی آپ کا شکریہ'' میاں صاحب بہت سادہ انسان تھے۔ خامیوں کے مقابلے میں ان کے اندر بہت خوبیاں تھیں۔ ان کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ میں ''عالم کیف'' میں تھا' میں نے ان سے کہا کہ میں آج آپ کے خلاف آدھ گھنٹہ تقریر کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا۔ ''ہاں کرو۔'' اس کے بعد میں نے ان پر بوچھاڑ کر دی۔ بہت زیادہ ان پر تنقید کی۔ میاں صاحب' تمہیں سہالہ کیس بھی دیا گیا۔ چھوڑو یہ کام۔ ہم آپ کے اس کاروبار کے خلاف ہیں۔ یہ اصول کیا ہے؟ یہ قانون کیا ہے؟ پتہ نہیں میں کیا کیا کہتا رہا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ جب میں کہہ چکا تو انہوں نے اپنے پٹھان ڈرائیور کو اشارہ کیا اور کہا کہ ''جالب صاحب کو ان کے گھر چھوڑ آؤ۔'' یہ تھی میاں محمود قصوری کی خوبصورتی۔ بہت سخت سست اور تلخ باتیں ہوئیں لیکن وہ خاموش رہے۔

عبدالغنی خان

عبدالغنی' عبدالولی خان کے بڑے بھائی ہیں۔ وہ بھی مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں قصوری صاحب کے گھر آ گئے۔ وہ بڑے مست ملنگ۔ اچھے شاعر اور دانشور ہیں۔ متحدہ ہندوستان میں کانگریس کے جائنٹ سیکرٹری رہ چکے ہیں۔ ان کی انوکھی ادا ہے اور ہی رنگ کے آدمی ہیں۔ انہوں نے آتے ہی میاں محمود علی قصوری کی میز پر شراب کی بوتل رکھ دی اور کہا۔ ''قصوری' پیو'' انہوں نے کہا ''بھئی میں نہیں پیتا۔'' کہنے لگے ''گدھے ہو تم نہیں پیتے۔'' قصوری صاحب نے پھر اس پٹھان ڈرائیور کو اشارہ کیا اور کہا کہ ''انہیں بھی حبیب جالب کے پاس چھوڑ آؤ۔'' رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے میرے گھر کا دروازہ کھٹکنے کی آواز آئی' میں سنت نگر رہتا تھا۔

میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”ذرا دیکھو اس وقت کون ہے؟“ اس نے دیکھا اور آ کر کہا کہ ”ایک بڑا لمبا اور گورا چٹا آدمی ہے۔“ میں نے سوچا شاید پولیس آئی ہے۔ میں اٹھا اور باہر آیا میں نے پوچھا۔ ”بھئی آپ کون ہیں؟“ اس نے کہا۔ ”تم کون ہو؟“ میں نے کہا۔ ”میں حبیب جالب ہوں۔“ تو کہنے لگے۔ ”او گدھے ہم صبح سے تم کو ڈھونڈ رہے ہیں۔“ میں نے پھر پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“ تو کہا ”میں عبدالغنی ہوں۔“ جب اس نے نام بتایا تو میں اس سے بغل گیر ہوا۔ میں تو اس سے ملنے کے لیے بہت مشتاق تھا۔ وہ مجھے اسی وقت انارکلی کے اس ہوٹل میں لے گئے جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ اپنی دھن میں باتیں کر رہے تھے کہ ”ولی خان گدھا ہے اور فلاں ہے یہ کہاں کا لیڈر ہے۔ لیڈر تو اس کا باپ غفار خان ہے جو پٹھان ہے پٹھان۔“ میں نے کہا دیکھیے ولی خان ہمارے صدر ہیں۔ ٹھیک ہے وہ آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ تو کہنے لگے ”اچھا! میں اسے کچھ نہیں کہتا۔“ اب میں سوچ رہا تھا کہ ان سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ خان صاحب میں نے صبح کورٹ میں جا کر کچھ طالب علموں کی ضمانتیں وغیرہ کروائی ہیں اب آپ مجھے اجازت دیں۔ کہنے لگے ”اچھا ٹھیک ہے تم مجھے اپنی کتابیں بھیج دینا۔“ پھر کہنے لگے۔ ”ایسا کرو کہ یہاں کا جو آئی جی ہے میرا کلاس فیلو ہے اس کو دے دینا وہ پہنچا دے گا۔“ میں نے کہا کہ میں تو پولیس والوں سے واقف نہیں ہوں میں تو آپ کو ہی بھیج دوں گا۔ کہنے لگا۔ ”نہیں نہیں وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ بڑا ٹھیک آدمی ہے۔“ عبدالغنی خان ایک عجیب و غریب شخصیت کا نام ہے۔ ایک دفعہ میرے گھر جاپانی پھل کی ٹوکری دے گئے تھے۔

بھٹو کے ریمارکس

ہم ولی خان کے جلسوں میں پشاور جاتے تھے اور شرکت کر کے واپس آ جاتے تھے کبھی کبھار ہوٹل میں ٹھہر جاتے تھے۔ غلام احمد بلور کے بھائی الیاس بلور ہیں۔ بڑے باذوق آدمی ہیں۔ غلام احمد بلور تو ”حاجی“ ہیں۔ ان سے ہماری دوستی تو نہیں رفاقت ہے۔ وہ ہمارے جیل کے رفیق ہیں۔ یہ پنڈی کی بات ہے۔ کسی ہوٹل میں الیاس بلور اور نور خان سے بات کر رہے تھے کہ ہم نے دیکھا بھٹو صاحب آ رہے ہیں۔ میں ذرا ہٹ کر دور کھڑا ہو گیا تو مجھے وہاں دیکھ کر بھٹو صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ ”آپ کھانا کھا کر جائیں۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں میں تو جا رہا ہوں۔“ بھٹو وزیر اعظم تھے۔ یہ سب گئے۔ میں نہیں گیا۔ جیل سے ہم آ چکے تھے تو مجھے اسلم ریاض کے برادر نسبتی آصف جان جو اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل تھے انہوں نے بتایا کہ ”میں نے تمہاری ضمانت پر بھٹو کے ریمارکس پڑھے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ ”اسے اس وقت چھوڑنے کا کون سا وقت تھا۔ الیکشن میں ہمارے لیے مصیبت بنے گا۔“ مسعود محمود آئے تھے اسلم ریاض کے پاس اسلم صاحب نے انہیں جواب دیا تھا کہ ”آپ پہلے آ جاتے اب تو میں اسے رہا کر چکا

ہوں۔" بھٹو صاحب میری رہائی پر بہت ناراض ہوئے۔ آصف جان ہمارے پاس بھی آ جایا کرتے تھے تو ان کے خلاف "اوپر" رپورٹ ہوئی کہ یہ صاحب اپوزیشن میں حبیب جالب سے ملتے جلتے ہیں۔

ایوب خان سے ملاقات

چوہدری جمیل احمد خان گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں اور ہمارے بہت اچھے دوست ہیں۔ اعلیٰ دل ودماغ کے مالک ہیں۔ وہ کنونشن لیگ میں تھے بعد میں وہ نیشنل عوامی پارٹی میں آ گئے تھے۔ جمیل احمد خان نیپ میں رہتے ہوئے بھی ایوب خان سے ملا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایوب خان اقتدار سے معزول ہو چکے تھے۔ ایک دن وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "ایوب خان آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔ "بھائی! کیوں؟" تو انہوں نے کہا کہ "وہ آپ سے وہ تمام نظمیں سننا چاہتے ہیں جو آپ نے ان کے خلاف لکھی ہیں۔" جمیل احمد خان نے یہ بھی بتایا کہ ایوب خان کہتے ہیں کہ "میں جالب صاحب کی آمدورفت کا کرایہ اور دیگر لوازمات بھی پورے کروں گا۔" میں نے جمیل احمد خان سے کہا کہ چوہدری صاحب آپ کی کار ہے اس میں بیٹھ کر چلے جائیں گے اور اپنے ساتھ لوازمات بھی لے جائیں گے۔ ان کو جا کر شعر وغیرہ سنا آئیں گے اور اگر وہ ہم سے کوئی سیاسیات پر یا اپنے عہد پر گفت وشنید کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی کر لیں گے۔ شاید ایوب خان یہ پوچھیں کہ آپ نے اپنی شاعری سے ہمیں گھر میں بٹھا دیا تو ہم انہیں واقعات اور ان کے حقائق بیان کر دیں گے کیونکہ ہم نے تو لوگوں کو ایجوکیٹ کیا ہے۔ عوام کی بات کی ہے اور آج بھی سڑک پہ کھڑے ہیں اور زیر عتاب ہیں۔ ایوب خان معطل ہو کر بھی آرام کے ساتھ گھر میں بیٹھے ہیں جبکہ ہماری جنگ جاری ہے۔ میں ایوب خان سے یہ بھی کہتا کہ شاعری سے کوئی حکومت نہیں بدلتی' آپ کو آپ کے ہی رفیق کار فوجی یحییٰ خان نے نکال باہر کیا تھا کیونکہ صدر ہونے کی اس کی باری آ گئی تھی اور آپ نے جاتے جاتے بھی حکومت عوام کے حوالے کرنا پسند نہیں فرمایا تھا حالانکہ آپ چاہتے تو اس دور کے سپیکر اسمبلی کو حکومت دے جاتے۔ ہم نے جو شاعری لکھی ہے اور جتنی جدوجہد کی ہے وہ عوام کے لیے تھی۔ اس کی پاداش میں ہم سڑکوں پہ کھڑے رہے' وہیں پڑے رہے اور اسے اپنے لیے اعزاز سمجھا ہے۔ ایوب خان سے ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ ان کے ہاں جانا نہ ہو سکا اور پھر اس کی زندگی نے بھی وفا نہ کی ورنہ ہم اسے وہی کچھ کہتے جو اس کے دور اقتدار میں اپنی نظموں اور شاعری کے ذریعے کہا کرتے تھے۔

میری شاعری

میں نے اپنی شاعری میں ہمیشہ معروضی حالات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس میں طنز بھی آ جاتا ہے یا ہلکا سا مزاح بھی ہوتا ہے لیکن میں نے کبھی کسی کے خلاف کوئی مبتذل بات نہیں لکھی۔ کسی کو گالی دینا میں اخلاق سے گری ہوئی بات سمجھتا ہوں۔ کسی سے ہزار اختلاف سہی مگر اس کا طریقہ بھی یہی ہے کہ تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے بات کریں۔ میری تمام شاعری میں ابتذال نہیں اور نہ اخلاق سے گری ہوئی کوئی بات ہوگی۔ یہ میرے نظریہ فن کے سراسر خلاف ہے۔ اس لیے میں نے جن ڈکٹیٹرز کے خلاف لکھا ہے اس میں کوئی گالی نہیں دی' صرف سچ بیان کیا ہے جو انہیں ناگوار گزرا تو یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ ایک دفعہ میں نے سہگلوں کے بارے میں ایک نظم لکھی تھی ان کا ایک خاص نمائندہ عبداللہ میرے پاس آیا اور اس نے وہ نظم سنی اور کہا کہ ''میں نے تو سنا تھا کہ آپ نے اپنی نظم میں کوئی گالی دی ہے حالانکہ اس نظم میں جو لفظ بھی ہے وہ برا نہیں ہے۔'' اس طرح نواب آف کالا باغ بھی جب معطل ہو کر اپنے گاؤں چلے گئے تو ایک دن بیٹھے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا دیے تو ان کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے ان سے پوچھا۔ ''نواب صاحب! کیا یاد آیا؟'' وہ کہنے لگے۔ ''مجھے وہ ایک شاعر حبیب جالب یاد آ گیا' اسے میں نے جیل میں رکھا۔ بہت پکڑ دھکڑ کی۔ اس کی کوئی جائیداد زمین ہوتی تو میں چھین لیتا مگر میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ وہ مسلسل میرے خلاف لکھتا ہی رہا' وہ مجھ سے نہیں ڈرا۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں۔''

بھٹو کی دعوت

شورش کاشمیری ختم نبوت کے سلسلے میں بھٹو صاحب سے ملا کرتے تھے۔ شورش کا ایک منیجر ملک عبدالسلام ہوا کرتا تھا۔ میری ان کے ساتھ بہت پرانی دوستی تھی۔ یوں تو شورش سے بھی ہمارے تعلقات تھے۔ ایک آدھ بار غلط فہمی میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں عبداللہ بٹ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان دونوں کی آپس میں مخالفت تھی۔ بس وہیں تھوڑی سی ناراضگی ہوئی تھی' تو شورش کاشمیری کے دفتر میں ملک عبدالسلام سے ملنے گیا' وہاں ملک صاحب نہ ملے وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ شورش کاشمیری بھٹو کو فون کر رہے تھے۔ وہ ان سے باتیں کرنے لگے اور باتوں کے دوران بھٹو سے کہا کہ ''آپ کا پرانا دوست حبیب جالب بھی میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔'' بھٹو نے اس سے کہا کہ ''وہ تو میرے خلاف نظمیں لکھتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے .... اور فلاں بات کی۔'' اس پر آغا شورش کاشمیری نے کہا کہ ''یہ تو شاعر کی ایک ادا ہوتی ہے۔ ایک پیام ہوتا ہے۔ ایک سلام ہوتا ہے۔ ایک انداز کلام ہوتا ہے۔'' بھٹو نے کہا کہ ''حبیب جالب کو میرا سلام کہو۔ شورش نے مجھے بتایا۔'' بھٹو صاحب آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا۔ ''وعلیکم السلام'' کہہ دیں۔ بھٹو نے کہا کہ ''اسے بھی ساتھ لاؤ' جب میرے ہاں آؤ۔'' شورش کاشمیری نے بھٹو کو جواب دیا کہ ''ٹھیک ہے میں انہیں آپ کا پیغام دے دیتا ہوں۔ یہ NAP کی سنٹرل کمیٹی کے ممبر ہیں اگر وہ آئیں گے تو لیتا آؤں گا۔'' اور ٹیلیفون بند ہو گیا۔ میں نے آغا شورش کاشمیری کا

شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آغا صاحب آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے یہ وعدہ نہیں کر لیا کہ میں جالب کو لے آؤں گا کیونکہ میں ان کے پاس نہیں جانا چاہتا۔ آغا نے کہا۔ "وہ مجھے پہلے بھی تین بار کہہ چکے ہیں کہ "جالب میرے برے وقتوں کا دوست ہے' میں اسے کچھ لینا دینا چاہتا ہوں' لیکن وہ انکار کر کے میری توہین کر دے گا۔" میں نے کہا۔ "آغا صاحب ذوالفقار علی بھٹو صحیح سوچتا ہے۔ میں اس سے کچھ نہیں لوں گا۔" میں نے یہی واقعہ آغا شورش کاشمیری کی برسی پر بھی سنایا تھا تا آنکہ یہ بات ریکارڈ پر آ جائے۔

لاڑکانے چلو

بھٹو دور میں بھی ایوب دور کا ایک واقعہ دہرایا گیا۔ اداکارہ ممتاز سے چلنے کو کہا گیا۔ اسٹوڈیو میں ان لوگوں نے گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ طارق عزیز نے کہا کہ "اگر کوئی حبیب جالب ہوتا تو نیلو کی طرح ممتاز پر بھی نظم لکھتا۔" میں شورش کاشمیری کے ہاں ملک عبدالسلام کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے کسی نے یہ بات بتائی۔ میں نے کہا۔ ملک صاحب ایک نظم نازل ہوئی' کہیں تو سناؤں۔ انہوں نے کہا' سناؤ۔ تو میں نے یہ نظم کہی تھی۔

قصر شاہی سے یہ حکم صادر ہوا لاڑکانے چلو
ورنہ تھانے چلو
اپنے ہونٹوں کی خوشبو لٹانے چلو گیت گانے چلو
ورنہ تھانے چلو
منتظر ہیں تمہارے شکاری وہاں کیف کا ہے سماں
اپنی آنکھوں کا جادو جگانے چلو مسکرانے چلو
ورنہ تھانے چلو
غنچہ و گل کا رنگیں تبسم ہو تم اشک انجم ہو تم
اپنے جلووں سے محفل سجانے چلو مے پلانے چلو
ورنہ تھانے چلو
حاکموں کو بہت تم پسند آئی ہو ذہن پہ چھائی ہو
جسم کی لو سے شمعیں جلانے چلو غم بھلانے چلو
ورنہ تھانے چلو

نیپ(NAP)

نیشنل عوامی پارٹی پنجاب کے بہت اہم لوگ جب پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تو لاہور میں میرے علاوہ شمیم اشرف ملک، حکیم عبدالرحیم اور عزیز صاحب رہ گئے تھے۔ عزیز صاحب پارٹی کے سالار تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی ایک نظریاتی پارٹی تھی۔ اس میں کم ہی لوگ آتے تھے۔ کیونکہ اس کی خارجہ پالیسی بڑی پروگریسو تھی اور اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہمسایہ ممالک خصوصاً بارڈر کے ساتھ والے ملکوں کے ساتھ دوستی استوار کرنا چاہیے۔ ہندوستان سے تمام مسائل کو پرامن انداز سے حل کیا جانا چاہیے۔ امپریلزم یعنی امریکی سامراج کے خلاف سب سے بھرپور آواز نیشنل عوامی پارٹی کی تھی۔ اپنی لائن اور نظریات کی وجہ سے یہ پارٹی حکومتی پارٹی نہیں بن سکتی تھی۔ میرے خیال میں پارٹی کے اصول و نظریات کی وجہ سے یہ پارٹی حکومتی پارٹی نہیں بن سکتی تھی۔ میرے خیال میں پارٹی کے اصول و نظریات ایک محب وطن کے دل کی آواز تھے اس لیے یہ پارٹی بے حد اہم اور ڈیموکریٹک پارٹی تھی، جس سے ہم وابستہ تھے۔ یہ الیکشن میں بھی یقین رکھتی تھی۔ اپنے نظریات کو پھیلانے اپنے اصولوں اور اپنے منشور کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے ہم نے الیکشن بھی لڑا۔ سرحد اور بلوچستان میں NAP ایک بڑی پارٹی تھی اور وہاں اس کا اثر و نفوذ کافی تھا۔ لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ پنجاب میں یہ پارٹی ہمیشہ ہی ڈاؤن رہی ہے۔ پھل پھول نہ سکی۔ اسی لیے لاہور سے ہمارے دوست میاں محمود علی قصوری، رؤف طاہر، شیخ رفیق احمد اور لائلپور، گوجرانوالہ اور پنڈی سے بہت سارے دوست پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔ لیکن ہم اپنی پارٹی میں ہی موجود رہے۔

◆◆◆

دشت وفا میں آبلہ پا

۱۹۷۰ء کے الیکشن میں NAP نے لاہور سے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ مجھے دیا۔ میرے مقابل پیپلز پارٹی تھی جو کہ ایک بڑی پارٹی تھی۔ میں لاہور میں گڑھی شاہو کے علاقے سے الیکشن کے لیے کھڑا ہوا۔ یہ حلقہ مزدوروں اور غریب طبقے کا علاقہ تھا۔ برادری سسٹم بھی تھا۔ بھٹو کی مقبولیت بھی تھی۔ ''جھونپڑی'' ہمارا نشان تھا۔ ہم سارا سارا دن کارنر میٹنگز کرتے رہتے تھے۔ صبح نکلتے اور شام کو واپس آتے تھے۔ ہمارے جلسے بڑے بھرپور ہوا کرتے' لوگ بڑی تعداد میں شرکت کرتے۔ اب ہمارے مقابل تو ہماری ہی پارٹی سے گئے ہوئے لوگ شیخ رفیق احمد' محمود علی قصوری اور رؤف طاہر تھے۔ ہم نے تو کبھی تقریر نہیں کی تھی۔ اس فن سے ناواقف تھے لیکن جب وقت آن پڑا تو ہم نے تقریر بھی کی۔ تمام درپیش مسائل کا ذکر کیا ان کا تجزیہ پیش کیا اس طرح ہماری تقریر بھی رواں ہوگئی۔ جب ہمارا زور بڑھا تو ہمارے چھوٹے چھوٹے جلسے اور کارنر میٹنگز بڑھیں' پھیلیں۔ اب پیپلز پارٹی کے کچھ لوگوں نے ہم سے کہنا شروع کر دیا کہ آپ ہمارے ٹکٹ پر کھڑے ہو جائیں۔ ہم اپنا بندہ بٹھا دیتے ہیں۔ لیکن ہم تو اپنے نظریات کے لیے الیکشن لڑ رہے تھے۔ مرزا ابراہیم جو مزدوروں کا محبوب رہنما تھا انہیں NAP نے قومی اسمبلی کے لیے ٹکٹ دیا تھا میں ان کے جلسوں میں بھی جاتا تھا۔ جب ہمارے کسی جلسے میں پیپلز پارٹی کے لوگ گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے تو میں ان سے کہتا کہ ''اپنے لیڈر سے پوچھو کیا اس نے مجھے اپنی پارٹی کا ٹکٹ پیش نہیں کیا اور میں نے اپنے نظریات کی وجہ سے ان کا ٹکٹ نہیں لیا ہے۔'' میرے ہی شعر اور نظمیں پیپلز پارٹی کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ جب میں بھٹو صاحب کا نام لیتا کہ وہ مجھے ٹکٹ دے رہے تھے اور ان سے پوچھو کہ میں کون آدمی ہوں۔ میرا مرتبہ کیا ہے تو پھر وہ شور تھم جاتا تھا اور میرے جلسے میں گڑبڑ کرنے والے کھسک جاتے تھے۔

ساڑھے سات سو ووٹ

ظاہر ہے کہ ہماری لائن مشکل لائن تھی۔ ہماری پارٹی کے لیڈر ولی خان تھے۔ اخبارات اور حکومتوں نے ولی خان اور ان کے والد باچا خان کے خلاف لوگوں کے دلوں میں زہر بھر دیا تھا۔ یہ پروپیگنڈہ اتنا شدید تھا کہ لوگ اسے ہماری خامی سمجھتے تھے۔ ہم باچا خان کو بھی Defend کرتے تھے۔ ان کی قربانیاں بتاتے تھے کہ انہوں نے انگریز کے خلاف جنگ لڑی' ہٹلر سے جنگ کی۔ تحریک آزادی ہندوستان میں حصہ لیا۔ ہم لاکھ کہتے کہ قائداعظم نے انہیں اپنے ہاں چائے پر بلایا تھا۔ وہاں ان کا Patchup ہو گیا تھا۔

پہلی آئین ساز اسمبلی کے وہ ممبر تھے۔ باچا خان نے پاکستان کے سالمیت اور اس کے ساتھ یکجہتی کا حلف اٹھایا تھا۔ لیکن لوگ نہیں سنتے تھے۔ باچا خان کی کہانی بھی بہت لمبی ہے۔ باچا خان نے قائداعظم سے کہا تھا کہ آپ میرے ہاں آئیں۔ قائداعظم نے اس دعوت کو قبول کر لیا تھا لیکن عبدالقیوم خان اور آئی جی سرحد جو کہ انگریز تھا' انہوں نے قائداعظم کو ایسا جچہ دیا اور کہا۔ "آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔ لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔" تو قائداعظم نہیں جا سکے۔ ان کے انتظار میں بابڑے کے مقام پر جو دور دیہ لوگ کھڑے تھے' ان کو منتشر کرنے کے لیے عبدالقیوم خان نے گولی چلوا دی۔ اس میں سات سو آدمی مارے گئے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ اس حادثے میں خان عبدالولی خان کی پہلی بیوی بھی مر گئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد باچا خان کو جیل میں بہت عرصے تک رکھا گیا۔

ہمیں باچا خان کو بھی Defend کرنا پڑتا تھا۔ میرے حلقے میں کچھ پٹھان بھی رہتے تھے لیکن الیکشن کا نتیجہ ہمارے خلاف نکلا۔ بھٹو کا سحر اتنا تھا کہ ایک حجام جو میری شیو مفت کر دیتا تھا' میں نے اسے پوچھا کہ کیا تم مجھے ووٹ دو گے۔ اس نے جواب دیا تھا کہ "ووٹ تو ہم بھٹو کو دیں گے۔" میں نے کہا کہ بھئی میں تمہاری ترجمانی کرتا ہوں۔ تمہارے گیت گاتا ہوں۔ تمہارے لیے نظمیں لکھتا ہوں۔" کہنے لگا۔ "آپ ترجمانی اچھی کرتے ہیں لیکن ووٹ ہمارا بھٹو کی طرف ہی ہوگا۔" اس حلقے میں فرزند اقبال' جاوید اقبال بھی الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے وہ بھی ہار گئے۔ ہم بھی ہار گئے۔ یہاں گڑھی شاہو میں عزیز صاحب جو لاہور میں ہماری پارٹی کے ساتھ تھے ان کے گھر پر ہی ہمارا ڈیرہ رہتا تھا۔ ہمارا انتخابی دفتر ایک مزدور کی جھونپڑی میں تھا۔ یہی ہمارا نشان بھی تھا۔ ہمارے دل میں ایک پرخلوص لگن تھی کہ ہم ایک بہت عظیم مقصد کے لیے یہ الیکشن لڑ رہے ہیں۔ ایک بڑا انقلابی کام کر رہے ہیں۔ انقلاب کے راستے پر چل رہے ہیں اور ہم ہی لوگوں کے لیے اچھا سوچ سکتے ہیں۔ یہ ہماری سوچ تھی۔ ہمارا احساس تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک مثبت سوچ تھی۔ یہ احساس نہ ہو تو آدمی جی نہیں سکتا۔ ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔ اسی خلوص کے ساتھ ہم سیاست میں شامل رہے اور اس یقین کے ساتھ ہم نے کام کیا کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے لیکن یہ نہ ہو سکا۔ ہم الیکشن ہار گئے لیکن پھر بھی ہمیں پیشکشیں ہوتی رہیں۔ جن کو ہم نے قبول نہیں کیا۔

"آزاد" اخبار میں حمید اختر' عبداللہ ملک' حسین نقی اور آئی اے رحمان تھے۔ انہوں نے لکھا کہ "حبیب جالب کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کو اپنا آدمی کھڑا نہیں کرنا چاہیے اور انہیں سپورٹ کرنا چاہیے تھا۔" لیکن پیپلز پارٹی اس طرح سے کبھی نہیں سوچتی۔ اس کا اپنا ایک مزاج ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ ایک پارلیمانی پارٹی ہے اسے اپنا ہی آدمی جتانا ہوتا ہے۔ جتانا چاہیے تھا۔ انہوں نے ٹھیک کیا لیکن لوگوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ پورے پاکستان میں ٹیلیویژن پر جب انتخابی نتائج پر تبصرہ ہو رہا تھا تو سید محمد تقی اور

دوسرے مبصروں نے افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ''حبیب جالب کا ہارنا بہت تکلیف دہ ہے۔'' اگر الیکشن کے نتائج میرے خلاف تھے تو پورے پاکستان کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ اس سے میں خوش ہوا۔ میں نے جانا کہ میری شکست نہیں ہوئی۔ میں نے نیشنل عوامی پارٹی کا جھنڈا اٹھایا اور اس پرچم کو بلند کرنے کے لیے الیکشن لڑا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ عبدالولی خان نے الیکشن فنڈ میں ہمیں ایک ہزار روپے دیئے اور کہا۔ ''یہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں۔'' میں نے وہ ہزار روپیہ نیشنل عوامی پارٹی کے فنڈ میں جمع کرا دیا تھا کہ ہمارے پاس لاؤڈ سپیکر نہیں ہے وہ خرید لیا جائے۔ اس پر اجمل خٹک نے کہا کہ ''آپ کی باتیں ہمیں بہت پسند ہیں اور آپ انہی باتوں کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ ہمارے ہاں ایسا بہت کم لوگ کیا کرتے ہیں کسی میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا کہ وہ پیسہ پارٹی کو لوٹا دیں۔'' لیکن یہ اس وقت پر ہی منحصر نہیں تھا ہم تو آج تک ایمانداری اور پوری دیانت کے ساتھ اپنے نظریات کے لیے لڑتے آئے ہیں۔

مجھے ساڑھے سات سو ووٹ ملے تھے۔ مجھے وہ ساڑھے سات سو آدمی بہت عظیم لگتے تھے۔ ان میں احمد ندیم قاسمی تھے اور محمد طفیل نقوش کے جو عزیز تھے ان کے بھی ووٹ میرے ساتھ تھے۔ وہ اسی علاقے میں رہتے تھے۔ میں نے کئی بار چاہا کہ حلقہ نمبر 7 گڑھی شاہو لاہور کے ان ساڑھے سات سو آدمیوں کو چائے پر بلاؤں لیکن یہ نہ ہو سکا۔ میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں کہ بھٹو کے طوفان میں ان ساڑھے سات سو آدمیوں نے مجھے ووٹ دینا پسند کیا۔

جب ہم جیل چلے گئے تو ولی خان بھی ساتھ ہی تھے۔ ان کے بعد سردار شیر باز خان مزاری پارٹی کے صدر ہو گئے اور پارٹی کو چلاتے رہے لیکن ولی خان کی موجودگی میں ایک اتحاد ہوا تھا۔ جمہوریت کی بحالی کے لیے اتحاد ہو سکتے ہیں۔ اسی صورت کا یہ اتحاد تھا کہ کسی طور پر یہاں جمہوریت قائم ہو جائے لیکن جمہوریت قائم نہیں ہوئی۔ پھر جب ولی خان بھی جیل سے باہر آ گئے تو ان کی بھی یہی لائن تھی۔ پی این اے اور بھٹو کی گفتگو جاری تھی۔ الیکشن کے لیے Dates فکس ہوتی رہیں لیکن یہ فکس نہیں ہو سکیں۔ بحثوں میں بہت سارا وقت ضائع ہو گیا تھا۔ اس دوران بھی میں جیل گیا تھا۔

لیاقت باغ کا حادثہ

لیاقت باغ پنڈی کا واقعہ یوں تھا کہ اپوزیشن نے ۱۹۷۳ء کے آئین پر دستخط کئے تھے اس کے بارے میں بتانا تھا کہ ہم نے کن مجبوریوں کے تحت یہ دستخط کئے تھے۔ اپوزیشن نے اپنا جلسہ لیاقت باغ راولپنڈی میں رکھا تھا۔ گورنمنٹ نہیں چاہتی تھی کہ یہ جلسہ ہو۔ اس جلسے کو ناکام کرنے کے لیے پیپلز پارٹی کے لوگ بھی وہاں پہنچے۔ میں اس جلسے میں شرکت کرنے کے لیے دو دن پہلے ہی لاہور سے چل پڑا تھا۔ میں لیاقت باغ کے سامنے پارک ہوٹل میں ٹھہرا تھا لیکن رات کو میں وہاں نہیں سویا تھا کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ

یہاں حملہ ہوسکتا ہے۔ میں رات کو لطیف افغانی کے ہاں کمرے کو تالا لگوا کے سویا تھا۔ صبح جب میں اٹھا تو مجھے عباسی ہشت نگری (شاعر) مل گئے۔ میں انہیں ساتھ لے کر پارک ہوٹل اپنے کمرے میں پہنچا۔ وہاں ناشتہ وغیرہ کیا۔ جلسہ ڈھائی بجے دوپہر کو شروع ہونا تھا۔ میں ایک بجے جلسہ گاہ پہنچ گیا۔ وہاں لوگ جمع تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ان میں مشکوک لوگ بھی موجود ہیں۔ میں نے اندازہ کرلیا کہ آج ضرور گڑبڑ ہوگی اور جلسے کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ڈھائی بجے جب اسٹیج سے محمود احمد منٹو نے اعلان کیا کہ ''اب جلسہ شروع کیا جاتا ہے۔'' تو اسٹیج پر تمام اکابرین موجود تھے۔ ان میں پیر پگاڑہ' بزنجو' مفتی محمود' نورانی' ولی خان اور دوسرے لیڈرز تھے۔ چنانچہ جلسہ کا آغاز ہوا لیکن اس آغاز کے ساتھ ہی انہوں نے بھی ''آغاز'' کردیا۔ پہلے گولی چلنے کی آواز آئی اور بم پھٹا اور بھگدڑ مچ گئی۔ میرے سامنے خون میں لت پت لاشیں تھیں۔ قسور گردیزی نے پکارا۔ ''اس آدمی کو پانی پلاؤ یہ بیہوش ہے۔'' ایک پٹھان بولا۔ ''اس کو گولی لگی ہے۔'' ایک پنجابی کو پکڑا گیا۔ میں نے اسے چھڑوایا۔ میں نے ولی خان سے کہا' خان صاحب انہیں کہیں اسے چھوڑ دیں۔ وہ پٹھان کہنے لگا۔ ''اس نے ہمارے بندے مار دیئے ہیں۔'' ولی خان نے اس کو چھڑوایا۔ اسے بلایا اور پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ کہنے لگا۔ ''مجھے لائلپور جیل سے یہاں گڑبڑ کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ میں قتل کے مقدمے میں ملوث ہوں۔'' جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہم نے ضرور سنا تھا یا تاریخ میں پڑھا تھا لیکن لیاقت باغ میں اس کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے تمام لیڈر اپنی جانیں بچا کر وہاں سے نکل پائے۔ ولی خان پچیس آدمیوں کے جنازے لے کر پشاور چلے گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے بڑا خوبصورت رول ادا کیا اور کہا کہ ''انہیں پنجابیوں نے نہیں مارا۔ غنڈے تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ لاہور پنڈی اور پشاور' کسی بھی جگہ غنڈے موجود ہوسکتے ہیں۔ ان کا کسی خاص جگہ سے تعلق نہیں ہوتا۔'' اس طرح ولی خان نے پنجابیوں کے خلاف نفرت کو دبایا۔ اگر وہ چاہتے تو پورے ملک میں آگ لگ سکتی تھی۔ مگر انہوں نے بڑی بردباری اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔

پاکستان کے آئین کو بنانے میں بھی ولی خان کا بڑا Contribution ہے۔ اس موقع پر انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ پاکستان کے دوصوبوں کی چابیاں میرے پاس ہیں اور میں اسمبلی سے باہر بات کروں گا۔ انہوں نے ۱۹۷۳ء کا آئین بنانے میں بھرپور تعاون کیا۔ ان پر جو الزام تھا کہ وہ ''غدار'' ہیں۔ اس داغ کو بھی انہوں نے دھودیا۔

لیاقت باغ میں شامل وہ لوگ میرے ذہن میں موجود ہیں ان میں پیپلز پارٹی کے وزراء شامل تھے۔ جب جلسہ منتشر ہوگیا اور غوث بخش بزنجو رہ گئے تو میں نے میر صاحب سے کہا۔ ''بے تکلفی معاف' آج میں آپ کے ساتھ کار میں بیٹھوں گا کیونکہ میں فی الحال شہید نہیں ہونا چاہتا۔'' انہوں نے اپنے ساتھ جو دو بلوچ تھے انہیں کار سے اتار دیا اور مجھے بٹھالیا۔ جب ہماری کار جلسہ گاہ سے باہر نکلی

تو اس پر پتھراؤ ہوا۔ ہوٹل کے کمرے میں جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں بھی پتھراؤ ہوا کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ یہاں حبیب جالب ٹھہرا ہوا ہے۔ لیکن میں ہوٹل سے نکل آیا تھا۔ کمرے کے شیشے وغیرہ توڑ دیئے گئے تھے۔ میری جان اس دن بزنجو صاحب کی وجہ سے بچی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی ان کی مرہون منت ہے۔ میر صاحب بڑے اعلیٰ آدمی تھے۔ اس واقعہ کے بعد ہم چودھری ظہور الٰہی کے گھر منتقل ہو گئے تھے۔ موت سے کئی بار آنکھیں دو چار ہوئیں اور ہم بچتے رہے۔

جمہوریت

مال روڈ پر ایک دفعہ فوج نے لائن کھینچ دی تھی کہ یہاں سے آگے کوئی نہ جائے ورنہ گولی مار دی جائے گی۔ میں اور حامد سرفراز نے وہ لائن کراس کی اور اپنے سینے فوج کی سنگینوں کے ساتھ جا کر لگا دیئے تھے اور کہا ''ہمیں گولی مارو۔'' پیچھے سے ہمارے اکابرین آ گئے۔ فوج سے گفت وشنید ہونے لگی۔ کمشنر، ڈپٹی کمشنر، آئی جی اور ہوم سیکرٹری بھی پہنچ گئے۔ اگر اس دن وہاں گولی چل جاتی تو بڑا کشت وخون ہوتا۔ یہ پی این اے کی تحریک کا واقعہ ہے۔ کئی بار گولیاں چلتی رہیں اور ہم ان گولیوں کے درمیان اپنا سفر طے کرتے رہے۔ بارہا موت کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قدرت نے جس سے کوئی نہ کوئی کام لینا ہوتا ہے اس لیے وہ آدمی بچ جاتا ہے۔ ہم بھی بچ گئے ورنہ جس صورت حال سے بھی گزرے وہ زندہ رہنے والی نہ تھی۔

ہماری پارٹی کے لوگوں نے نصر اللہ خان کے دفتر سے گرفتاریاں دینی تھیں۔ اس وقت میری بیوی کے بچہ ہونے والا تھا۔ صورت حال ہماری جیسی چلی آ رہی تھی ویسی ہی تھی۔ چونکہ ہم سیاست میں قدم رکھ چکے تھے اس لیے پیچھے تو نہیں ہٹنا تھا۔ میں ان دنوں ضیاء سرحدی کی فلم کے گیت بھی لکھ رہا تھا۔ آئی اے رحمان اس فلم کے رائٹر تھے۔ میں نے یہ گیت جلدی جلدی مکمل کئے اور انہیں کہ پیسے میرے گھر دے دیجئے گا اور میں نکلسن روڈ جا کر نصر اللہ خان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہاں پولیس والے بھاری تعداد میں موجود تھے۔ ہمیں پکڑ لیا گیا اور رات کو تھانے میں لا کر رکھ دیا۔ دو مولوی تھے۔ ایک مولوی شیر محمد اور ایک مولوی سلیم اللہ۔ ان کو پکڑ کے وہ لے گئے۔ ایک کو سی آئی اے میں لے گئے اور اس کے ساتھ بدسلوکی کرتے رہے۔ ایک پیشہ ور عورت کو اس کے ساتھ لٹا دیا اور اس کے ساتھ ننگی تصویریں بنائیں۔ وہ بیچارہ قرآن شریف پڑھتا رہا۔ دوسرے مولوی کو چھانگا مانگا پہنچا دیا گیا۔ نصر اللہ خان کو مظفر گڑھ لے گئے۔ ملک قاسم کو شالی چھاؤنی کے کسی تھانے میں رکھا۔ وہاں ان کو اتنا زدوکوب کیا گیا کہ ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ اب بھی نماز کرسی پر بیٹھ کر ہی پڑھتے ہیں۔ ایک اے ایس آئی نے جو مسلم لیگ قاسم گروپ کا ساتھی تھا مجھے بتایا کہ ''آج کی رات آپ پر بھاری ہے۔ میں نے کہا اچھا دیکھا جائے گا جو ہو گا۔ میں نے دیکھا کہ چودھری اصغر خادم ایڈووکیٹ سول لائن تھانے میں آئے

ہیں تو میں نے سلاخوں میں سے ان کو آواز دی۔ ''چودھری صاحب! چودھری صاحب! آج رات مجھ پر بھاری ہے۔ کل ملک قاسم کے ساتھ بہت برا سلوک ہوا ہے۔ آج مجھے مارا پیٹا جائے گا۔ آپ جا کر ہائیکورٹ میں شور مچا دیں۔'' میری بات کسی پولیس والے نے سن لی تھی۔ مجھے سلاخوں سے پرے ہٹا دیا گیا۔ پانچ بجے شام کو مجھے حوالات سے نکالا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ملک قاسم کراہتے ہوئے برے حال میں آ رہے ہیں۔ میں نے اس وقت سوچا اگر دائیں طرف لے گئے تو شاہی قلعہ جاؤں گا ورنہ جیل لے جائیں گے۔ وہ مجھے مزنگ تھانے میں لے گئے' گرفتار ہونے والوں کو پکڑ کر مختلف جگہوں پر رکھا گیا اور ان پر تشدد کیا گیا تھا' مجھے مزنگ تھانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہاں پہلے سے دو تین حوالاتی موجود تھے۔ حوالات میں بہت گندگی تھی۔ کیڑے مکوڑوں اور کاکروچ کی بھرمار تھی۔ بدبو تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ برا حال ہو گیا۔ میں ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ پاؤں کو کیڑے مکوڑے کاٹنے لگے۔ بڑی مشکل سے جاگ کر رات گزاری۔

پابند سلاسل

صبح پانچ بجے کا عمل ہوگا۔ تھانیدار آیا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ کہنے لگا۔ ''چائے پئیں گے۔'' میں نے پوچھا' چائے اپنی جیب سے پلائے گا یا گورنمنٹ کی طرف سے؟ کہنے لگا۔ ''اپنی جیب سے۔'' میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے' لیکن پہلے یہاں صفائی کراؤ' بہت گندگی ہے۔ دو مشک پانی ڈلواؤ تاکہ یہ گندگی باہر ہو۔'' وہ تھا اچھا۔ اس نے دو مشکیں ڈلوائیں اور حوالات کو صاف کروایا۔ چائے آ گئی۔ اچانک رات والا تھانیدار نمودار ہوا اور اس تھانیدار سے کہا۔ ''نکالو نکالو انہیں یہاں سے۔'' میں نے کہا۔ ''چائے تو پی لینے دو۔'' کہنے لگا۔ ''نہیں نہیں' جلدی چلیں۔'' وہ مجھے دوبارہ سول لائن تھانے میں لے آیا۔ پھر وہ رات والے اکٹھے ہوئے اور مجھے کہا کہ آج کی رات آپ پر بھاری ہے۔ بعد میں انہوں نے مجھے رات کو وہاں سے نکالا۔ میرے ساتھ میرے کپڑے تھے۔ مجھے ڈی ایس پی سول لائن نے کہا کہ ''آپ یہ کپڑے کہاں لے جا رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''جب مجھے جیل ہی جانا ہے تو یہ میرے ساتھ ہی جائیں گے۔'' میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ آج رات مجھ پر بھاری ہے۔ وہ ہم کو چھاؤنی کے علاقے میں ایک مجسٹریٹ کے پاس لے گئے۔ وہاں ملک قاسم نے واویلا کیا کہ ''پولیس والوں نے رات میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا' بہت تشدد کیا ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا' کیا فائدہ بتانے کا' جو ہوا سو ہوا۔ مجسٹریٹ نے بھی سنی ان سنی کر دی تھی۔ پھر پولیس ہمیں اپنی وین میں بٹھا کر کوٹ لکھپت جیل میں لے گئی۔ انہوں نے ہمیں لینے سے انکار کر دیا کہ رات کے آٹھ بج چکے ہیں۔ ہماری ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے۔ اب مجھے وہی بات یاد آ رہی ہے کہ ''آج کی رات مجھ پر بھاری ہے۔'' میں شوگر کا مریض تھا۔ پیشاب کی تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ پولیس کی سلاخوں والی گاڑی میں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ ملک قاسم کہہ رہے تھے کہ ''یہ ہم کو پھر تھانوں میں رکھیں گے اور پٹائی کریں گے۔ یہ

رات اچھی نہیں ہے۔ ہم پر یہ رات بھاری ہے۔'' مجھے تو اے ایس آئی نے بتا ہی دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ملک قاسم کو بتا دوں کہ مجھے ایک اے ایس آئی نے پہلے ہی بتا دیا ہے تو اس کی حالت مزید خراب ہو جائے گی۔ میں نے طے کر لیا کہ ملک قاسم کو اس بارے میں مطلع نہیں کرنا چاہیے اور میں اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا کہ بس ابھی جیل کا دروازہ کھلتا ہے ابھی ہم اندر جائیں گے مگر اندر یہ بحث ہو رہی تھی کہ ہمیں رکھا جائے یا واپس کیا جائے۔ مجسٹریٹ کو فون کیا گیا۔ اس نے جواب دیا کہ ''ہاں میری غلطی تھی جلدی میں کوٹ لکھپت جیل لکھ دیا۔ اس کے کہنے پر ہمیں اندر جانے کی اجازت ہوئی۔''

ہم جیل میں چلے گئے۔ مجھے سخت پیشاب آ رہا تھا۔ جیلر کہنے لگا۔ ''یہ آپ کس مقدمے میں آ گئے ہیں اس کی تو کل ضمانت ہو جائے گی۔'' میں نے کہا کہ ہم ضمانت نہیں کرائیں گے اور پیشاب کرنے چلا گیا۔ جیل میں ہمیں پاگلوں والی کوٹھڑیوں میں رکھا گیا تھا۔ میں اور ملک قاسم ایک ہی کوٹھڑی میں تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ میرے ساتھ پولیس نے بہت برا سلوک کیا۔ ''انہوں نے میری بہت پٹائی کی مجھے لٹا کر میری کمر پر کودتے رہے۔'' میں نے پوچھا کہ اور تو کوئی بات نہیں ہوئی؟ کہنے لگے۔ ''اور بھی کوئی بات ہوتی تو بتا دیتا۔'' اس رات میرے پیٹ میں شدید درد ہوا۔ ملک قاسم اپنی تکلیف بھول کر مجھے دباتے رہے۔ رات کو ہی ڈاکٹر کا کمرہ کھلوایا گیا اور اس نے مجھے انجکشن دیا تو کچھ افاقہ ہوا۔ میں نے چودھری اصغر خادم کو جو بتایا تھا کہ آج کی رات بھاری ہے جا کر بتا دو تو یہ ایک طریقہ ہوتا ہے خبردار کرنے کا۔ انہوں نے کون سا جلوس نکال کر لے آنا تھا یا باہر آ کر احتجاج کرتے۔ بس ذرا پولیس والوں کو چوکنا کرنا تھا تاکہ وہ کوئی برا سلوک نہ کریں۔ یہ بھٹو دور کا واقعہ ہے۔

مکمل جمہوریت جسے کہتے ہیں وہ تو آج تک نہیں آئی۔ اب تک تو وہ ایک خواب ہی ہے اس کی تعبیر ہمیں میسر نہیں ہوئی۔ بھٹو کے عہد میں پی این اے کی تحریک چلی۔ نئے سرے سے ہونے والے الیکشن کی تاریخ کا مسئلہ بنتا بگڑتا رہا اور یہ مرحلہ لیٹ ہوتا چلا گیا۔ اتنا لیٹ ہو گیا کہ فوج آ گئی۔ اب اگر سیاست دان چاہتے کہ مسئلہ سیاسی طور پر ہی حل ہو جائے اور فوج نہ آئے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا مگر پتہ نہیں کون سے عناصر کارفرما تھے جو یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہاں جمہوریت قائم ہو۔ جنرل ضیاء الحق جنہیں بھٹو نے ترقی دے کر کمانڈر انچیف بنا دیا تھا۔ وہ تشریف لے آئے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں نوے دن کا وعدہ کر لیا کہ الیکشن نوے دن کے اندر ہو جائیں گے لیکن وہ نوے دن گیارہ سال تک پھیل گئے۔ ہماری مصیبت شروع ہو گئی۔ وہی راستے' وہی منزل اور جمہوریت کی بحالی کے لیے تگ و دو کا آغاز کر دیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق قرآن شریف کی آیتیں پڑھ کر اپنی بات شروع کرتا تھا۔ ایک مذہبی فضا بناتا تھا۔ لوگ اس سے متاثر ہو گئے کہ یہ سچ بول رہا ہے۔ الیکشن نوے دن میں ہوں گے۔ لیکن الیکشن ہو نہیں سکے۔

◆◆◆

کوڑے زنداں ظلمت اور ضیاء

جنرل ضیاء الحق کا زمانہ آتا ہے۔ ایک تاریک دور شروع ہوتا ہے۔ ایک بھیانک شب کا آغاز۔ ضیاء الحق نے نوے دن کے وعدے کے بعد یہ کہا تھا کہ "پہلے احتساب ہوگا پھر انتخاب۔" اب ولی خان کا خیال تھا کہ احتساب تو ان کا ہی ہوگا جن کا ہونا ہے ہمارا اگر احتساب ہونا ہے تو ہو جائے۔ میں ولی خان سے متفق نہیں تھا۔ سیدہ عابدہ حسین بھی میرے گھر آئیں اور کہا کہ "ولی خان چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ پنجاب کا دورہ کریں۔" میں نے کہا کہ محترمہ وہ احتساب کی باتیں کریں اور ہم صرف انتخاب کی بات کریں گے تو یہ تضاد پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے ہم نہیں گئے کیونکہ ہماری پارٹی کے جو لوگ تھے بڑے عجیب لوگ تھے۔ جب الیکشن ہوتا تو وہ منتخب ہو جاتے اور جب جیل جانا ہوتا تھا تو مجھے بھیج دیتے تھے۔ میں ان سے خوش تھا نہ مجھے ان کی لائن سے اتفاق تھا۔

ہم نے پھر "عوامی جمہوری اتحاد" بنایا۔ یہ اتحاد ترقی پسند پارٹیوں سے مل کر بنایا تھا۔ اس اتحاد کے صدر افضل بنگش ہو گئے تھے۔ سیکرٹری جنرل عابد حسن منٹو تھے اور میں پنجاب کا صدر تھا۔ ہمارا یقین ہے کہ انتخاب جمہوری عمل کو آگے بڑھانے کا ذریعہ ہوتے ہیں انہیں ہر صورت میں ہونا چاہیے اور لوگوں کو آزادی کے ساتھ اپنے ووٹ کے حق کا استعمال کرنے کی اجازت ملنی چاہیے۔

بھٹو کی پھانسی

بھٹو کی جب ضمانت ہو گئی اور اس پر مقدمہ چلتا رہا تو اس بارے بھی ہماری یہی رائے تھی کہ بھٹو کو پھانسی نہ دی جائے بلکہ ان کو چھوڑ دیا جائے یا پھر قید میں بدل دیا جائے حالانکہ بھٹو نے ہم کو اندر کیا تھا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ بھٹو کو پھانسی ہو مگر ضیاء الحق نے بھٹو کو پھانسی دے دی۔ ہمارا بھٹو سے جھگڑا سیاسی تھا۔ ہم اسے سیاسی طور پر شکست دینا چاہتے تھے۔ بھٹو کو پھانسی ہوئی۔ ہم نے افسوس کیا کیونکہ ہم یہ سب نہیں چاہتے تھے۔ بھٹو کی برسی پر میں نے یہ نظم لکھی تھی۔

ہاتھ کس کا پس عدالت تھا
دار پہ کس نے اس کو کھچوایا
ایک ہی مجرم زمانہ ہے
اس پہ الزام تک نہیں آیا

یوں بھی ہوتا ہے خوں بہا لے کر
بخش دیتے ہیں لوگ قاتل کو
دیکھ کر راستے میں چھاؤں گھنی
بھول جاتے ہیں اپنی منزل کو

ہم بھٹو کو آب حیات پلا دینا چاہتے تھے۔ ہم اسے یہی کہتے رہے کہ اس سسٹم کے اندر اور اس خارجہ پالیسی کے تحت تم لوگوں کو ''روٹی کپڑا اور مکان'' نہیں دے سکتے۔ اسے ہماری بات سچ نہیں لگی لہٰذا ہم نے اس کی مار کھائی تھی لیکن جو کچھ بھی اس کے ساتھ ہوا۔ وہ ہم نہیں چاہتے تھے۔ ان کی اپنی غلطیاں تھیں۔ وہ وکلاء سے بڑے پر امید تھے۔ نواب احمد خان کا مقدمہ قتل ہی کیا تھا۔ جس کی ایف آئی آر مسعود محمود کے کہنے پر سیل کر دی گئی تھی اگر اس وقت مقدمہ چلا کے قصوروار لوگوں کو سزا دے دی جاتی اور گورنر بھی معاف کر سکتا تھا لیکن یہ انہوں نے نہیں ہونے دیا تو بھٹو کے ساتھیوں نے ان سے یہ غلطیاں کروائیں۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک ماڈرن آدمی تھا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس کے خیالات و نظریات بے حد ماڈرن تھے لیکن اس نے بھی ''مولویوں'' کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ پی این اے کی تحریک چل رہی تھی جو بھٹو نے فوری طور پر شراب پر پابندی عائد کر دی اور اس طرح کے دوسرے اقدامات کر کے مولویوں کو خوش کرنا چاہا' حالانکہ وہ خود پیتا تھا جس کا اعتراف اس نے ایک جلسے میں بھی کیا تھا اور جس پر بڑا شدید ردعمل بھی ہوا تھا۔ انسان جیسا ہے اسے ویسا ہی رہنا چاہیے۔ اپنے اندر اس قسم کا مضحکہ خیز تضاد پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ شراب پر پابندی لگانے کے باوجود اس کی حکومت پھر بھی نہ بچ سکی تھی اور وہ خود بھی نہ بچ سکا تھا۔ شاید اسے شراب کی ''بددعا'' لگی تھی کیونکہ شام ڈھلتے ہی ''جیالوں'' میں جو ایک پھرتی سی اور چمک آ جاتی تھی وہ اس پابندی لگنے سے ختم ہو گئی۔ میں نے بھٹو کی طرف سے شراب پر پابندی کے بارے میں کہا تھا کہ

بہت کم ظرف تھا جو محفلوں کو کر گیا ویراں
نہ پوچھو حال یاراں شام کو جب سائے ڈھلتے ہیں

دوسرے شعر کچھ یوں ہیں۔

کہاں قاتل بدلتے ہیں' فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے' فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں

وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک بھی پہنچتی ہے
نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں
کہاں تک دوستوں کی بیدلی کا ہم کریں ماتم
چلو اس بار بھی ہم ہی سر مقتل نکلتے ہیں

ضیاء الحق کے آتے ہی ہم نے بھٹو کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ ہمیں تو ضیاء الحق جیسے خوفناک فوجی آمر کو ختم کرنے اور اسے ہٹانے کا جنون ہو گیا تھا۔ ہماری توجہ اس مقصد پر مرکوز ہو گئی تھی۔ اس وقت ''سیاسی مسافر'' قسم کے لوگ جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ہو گئے جو ہر آنے والے کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اس کو وقت ملتا گیا اور اس نے بہانہ بنا لیا کہ اس وقت الیکشن کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں۔ ملک میں خانہ جنگی کی فضا ہے۔ یہ اس کے بہانے تھے جو وہ بناتا رہا۔ وقت ٹالتا رہا۔ پھر اس کو ایک بڑا بہانہ مل گیا۔ جب پی آئی اے کے جہاز کو اغواء کر کے کابل اتار لیا گیا تھا۔ اس پر جنرل ضیاء الحق نے بہت جھوٹ بھی بولے اور اپنے اقتدار کو تقویت دی۔ مخالفت کرنے والوں کو بری طرح کچلا گیا۔ جہاز کے اغواء میں بھٹو کا لڑکا ملوث تھا' ہو گیا یا کیا گیا۔ یہ ایک سربستہ راز ہے کہ اغواء کس نے کرایا تھا؟

ابلیس نما انسان

اجمل خٹک کے ایک انٹرویو میں آیا ہے کہ ''مرتضیٰ بھٹو کو کہا گیا تھا کہ اون کرتا ہے ورنہ اس کا یہ کام نہیں تھا۔'' بہرکیف ضیاء الحق کو ایک بہانہ مل گیا تھا حکومت کرنے کا۔ مخالفین کو اندر کرنے کا اور جمہوری عمل کو روکنے کا۔ اس زمانے میں کراچی پریس کلب نے مجھے لائف ممبر شپ دی تھی۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ ''آپ آئیں اور کوئی تازہ نظم لکھ کر لائیں۔'' میں نے یہ نظم لکھی تھی۔

بندے کو خدا کیا لکھنا

ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر' دیوار کو در' کرگس کو ہما کیا لکھنا

اک حشر بپا ہے گھر گھر میں دم گھٹتا ہے گنبد بے در میں
اک شخص کے ہاتھوں مدت سے رسوا ہے وطن دنیا بھر میں

اے دیدہ ورو اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا' صرصر کو صبا' بندے کو خدا کیا لکھنا

یہ اہل حشم' یہ دارا و جم' سب نقش بر آب ہی اے ہمدم
مٹ جائیں گے سب پروردۂ شب اہل رہ جائیں گے ہم
ہو جاں کا زیاں پر قاتل کو معصوم ادا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا' صرصر کو صبا' بندے کو خدا کیا لکھنا

لوگوں پہ ہی ہم نے جاں واری' کی ہم نے انہی کی غم خواری
ہوتے ہیں تو ہوں یہ ہاتھ قلم شاعر نہ بنیں گے درباری
ابلیس نما انسانوں کی اے دوست ثنا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا' صرصر کو صبا' بندے کو خدا کیا لکھنا

حق بات پہ کوڑے اور زنداں' باطل کے شکنجے میں ہے یہ جاں
انساں ہیں کہ سہمے بیٹھے ہیں خونخوار درندے ہیں رقصاں
اس ظلم و ستم کو لطف و کرم اس دکھ کو دوا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا' صرصر کو صبا' بندے کو خدا کیا لکھنا

ہر شام یہاں شام ویراں آسیب زدہ رستے گلیاں
جس شہر کی دھن میں نکلے تھے وہ شہر دل برباد کہاں
صحرا کو چمن' بن کو گلشن' بادل کو ردا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا' صرصر کو صبا' بندے کو خدا کیا لکھنا

اے میرے وطن کے فنکارو! ظلمت پہ نہ اپنا فن وارو

یہ محل سراؤں کے باسی قاتل ہیں سبھی اپنے یارو
ورثے میں ہمیں یہ غم ہے ملا اس غم کو نیا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیاء صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

اور ایک قطعہ یہ بھی سنایا۔

وہ کہہ رہے ہیں محبت نہیں وطن سے مجھے
سکھا رہے ہیں محبت مشین گن سے مجھے
میں بے شعور ہوں کہتا نہیں ستم کو کرم
یہی خطاب ملا ان کی انجمن سے مجھے

ضیاء الحق کے کارندوں نے سب سیاسی لوگوں کو پکڑ لیا۔ عوامی جمہوری اتحاد والوں کو بھی اور پی پی والوں کو بھی حراست میں لے لیا۔ ایم آر ڈی بن چکی تھی۔ میاں محمود علی قصوری، ان کے لڑکے، فلمی ایکٹر محمد علی، فیض صاحب کے داماد شعیب ہاشمی، سوشلسٹ پارٹی کے سی آر اسلم، ان سب کو کوٹ لکھپت جیل بھیج دیا گیا۔ پولیس میری گرفتاری کے آرڈر لے کر گھر آئی تو میں گھر پر نہیں تھا۔ وہ میرے لڑکے کو لے جانے لگے تو میری بیوی نے مزاحمت کی اور اسے نہیں جانے دیا۔ پولیس والے کہہ گئے۔ ''جالب صاحب آئیں تو انہیں تھانے بھیج دیں۔'' میں صبح گھر آ گیا تو مجھے پتہ چلا۔ میں نے سوچا اب یہی بہتر ہے کہ خود ہی تھانے چلا جاؤں۔ میں تھانے خود ہی پہنچ گیا۔ تھانے والوں نے مجھے بٹھا لیا اور کہا۔ ''صاحب! بات یہ ہے کہ آپ تو فوج کو مطلوب ہیں۔ ہماری طرف سے تو آپ جا سکتے ہیں۔'' میں نے سوچا میں کیوں جاؤں۔ مجھے نہیں جانا چاہیے۔ چلا گیا تو کوئی اور کیس بنا دیں گے۔ میں وہیں رہا۔ رات ہو گئی۔ انہوں نے بستر بچھا دیا۔ میں لیٹ گیا۔ تقریباً ڈیڑھ بجے وہ مجھے کوٹ لکھپت جیل لے گئے۔ وہاں تقریباً سبھی لوگ موجود تھے۔ باقی آہستہ آہستہ آتے گئے۔ نصر اللہ بہاولپور میں نظر بند تھے۔ پنجاب کے دوست مختلف جیلوں میں بند تھے۔ یہاں بھی ملاقات کے وقت سی آئی ڈی والے موجود ہوتے تھے۔ ایسے ہی ہم کسی کا نام نہیں لیتے تھے۔ اشاروں کنایوں میں گفتگو کرتے تھے کہ ''بھئی فلاں سے قرض لے آؤ۔'' کسی کا نام لینے سے وہ بھی پھنس سکتا تھا۔ بے حد مشکل زندگی تھی۔ بچے بے آسرا تھے اور میں جیل میں تھا۔ میری بیوی مجھ سے ملاقات کے لیے آئی تھی۔ میں نے کوٹ لکھپت جیل میں یہ غزل لکھی تھی۔

جو ہو نہ سکی بات وہ چہروں سے عیاں تھی

حالات کا ماتم تھا ملاقات کہاں تھی
اس نے نہ ٹھہرنے دیا پہروں مرے دل کو
جو تیری نگاہوں میں شکایت مری جاں تھی
گھر میں بھی کہاں چین سے سوئے تھے کبھی ہم
جو رات ہے زنداں میں وہی رات وہاں تھی
یکساں ہیں مری جان قفس اور نشیمن
انسان کی توقیر یہاں ہے نہ وہاں تھی
شاہوں سے جو کچھ ربط نہ قائم ہوا اپنا
عادت کا بھی کچھ جبر تھا کچھ اپنی زباں تھی
صیاد نے یونہی تو قفس میں نہیں ڈالا
مشہور گلستاں میں بہت میری فغاں تھی
تو ایک حقیقت ہے مری جاں مری ہمدم
جو تھی مری غزلوں میں وہ اک وہم و گماں تھی
محسوس کیا میں نے ترے غم سے غم دہر
ورنہ مرے اشعار میں یہ بات کہاں تھی

میری کتاب ''سرمقتل'' ایوب خان کے دور میں ضبط ہوئی تھی۔ضیاء الحق کے عہد میں میری ایک اور شاعری کی کتاب ''گنبد بے در'' ضبط ہوگئی تھی۔ یہ عالم تھا کہ ہر طرف خاموشی تھی۔ ہماری آواز باہر تک نہیں جاتی تھی۔ضیاء کا دور بہت خوفناک دور تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم ساری زندگی جیل میں ہی لڑتے رہیں گے۔ پھر معافی ناموں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔''باؤنڈ سسٹم'' کے تحت۔اس کے خلاف میں نے ایک نظم لکھ دی۔

دوستو جگ ہنسائی نہ مانگو
موت مانگو رہائی نہ مانگو

عمر بھر سر جھکائے پھرو گے
سب سے نظریں بچائے پھرو گے
مل رہا جو بار ندامت
دل پہ کیسے اٹھائے پھرو گے
اپنے حق میں برائی نہ مانگو
موت مانگو رہائی نہ مانگو

ہم ہیں جن کے ستم کا نشانہ
مت کہو ان سے غم کا افسانہ
پھر کہاں جمگھٹا یہ میسر
بن گیا ہے قفس آشیانہ
اب قفس سے جدائی نہ مانگو
موت مانگو رہائی نہ مانگو

رات سے روشنی مانگنا کیا
موت سے زندگی مانگنا کیا
ظلم کی ظلمتوں سے مری جاں
جوت انصاف کی مانگنا کیا
غاصبوں سے بھلائی نہ مانگو
موت مانگو رہائی نہ مانگو

یہ نظم جیل سے باہر گئی۔ اس کی سزا مجھے یہ دی گئی کہ مجھے میانوالی جیل بھیج دیا گیا اور وہاں پھانسی کی کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔

میانوالی جیل

بڑی بھیانک جیل تھی۔ وہاں بعد میں راؤ رشید' چودھری اصغر خادم' امین مغل اور دوسرے لوگ بھی آ گئے تھے۔ شدید گرمی کا موسم تھا۔ ہم بنیان اور جانگیا پہنے سلاخوں سے لگ کر ہوا کے ایک جھونکے کے منتظر ہوتے تھے۔ ہمارے سامنے دیوار تھی۔ جس کے ساتھ چھت ملی ہوئی تھی اور چھوٹے چھوٹے روشن دان بہت اوپر تھے۔ پنکھے کو ہوا لگتی تو کچھ ٹھنڈی ہوا آتی۔ لیکن پنکھا مسلسل گرم ہوا پھینکتا اس لیے اسے بند کرنا پڑتا تھا۔ شدید تپش اور برا حال۔ سانس لینا بھی دوبھر ہوتا تھا۔

ایک دفعہ ہم جیل کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹا سا صحن تھا۔ اس میں تھوڑی چھاؤں تھی۔ وہاں اسسٹنٹ جیلر آ گیا اور ہمیں دیکھ کر کہا کہ "جالب صاحب یہاں بڑے بڑوں کے کپڑے اتر جاتے ہیں۔" اس نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا کیونکہ ہم بنیان اور جانگیا پہنے ہوئے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ "یہ بھی آپ کا حسن نظر ہے۔" وہ پھر کچھ دن ہم سے ملنے نہیں آیا۔ اسی دوران مجھے ڈپٹی جیلر نے کہا کہ "یہاں تو خاصی گرمی ہے پتہ نہیں آپ لوگ کیسے رات گزارتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔ میں آپ کو پانچ روپے دوں گا۔ آپ مجھے یہاں ایک رات گزار کر دکھا دیں۔ اس نے کہا۔ "ہمارے اعلیٰ افسران آپ کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں اور آپ کا پوچھتے رہتے ہیں۔ ہوم سیکرٹری اور ڈی سی بھی آپ کو جانتے ہیں۔" میں نے کہا کہ میں کوئی اسمگلر تو نہیں ایک شاعر ہوں۔ جیل کا میڈیکل آفیسر ایک دن آیا' اپنے بچے کو بھی ساتھ لایا تھا۔ کہنے لگا کہ میرے بچے نے کہا ہے جالب صاحب سے ملنا ہے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ بھائی کوئی "کیف آور" چیز پلا دو' طبیعت بہت بوجھل رہتی ہے۔ اس نے کہا کہ "آپ کو دوا کے طور پر مکسچر ہی دے سکتے ہیں تا آنکہ آپ کو رات نیند آ سکے۔" وہ بہت عزت کرنے لگا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے خواہ مخواہ ایک شاعر کو پکڑا ہوا ہے جس نے کوئی ہوائی جہاز تو اغوا نہیں کیا صرف شاعری ہی کرتا ہے۔ ایک دن جیلر نے کہا کہ "آپ کو شاعری نہیں کرنے دی جائے گی نہ ہی آپ کو کاغذ قلم کی سہولت دی جائے گی۔" میں نے کہا۔ "نہ دینا" میں تو بڑی سادہ چیزیں کہتا ہوں سادہ سادہ الفاظ میں۔ آپ کو یہ جو سپاہی ہے رات کو اس کے کان میں سناؤں گا۔ صبح وہ سارے شہر میں عام ہو جائے گی۔ وہ کہنے لگا۔ "میری آپ کے ساتھ لائل پور سے واقفیت ہے۔" میں نے جواب دیا۔ میں آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ ٹھیک ہے آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ آپ نے اپنا کام کر دیا اور ہم اپنا کام جاری رکھیں گے۔ میں نے وہاں ایک یہ غزل لکھی تھی۔

بکھیری زلف جب کالی گھٹا نے
نظر میں پھر گئے بیتے زمانے
جنوں کچھ اور بھی نکھرا ہمارا

بگاڑا کچھ نہ صحرا کو ہوا نے
میانوالی میں قید کرکے مجھ کو
بہت احساں کیا اہل جفا نے
ہوا اس شہر میں محروم پیدا
لکھے اس نے یہاں دل کے فسانے
بنایا شہر جاں ریگ رواں کو
محبت سے محبت آشنا نے
مجھے ملتے دکھائی دے رہے ہیں
یہ زنداں اور یہ مقتل پرانے
گریں گی نفرتوں کی سب فصیلیں
یہاں گونجیں گے الفت کے ترانے
میانوالی مرا لاہور میرا
مجھے لگتے ہیں منظر سہانے
قفس میں مر چلے تھے ہم تو جالب
بچایا ہم کو آواز نا نے

ڈپٹی جیلر نے کہا کہ ”ساتھ والا جو کمرہ ہے اس میں پنڈت جواہر لال نہرو، مجیب الرحمن اور ذوالفقار علی بھٹو رہے ہیں۔ اس میں آپ لوگوں کو منتقل کر دیا جائے تو کیسا رہے گا۔“ اس کمرے میں ایک غسل خانہ بھی بنا ہوا تھا۔ باہر ایک جنگلہ اور برآمدہ تھا۔ وہاں تین آدمی رہ سکتے تھے۔ دو ایک کارنر میں اور ایک دوسرے کارنر میں۔ میں نے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور کہا ہم بہتر صورت حال میں منتقل ہو جائیں گے اور انکار نہ کرنا اور نہ ہی پوچھنا کہ یہ انتظام کیسے ہوا۔ کوئی اچھی حالت کے بارے میں سوچے تو یہ مان لینا چاہیے۔ انہوں نے میری بات مان لی اور ہم وہاں منتقل ہو گئے۔ راؤ رشید، امین مغل اور جہانگیر بدر کو اندر ڈال دیا، میں اور چوہدری اصغر خادم برآمدے میں پڑ گئے۔

پتے اچھے آئے ہیں

وہاں شفقت اللہ شاہ انسپکٹر جیل خانہ جات آئے۔ میں نے کہا' دیکھ لیجئے کیا حالت ہے۔ یہاں گرد آتی ہے' میری چار پائی پر بارش پڑتی ہے۔ آپ اگر آئے ہیں تو یہاں پنکھا لگوا دیں' چقیں ڈلوائیں۔ جیلر نے کہا' پیسے نہیں ہیں۔ میں نے آئی جی سے کہا' دیکھیں وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ نہیں ہوگا۔ آئی جی نے جیلر سے کہا' "یہ سب لگوا دیں اور مجھے بارہ بجے تک رپورٹ کریں۔" چنانچہ چقیں اور پنکھا لگ گیا۔ میں' راؤ رشید اور چوہدری اصغر خادم تاش وغیرہ کھیلا کرتے تھے۔ ہم کھیل رہے تھے کہ اسسٹنٹ جیلر آیا اس نے سلام کیا۔ جہانگیر بدر بولا۔ "بھئی صرف سلام کرو گے یا کوئی کام کی بات بھی کرو گے۔ رہائی وغیرہ کے بارے میں کچھ خبر ہے؟" اس نے کہا کہ "حبیب جالب اور راؤ رشید کی رہائی کا حکم آیا ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا' وہ مشروط ہے یا غیر مشروط۔ اگر مشروط ہے تو واپس چلے جاؤ کیونکہ اس وقت پتے بڑے اچھے آئے ہیں۔ یہاں میں راؤ رشید کی تعریف کروں گا کہ راؤ رشید کے پاس بھی معافی نامے کا بانڈ آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "یہ کیا ہے؟ میں اس کا کیا کروں؟" میں نے اس سے کہا کہ آپ بیورو کریٹ اور آئی جی رہ چکے ہیں۔ آپ چلے جائیں معافی مانگ کر۔" انہوں نے مجھے کہا۔ "پھر وہ نظم کیوں کہی تھی...... دوستو موت مانگو رہائی نہ مانگو" میں نے اس کو گلے سے لپٹا لیا۔ میں نے کہا کہ راؤ رشید تم ایک بہادر آدمی ہو۔ اس نے معافی نہیں مانگی تھی۔ بہت سارے لوگ ضیاء الحق سے معافی مانگ کر رہا ہوئے تھے۔ بعد میں وہ ایم پی اے' ایم این ہو گئے۔ ان میں پیپلز پارٹی کے بہت سارے لوگ بھی شامل تھے۔ میں نے نہ تو ایم این اے ہونا تھا نہ ایم پی اے۔ ہمارا تو اصولی معاملہ تھا کہ ہم جیل آ گئے ہیں پھر معافی کا کیا مطلب؟ انہوں نے ہمیں غیر مشروط طور پر چھوڑ دیا۔ ہم اگلی صبح گھر پہنچ گئے۔ پتہ نہیں وہ عید کا دن تھا یا ۱۴ اگست کا تھا۔

ضیاء الحق کے عہد میں جو شاعری کی کتاب لکھی اس کا میں نے پہلے "ضبط" نام رکھا تھا کیونکہ اسے چھپتے ہی Ban ہونا تھا اور وہ ہو گئی۔

◆◆◆

چاروں جانب سناٹا

خواتین نے آدھی گواہی کے خلاف ایک احتجاجی جلوس نکالا تھا' جسے ہال روڈ پر روک لیا گیا۔ اس وقت ہائیکورٹ کے چیف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال تھے۔ خواتین نے انہیں ایک یادداشت پیش کرنا تھی اور وہ ہائیکورٹ آنا چاہتی تھیں لیکن انہیں ہال روڈ پر روک لیا گیا تھا۔ پولیس نے گھیرا ڈال لیا تھا اور وہ خواتین وہیں دھرنا مار کر بیٹھ گئی تھیں۔ عاصمہ جہانگیر ہائیکورٹ آئیں۔ اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا۔ عابد حسن منٹو سید افضل حیدر اور اعتزاز احسن بھی میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ عاصمہ جہانگیر نے صورت حال سے آگاہ کیا اور یہ Suggest کیا کہ ''حبیب جالب کو ہمارے ساتھ بھیج دیں اور یہ ہمیں وہاں اپنا کلام سنا کر منتشر کر دیں گے اور یوں ہماری عزت بھی رہ جائے گی یعنی بات بنی رہ جائے گی کیونکہ پولیس آگے آنے سے روک رہی ہے۔'' میں ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ اب جب کار اسٹارٹ ہوئی تو ایک لہر میرے ذہن میں آئی کہ یہ جلوس اگر نہ نکلا تو احتجاج رک جائے گا اور وہ بے اثر جائے گا۔ میں نے سوچا کہ اب میں جلسوں' جلوسوں کو منتشر کرنے کے لیے رہ گیا ہوں؟ میرا کام تو جلوس کو اور Movement کو جاری رکھنے کا ہے۔ یہی میرا فریضہ ہے کہ احتجاج کا عمل جاری رہے۔

بیچ سڑک کے بیچ

میں وہاں پہنچ گیا جہاں خواتین دھرنا مار کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک مختصر سی تقریر کی اس کے بعد خواتین کے بارے کچھ نظمیں سنانا شروع کیں۔ جب میں سنا رہا تھا تو ان کے چہروں پر جیسے خوشی کی چمک تھی۔ ایک حوصلہ ان کے چہروں سے جھلک رہا تھا' اور میرا کلام سنانے کا مقصد ان کے حوصلے بڑھانا ہی تھا۔ اس دوران ایک ایس ایچ او آیا اور اس نے کہا۔ ''جالب صاحب ادھر آیئے ذرا ہماری بات سنئے۔'' خواتین نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''اس کی بات مت سنئے۔'' میں نے کہا۔ ''نہیں کوئی بات نہیں' میں اسے کیمپ جیل سے جانتا ہوں۔ اگر یہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو سن لینی چاہیے۔'' میں اس کے پاس گیا اور پوچھا۔ ہاں فرمایئے؟ کہنے لگا۔ ''ان خواتین کو وین میں بٹھا کر ہائیکورٹ لے چلتے ہیں۔'' میں نے کہا کہ ''آخر پولیس والے ہی نکلے نا' میں جانتا ہوں کہ تم ان کو بٹھا کر سول لائنز تھانے لے جاؤ گے اور اب ہٹ جاؤ تم۔'' میں پھر اسی دائرے میں آ گیا جہاں خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے پھر نظمیں سنانا شروع کیں' تمام خواتین جوش و خروش کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور کہا۔ ''ہٹو پولیس والو

چلو بیٹو" میں نے ان کا رخ مال روڈ کی طرف موڑ دیا۔ وہ ہائیکورٹ کی طرف جا رہی تھیں کہ پولیس نے انہیں پھر روک لیا اور زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ میں نے یہ صورت حال دیکھی تو وہاں کھڑے ایک ڈی ایس پی سے کہا کہ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہٹاؤ ان پولیس والوں کو" میرا یہ کہنا تھا کہ اس نے ایک انسپکٹر کو اشارہ کیا اور کہا۔ "پکڑ لو اس حبیب جالب کو" اس انسپکٹر نے مجھے پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ چوہڑ کانے کے پندرہ بیس پولیس والے تھے (مجھے کسی نے بتایا تھا کہ زیادہ تر پولیس والے چوہڑ کانے سے تعلق رکھتے ہیں) اب انہوں نے مجھے مارنا شروع کیا۔ بوٹوں سے پنڈلیوں پر ضربات لگا رہے تھے اور ڈنڈے میری پیٹھ پر برسا رہے تھے۔ میرا گریبان اس انسپکٹر نے پکڑا ہوا تھا۔ میری واسکٹ کے اوپر والے بٹن بند تھے تو میرا گلا اس کی مضبوط گرفت میں تھا۔ میری آنکھیں باہر آ رہی تھیں اور اندھیرا میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ موت میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ میری حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ وسیم چوہدری جو ہائیکورٹ بار کے سیکرٹری جنرل تھے' انہوں نے مجھے دیکھا اور انسپکٹر کی گرفت سے چھڑایا۔ میں نے اسے اشارے سے کہا کہ میری واسکٹ کے بٹن توڑ دو۔ اس نے واسکٹ کھول دی اور میرا سانس بحال ہوا۔ اس نے انسپکٹر کو موٹی سی گالی دی۔ اب پولیس والوں نے وسیم چوہدری کو پکڑ لیا اور اس کے ساتھ دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔

جب انہوں نے مجھے چھوڑا تو "ڈان" کے بیورو چیف نثار عثمانی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے سنبھالا اور سہارا دے کر پریس کلب لاہور میں لے گئے۔ جہاں انہوں نے مجھے پانی وانی پلایا۔ اس دن خواتین کے جلوس میں بڑے بڑے لوگوں کی مائیں بہنیں تھیں۔ اعتزاز احسن کی والدہ محترمہ تھیں' ان کی بیگم بشریٰ اعتزاز تھیں' جنرل مٹھا کی بیٹیاں تھیں' ایس ایم ظفر کی بیوی تھی۔ مزدوروں کی خواتین تھیں۔ محنت کشوں کی عورتیں تھیں۔ سیاسی ورکرز شاہدہ جبیں' کنیز میر اور دوسری خواتین تھیں۔ یہ جلوس پرامن تھا۔ ان خواتین نے صرف جسٹس جاوید اقبال کو جا کر ایک یادداشت دینا تھی۔ اس دن کے جلوس کی رپورٹنگ کے لیے بی بی سی کی کچھ صحافی خواتین بھی آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے یہ منظر دیکھا۔ جس پر میں نے یہ شعر کہے تھے کہ

بڑے بنے تھے جالب صاحب پٹے سڑک کے بیچ
گولی کھائی' لاٹھی کھائی گرے سڑک کے بیچ

کبھی گریباں چاک ہوا اور کبھی ہوا دل خوں
ہمیں تو یوں ہی ملے سخن کے صلے سڑک کے بیچ

جسم پہ جو زخموں کے نشاں ہیں اپنے تمغے ہیں
ملی ہے ایسی داد وفا کی کسے سڑک کے بیچ

اس پولیس تشدد کا میرے جسم پر بہت اثر ہوا۔ میرا تمام جسم اندرونی درد میں مبتلا تھا۔ میں نے سوچا' کراچی چلا جاؤں وہاں ڈاکٹروں سے میری بہت دوستی ہے۔ وہ پرانی این ایس ایف کے زمانے کے دوست ہیں۔ انہوں نے بھی جمہوریت اور آزادی کے لیے بہت کام کیا تھا۔ ڈاکٹر سرور' ڈاکٹر ادیب الحسن رضوی' ڈاکٹر طارق سعید ہیں۔ طارق سعید کا لیڈی کیئر ہسپتال ہے۔ میں کراچی چلا گیا اور وہاں داخل ہو گیا۔ انہوں نے میرے زخموں کی ''سکائی'' کی۔ لاہور میں پٹائی ہوئی اور کراچی میں سکائی ہوئی۔ سکائی ایک بجلی لگانے کا سلسلہ علاج ہے۔ انہوں نے میرے شوگر کے مرض کا بھی علاج کیا۔ ذرا تندرست ہوا تو کراچی والوں نے ایک مشاعرہ رکھ دیا جو بیگم نصرت بھٹو کی صدارت میں تھا۔ وہاں یہ فضا تھی کہ جب تک عبدالحمید چھاپڑا پریس کلب کے صدر رہے۔ یہ جگہ اپوزیشن کی پناہ گاہ اور جلسہ گاہ بنی رہی۔ مشاعرہ تین شاعروں پر مشتمل تھا۔ احمد فراز انعام درانی اور میرے اعزاز میں تھا۔ وہ تو دو دو غزلیں سنا کر بیٹھ گئے۔ مجھے وہاں ڈیڑھ گھنٹہ تک مسلسل اپنا کلام سنانا پڑا۔ میری صحت تو خاصی بگڑ چکی تھی۔ جب وہ مشاعرہ ختم ہوا اور میں سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا کہ نقاہت کے باعث میں گرنے کو ہی تھا' لوگوں نے مجھے سنبھال لیا۔

ڈاکٹر ادیب الحسن رضوی ہمارے پرانے دوست تھے۔ ان کے ساتھ ان کے کالج کے جلسوں میں اپنا کلام سنایا کرتا تھا۔ طالب علم مجھے پسند کرتے تھے اور میں ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ وہ میرے بہت ہی پرانے واقف ہیں۔ کراچی کے بہت سارے ڈاکٹرز میری سرپرستی کرتے ہیں۔ میرا علاج معالجہ ہمیشہ ان کے ذمے رہا ہے۔ میں ڈاکٹر ادیب کے سول ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ انہوں نے ایک صاف ستھرے وارڈ میں رکھا۔ وہ میرا اتنا خیال رکھتے تھے کہ میرے لیے کھانا اپنے گھر سے منگواتے تھے اور شاعر کو جو شعر سنانے کا عارضہ ہوتا ہے اس کا بھی انہوں نے ''علاج'' کیا کہ اپنی اسٹوڈنٹس طالبات اور جونیئر ڈاکٹرز پر مشتمل ٹیم رکھی' ٹیم دوپہر کو بلا لیا کرتے تھے۔ وہ سب مجھ سے نظمیں سنتے تھے۔ میرے ذوق کی بھی تسکین ہو جاتی تھی اور ان سے گپ شپ بھی ہوتی تھی۔

کراچی بدر

جس دن میں ہسپتال میں داخل ہوا تھا اسی شام پولیس مجھے پکڑنے آ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے گورنر کے آرڈر کے تحت کراچی بدر کرنا تھا۔ پولیس نے ڈاکٹر ادیب الحسن رضوی سے بات کی کہ ''ہم حبیب جالب کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔'' ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر پولیس ہسپتال میں داخل نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر ادیب نے کہا کہ ''میں تو مریض کی خراب حالت کی وجہ سے نہیں چاہوں گا کہ آپ ان کو اٹھا کر لے جائیں۔ ٹھہریئے میں پہلے مریض سے پوچھتا ہوں۔'' وہ میرے پاس آئے اور کہا کہ ''اگر آپ گورنمنٹ کے خرچ پر لاہور جانا چاہتے ہیں تو باہر پولیس کھڑی ہے۔ اگر یہاں رہنا چاہتے ہیں تو میں آپ کی خدمت کے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں۔'' میں نے

ان سے کہا "آپ میرا علاج کریں میں یہیں رہوں گا۔ وہ پولیس کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ مریض تو Move بھی نہیں کرسکتا ہے۔ پولیس نے کہا کہ "ہمارا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ Move نہ کریں۔" چونکہ دوسرے دن ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف ایک جلوس نکلنا تھا۔ اس میں مجھے شریک ہونا تھا۔ یہ خبر چھپ چکی تھی۔ میری حالت بہت خراب تھی اس قابل نہیں تھی کہ جلوس میں شامل ہو کر نعرہ بازی کرسکوں۔ یہ وہ دور تھا جب ضیاء الحق نے ریفرنڈم کا ڈھونگ رچایا تھا۔ پریس کلب میں ایک جلسہ تھا۔ وہاں میں نے ریفرنڈم پر یہ نظم سنائی تھی۔

شہر میں ہو کا عالم تھا
جن تھا یا ریفرینڈم تھا
قید تھے دیواروں میں لوگ
باہر شور بہت کم تھا
کچھ باریش سے چہرے تھے
اور ایمان کا ماتم تھا
مرحومین شریک ہوئے
سچائی کا چہلم تھا
دن انیس دسمبر کا
بے معنی بے ہنگم تھا
یا وعدہ تھا حاکم کا
یا اخباری کالم تھا

اس ریفرنڈم کے بعد قومی اسمبلی کے غیر جماعتی الیکشن قریب تھے۔ وہاں ایوان دوستی میں میری صدارت میں ایک مشاعرہ تھا جس کی صدارت میں نے کی تھی۔ جب وہ مشاعرہ ختم ہوا میں اپنے میزبانوں مجاہد بریلوی اور ان کی بیگم عطر شیریں کے ساتھ باہر نکلا تو پولیس نے کار کو گھیرا ڈال دیا۔ انہوں نے پوچھا "حبیب جالب کون ہیں؟" میں نے کہا کہ "میں ہوں۔" میں کار سے باہر نکل آیا۔ پولیس نے اپنی گاڑی میں مجھے سوار کرلیا۔ ان میں ایک انسپکٹر تھا اس نے مجھ سے پوچھا کہ "یہ کون لوگ تھے اور آپ کو کہاں لے جا

رہے تھے؟" میں نے کہا "ان کو منتظمین کہتے ہیں اور ان کے نام مجھے معلوم نہیں ہیں اور ظاہر ہے مجھے کسی ہوٹل میں ہی لے جا رہے ہوں گے۔" یوں میں نے نام اور پتے بتانے سے Avoid کیا۔ سفر کے دوران انہوں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا اور کہا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں جمہوریت تو یہاں ہے اور کون سی جمہوریت چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جناب! آپ کا یہ منصب نہیں کہ آپ سیاست پر گفتگو کریں۔ آپ کے پاس جو وارنٹ یا سمن میری گرفتاری کے ہیں وہ آپ مجھے دکھائیں۔ آپ شاید گورنر کے آرڈر کے تحت مجھے شہر بدر کرنا چاہتے ہیں۔" انہوں نے کہا "جی ہاں' ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم آپ کو جہاز پر بٹھا کر لاہور روانہ کر دیں۔"

اب وہ مجھے تھانے میں لے آئے۔ میری طبیعت خراب تھی۔ میں نے کہا' مجھے چارپائی دو۔ میں لیٹ سکوں کیونکہ جہاز تو بہت لیٹ جانا تھا۔ انہوں نے کہا" یہاں چارپائی تو نہیں یہ بنچ ہے۔" چنانچہ میں اسی بنچ پر لیٹ گیا اور ایک چادر اوڑھ لی۔ کچھ ہی دیر بعد تھانے میں کچھ پبلک کے لوگ آئے تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کسی کیس کے سلسلے میں آئے تھے۔ وہاں ایک سندھی پولیس مین تھا اس کا رویہ بڑا نرم تھا جبکہ پنجابی بھائیوں کا لہجہ بہت سخت تھا۔ افسر تو جا چکے تھے۔ چھوٹے تھانیدار سے سلسلہ کلام جاری ہوا۔ اس نے کہا "میں آپ کو لاہور سے جانتا ہوں۔ ریاض شاہد کے ہاں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔" ریاض شاہد کا ذکر چلا تو اس سے باتیں کر کے بہت خوشی ہوئی۔ اس نے پھر کہا کہ" میں افسروں کے سامنے تو یہ بات نہیں کر سکتا تھا لیکن میں آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ آپ کوئی خدمت بتائیں' کچھ کھانے پینے کا انتظام کیا جائے۔" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ پولیس نے مجھے رات کی آخری فلائیٹ پر بٹھایا اور وہ پولیس والا جہاز کے اندر گیا۔ پتہ نہیں کیسے چلا گیا وہاں تک۔ شاید اسے خصوصی اجازت ہوگی۔ پھر اس نے یہ تسلی کر لی کہ میں جہاز کے اندر سیٹ پر بیٹھ گیا ہوں پھر وہ گیا۔ ان کو جیسے یہ شک تھا کہ میں کہیں جہاز سے کسی اور طرف نہ بھاگ جاؤں۔ لاہور ساڑھے تین بجے پہنچا۔ رات کو آ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میری بیوی حیران ہوگئی۔ اس نے پوچھا کہ" آپ کو ابھی وہیں رہنا تھا اتنی جلدی کیسے آ گئے اور سامان کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ سامان تو وہیں رہ گیا ہے۔ پولیس نے زبردستی شہر بدر کیا ہے۔ اگر سامان لینے جاتا تو منتظمین کے گھروں کے پتے پولیس کو معلوم ہو جاتے اور انہیں خواہ مخواہ پریشانی ہوتی۔ اس لیے میں چپ چاپ لاہور آ گیا۔

کراچی پریس کلب

کراچی پریس کلب سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی تھی وہاں اپوزیشن کے لوگ ہی آتے تھے۔ کوئی حکومت کا آدمی وہاں نہیں آ سکتا تھا۔ اس زمانے میں عبدالحمید چھاپڑا پریس کلب کراچی کے صدر تھے اور مجاہد بریلوی جنرل سیکرٹری تھے۔ تقریب بہر ملاقات کے طور پر انہوں نے میری سالگرہ کا اہتمام کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ غریب آدمی کی کیا سالگرہ ہوتی ہے۔ کیا ضرورت ہے

اسے منانے کی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ ''کچھ اپنے لوگ اکٹھے ہوں گے اور کچھ گفتگو ہو جائے گی۔'' میں نے حامی بھر لی۔ غلام مصطفیٰ شاہ، معراج محمد خان، فتح یاب علی خان اور غلام مصطفیٰ جتوئی اور دوسرے بہت سارے سیاست دان، ادیب اور دانشور اس جلسے میں شامل ہوئے تھے۔ بے نظیر جب لندن میں تھیں تو غلام مصطفیٰ جتوئی کا گھر سیاسی عمل کا گہوارہ بن گیا تھا۔ یہی ایک آدمی سندھ میں صاحب توفیق بھی تھا۔ عبدالولی خان بھی ان کے ہاں جاتے تھے۔ اپوزیشن کے وہ تمام سیاستدان جو جمہوریت کے لیے جدوجہد میں شریک تھے ان سے وابستہ تھے۔ جمہوریت کے لیے جدوجہد کا چراغ مصطفیٰ جتوئی نے وہاں روشن رکھا ہوا تھا۔ جتوئی صاحب بھی اس تقریب میں شامل ہوئے۔ ظاہر ہے پولیس ان کی نگرانی کر رہی تھی۔ گرفتاریوں کی افواہ بھی گرم تھی۔

طارق عزیز

میری اس سالگرہ کی تقریب میں ہی معروف کمپیئر اور اداکار طارق عزیز کا واقعہ ہوا تھا۔ طارق عزیز کا بھٹو صاحب سے تعارف میں نے ہی کرایا تھا۔ ضیاء الحق آیا تو وہ اس کے ساتھ ہو گئے۔ ان کی یہ شہرت ہو گئی تھی کہ ضیاء الحق نے طارق عزیز کو ''مبلغ اسلام'' کا خطاب دیا تھا لیکن میں اسے پسند کرتا تھا کیونکہ وہ کافی ہاؤس میں بیٹھنے والا میرا پرانا یار تھا۔ اچھا شاعر بھی ہے۔ اس کے آنے پر ہم بہت خوش تھے کہ میں نے فلم میں جو کچھ لکھا ہے اس پر گفتگو کرے گا۔ جب ان کی باری آئی تو لوگوں نے کہا کہ ہم اس کو نہیں سنتے۔ لوگ پرجوش نعرے لگانے لگے اور شور مچا دیا۔ میں نے مائیک پر آ کر ہاتھ باندھ کر کہا کہ یہ ادھر سے ادھر آ گئے ہیں تو انہیں قبول کیا جائے۔ یہ ہمارے حق میں ہی بات کریں گے۔ ان کی بات سنیں۔ عبدالحمید چھاپڑا نے بھی لوگوں کو روکا لیکن لوگ نہیں رکے۔ میں نے غلام مصطفیٰ جتوئی کے کان میں کہا کہ اس کو بچائیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ''میں عوام کی عدالت میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ میں بھی اب کچھ نہیں کر سکتا۔'' چنانچہ طارق عزیز کو لوگوں نے نہیں سنا اور ہم نے انہیں پچھلے کمرے میں ٹھہرا دیا۔

جلسہ ختم ہوا تو پولیس نے پیچھا کرنا شروع کر دیا کیونکہ گورنمنٹ کو اس جلسے کے انعقاد پر شدید اعتراض تھا۔ اس نے بہت دھمکیاں دیں مگر عبدالحمید چھاپڑا ڈٹ گئے کہ وہ یہ جلسہ ضرور کریں گے اور انہوں نے کیا۔ وہ جلسہ اتنا بڑا تھا کہ لوگ باہر سڑک تک بیٹھے ہوئے تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کو بڑی مشکل سے وہاں جلسے سے نکالا اور کار میں بٹھایا۔ عبدالحمید چھاپڑا نے ڈرائیونگ کی۔ ہمارے پیچھے پولیس لگی ہوئی تھی۔ چھاپڑا صاحب نے پولیس کو غچہ دیا اور ایک جگہ کار کھڑی کر کے جتوئی صاحب کو رکشے میں بٹھا دیا۔ وہ یوں گھر پہنچے یا انہیں شاید گرفتار کر لیا گیا تھا۔

عوام کا حافظہ اتنا بھی کمزور نہیں ہوتا کہ وہ کسی کے عمل کو بھول جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ حکومت ذرا دھمکا کر یا لالچ دے کر انہیں

خاموش کر دے یا اپنے ساتھ ملا لے۔ عوام کے ساتھ تسلسل کے ساتھ رہنے والوں کو عوام کبھی نہیں بھولتے۔ ان کا وہ احترام کرتے ہیں جو ان کو جل دے کر نکل جائے تو پھر وہ اس کا محاسبہ کرتے ہیں۔ طارق عزیز کو لوگوں نے اس لیے نہیں بخشا کہ لوگ ضیاء الحق کی آمریت کے سخت خلاف تھے اس لیے وہ ضیاء الحق کے چیلوں پر گرم تھے۔ وہ غصہ اس پر نکلا۔

پریس کلب کراچی صرف اپوزیشن والوں کے لیے وقف تھی۔ عبدالحمید چھاپڑا جو کہ کلب کے صدر تھے انہوں نے وہاں بہت اچھا ماحول بنایا تھا۔ ان کے بعد تو پریس کلب کا بہت برا حشر ہوا۔ عبدالحمید چھاپڑا خود ایک سیاسی آدمی ہیں وہ اصغر خان کی پارٹی میں تھے ان کے ساتھ جیل میں بھی رہے' ایم پی اے کا الیکشن بھی انہوں نے لڑا تھا۔ چھاپڑا صاحب کا ذاتی پریس تھا۔ ان کی پریس کلب میں حکومت مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے پریس ضبط بھی ہو گیا تھا۔ کراچی کے صحافی' ڈاکٹر اور دانشور میری بہت زیادہ سرپرستی کرتے ہیں ایسا نہیں کہ لاہور میں کم کرتے ہیں لیکن کراچی میں شاعری کا کچھ زیادہ چرچا ہے شاعروں کی بڑی تعداد وہاں موجود ہے۔ مشاعرے بھی ہوتے رہے ہیں۔

ظلمت اور ضیا

پاسپورٹ کی ضبطی کا مسئلہ بہت پرانا تھا۔ میرا پاسپورٹ بتیس سال سے ضبط تھا۔ اس کے لیے مختلف لوگوں نے بھی رٹیں کی ہوئی تھیں۔ پیپلز پارٹی نے میرا یہ کام ضرور کیا ہے۔ اعتزاز احسن جب وزیر داخلہ تھے تو انہوں نے مجھے پاسپورٹ دلوا دیا تھا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔ اس سے پہلے ضیاء الحق کے دور میں پاسپورٹ کے لیے ہائیکورٹ میں رٹ کی ہوئی تھی اس کے لیے عابد حسن منٹو اور عارف اقبال بھٹی میری طرف سے پیش ہوتے رہے ہیں۔ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مجدد مرزا تھے۔ وہ دلی سے تعلق رکھتے ہیں اور نواب سراج الدولہ کے عزیزوں میں سے ہیں' میں ان سے ملا۔ انہوں نے کہا۔ "ہاں ہاں' آپ ضرور جائیں گے۔ میرا اسلام گلزار دہلوی کو کہیے گا۔" گلزار دہلوی ہندوستان کے معروف شاعر ہیں۔ ان کے والد زار دہلوی داغ کے شاگرد تھے۔ وہ پنڈت فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ پنڈت فیملی سے تعلق رکھتے ہیں جب انہوں نے یہ ذکر کیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں دہلی پہنچ گیا ہوں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں کے قریب سے گزر رہا ہوں۔ مجدد مرزا کی تعین دہانی کے بعد دوسرے دن دوبارہ ان سے ملا اور کہا کہ پاسپورٹ کے سلسلے میں آج میری جج کے سامنے پیشی ہے۔ کہنے لگے۔ "ہاں ہاں دعا کیجیے۔" میں نے کہا اب دعا پر بات آ گئی ہے اور جب دعاؤں پر بات آ جائے تو مریض کا اختتام ہی ہوتا ہے۔ میں عدالت میں پیش ہوا۔ وہ جج جن کو اپنے عہدوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ بڑے ہی لائٹ موڈ میں گفتگو کر رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ "بھئی کیا فائدہ ہے وہاں مشاعرے میں جانے کا' ہم آپ کا یہیں مشاعرہ کرا دیتے ہیں۔" میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے نہیں جانے دیں گے۔ انہوں نے مجھے بھارت جانے کی اجازت نہیں دی۔ ظاہر ہے کہ

ضیاءالحق کی ہدایات تھیں یہ مجھے بعد میں پتہ چلا۔ جب میں دلی گیا تو مجھے علی صدیقی نے بتایا جو "انجمن ترقی اردو ہند" کے انچارج ہیں وہ وہاں مشاعروں کا اہتمام بھی کیا کرتے ہیں۔ ان کا دونوں ملکوں میں اچھا اثر و رسوخ ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ "میں نے ضیاء الحق سے کہا کہ حبیب جالب شاعر ہے ایک شاعر سے آپ کا کیا جھگڑا۔ انہیں انڈیا جانے دیں۔" ضیاء الحق نے ان سے کہا کہ "نہیں نہیں' میں اسے نہیں جانے دوں گا۔ آپ چاہے سارے شاعروں کو لے جائیں لیکن میں حبیب جالب کو نہیں جانے دوں گا۔" بے نظیر حکومت کے زمانے میں مجھے پاسپورٹ ملا تھا۔ ضیاء الحق کے دور میں تو دوبئی جانے سے مجھے روک دیا گیا اور مجھے جہاز سے اتار لیا گیا تھا۔

ضیاءالحق کے خوفناک عہد میں جب میں میانوالی جیل میں نظر بند تھا تو انور علی چوہدری ایڈووکیٹ جو میجر اسحاق کے چھوٹے بھائی ہیں' ان کو خبر ہوئی۔ چوہدری انور ظہور الٰہی کے لیگل ایڈوائزر تھے' وہ ظہور الٰہی کے پاس گئے اور کہا کہ حبیب جالب آپ کے دوست ہیں آپ کی ان سے پرانی رفاقت ہے آپ انہیں میانوالی جیل سے گوجرانوالہ جیل میں منتقل کرا دیں کیونکہ وہاں بہت شدید گرمی ہے۔ وہ کہنے لگے کہ حبیب جالب اگر "ظلمت کو ضیا" نہ لکھتا "ظلمت کو قضا" لکھ دیتا تو اسے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اس نے ظلمت کو ضیا کیوں لکھا؟" مجھے انور علی چوہدری نے بتایا تو میں نے جواب دیا کہ ظلمت کو ضیاء والا جو تلازمہ ہے اس کے لیے میں پچیس سال قید کاٹ سکتا ہوں' یہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔

ظلمت کو ضیاء صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

ناروا سلوک

میر علی احمد تالپور بڑے باذوق انسان تھے۔ انہیں شعر و ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ ہمارے دوست تھے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی چھوڑ دی تھی اور جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں وزیر دفاع ہو گئے تھے۔ ایک محفل میں ان سے ملاقات ہوئی تو ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ایک آمر کا ساتھ دینا کیوں پسند کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ بھٹو اپنے ساتھیوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔ وہ دوسرے کی عزت نفس مجروح کرتے ہوئے انگلی کے اشارے سے مخاطب ہوتے تھے۔ جبکہ جنرل ضیاء الحق دھیما آدمی ہے اس نے جب بھی کوئی بات مجھ سے کہنا ہوتی ہے تو پیچھے سے میرے کان میں آ کر کہہ دیں گے۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بھٹو نے آپ کے ساتھ اگر اچھا سلوک نہیں کیا تو جنرل ضیاء الحق بھی آپ کے ساتھ ناروا سلوک ہی کرتا ہے۔ اس پر انہوں نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

◆◆◆

کوئی تو پرچم لے کر نکلے

چوہدری ظہور الٰہی سے ہماری پرانی شناسائی کیوں تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم چونکہ آمریت کے خلاف اتحاد بناتے رہتے تھے چوہدری ظہور الٰہی ان میں شامل ہوتے رہتے تھے۔ جنرل ضیاء سے پہلے بھٹو کے خلاف جو ہم نے اتحاد بنایا اس میں وہ نہ صرف شامل ہوئے تھے بلکہ انہوں نے بلوچستان میں جیل بھی کاٹی تھی۔ بقول چوہدری ظہور الٰہی یہ آرڈر ہوا تھا کہ اسے ختم کر دیا جائے مگر اکبر بگٹی نے بلوچ روایت کے تحت کہا تھا کہ "میں یہ کام نہیں کر سکتا۔" بگٹی سردار تو ہے لیکن ایک راویتی حسن اس میں ضرور ہے۔ شاید ایوب خان کا زمانہ تھا کہ میں نے وہاں ایک جلسے میں اس کے خلاف ایک نظم پڑھی تھی۔

سن بھئی اکبر بگٹی بات کہوں میں ٹھکتی
جمہوری تحریک ہے یہ اب روکے سے نہیں رکتی

یہ نظم میں نے پڑھ دی اور اکبر بگٹی نے وائرلیس پہ سن لی۔ اکبر بگٹی مجھے جانتے تھے انہوں نے اپنے ایک عزیز سیف الرحمن مزاری کے ذریعے پیغام بھیجا کہ "میں نے آپ کی نظم سن لی ہے اب میرے ساتھ کھانا تو کھاؤ۔" میں نے جواب دیا کہ میں چونکہ میر غوث بخش بزنجو اور سردار عطاء اللہ مینگل کے پاس ٹھہرا ہوں اس لیے نہیں آ سکتا کیونکہ میرا آپ کے پاس آنا کچھ منافقت سی ہوگی اس لیے میں نہیں آ سکتا۔ ان کی دعوت کو میں نے شکریہ کے ساتھ ٹھکرا دیا۔

باچا خان

چوہدری ظہور الٰہی کے پاس باچا خان بھی آ کر ٹھہرتے تھے۔ باچا خان بڑی سادہ سی خوراک کھاتے۔ اگر ان کے سامنے مختلف کھانے رکھے جاتے تو وہ اس پہ خوش نہیں ہوتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کیوں اتنا خرچ کرتے ہو یہی تم انسان کی فلاح پر خرچ کرو۔" میں جب ایک دفعہ چوہدری ظہور الٰہی سے ملنے گیا کہ تو وہاں باچا خان آئے ہوئے تھے میں ان سے ملا۔ سلام کیا۔ گفت وشنید ہوئی۔ دو چار منٹ بعد چوہدری ظہور الٰہی مجھے کمرے سے باہر لے آئے اور کہا کہ "بابا یہاں تمہیں چائے نہیں پینے دے گا' چلو تمہیں دوسرے کمرے میں چائے پلاتا ہوں۔" باچا خان پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے ممبر تھے اور قائداعظم نے انہیں اپنے ہاں چائے پہ بلایا تھا۔ وہاں قائداعظم نے کہا کہ "آج میرا پاکستان مکمل ہوا ہے۔" وہاں باچا خان نے قائداعظم کو بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت

دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ "جس ایمانداری اور دیانت سے میں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی' اس کی کچھ وجوہات تھیں لیکن اب پاکستان بن گیا ہے' میں اپنے ماننے والوں کو بھی آپ کے سامنے پیش کروں گا اور ان کو بھی کہوں گا کہ پاکستان کی تعمیر و ترقی میں مل کر کام کریں۔"

قائداعظم کی باچاخان سے ملاقات طے ہوگئی تھی' جسے انگریز آئی جی اور قیوم خان نے ایک سازش کے تحت نہ ہونے دیا۔ ان سے کہا کہ لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بن جائے گا اور وہ آپ کو مار دیں گے۔ قائداعظم بانی پاکستان ہیں اور ایک انسان تھے انہیں مافوق البشر قرار دینا غلط بات ہوگی۔ انسان خطا کھا سکتا ہے۔ قائداعظم سے کوئی غلطی سرزد ہونا فطری امر تھا۔ وہ باچاخان کی دعوت پر نہیں گئے اور ان کے انتظار میں کھڑے لوگوں پر قیوم خان نے گولی چلوادی تھی۔ سات سو آدمی مر گئے تھے۔ باچاخان کو گرفتار کرلیا گیا۔ وہ متحدہ ہندوستان میں بھی بار بار قید ہوئے۔ اب یہاں پاکستان میں بھی انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ قائداعظم کو وہاں کس نے قتل کرنا تھا۔ ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے تمام سرحد کا دورہ کیا تھا۔ ولی خان کی صدارت میں مادر ملت کا جلسہ بھی ہوا تھا۔ ولی خان نے الیکشن میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ باچاخان نے بھی مادر ملت کی حمایت کی تھی تو انہیں کسی نے قتل نہیں کیا۔ مادر ملت سرحد کے دورے پر جب تشریف لے گئیں تو ان کا شاندار استقبال ہوا۔ ان کے ہاتھ دنبوں پہ لگوا کے انہیں ذبح کیا گیا تھا۔ یہ وہاں کی رسم ہے تو یہ بات غلط تھی کہ قائداعظم کو وہاں کوئی پریشانی ہوتی یا ایسا واقعہ پیش آتا۔ خواجہ ناظم الدین بار بار ولی خان سے کہتے کہ "ایوبی آمریت کے خلاف تحریک زیادہ زور سے چلاؤ۔ بہت کام کرو' بہت کام کرو۔" ولی خان نے ان سے کہا۔ "خواجہ صاحب میں تو اس آمریت کے خلاف یہاں تک کام کررہا ہوں کہ اپنے قاتل قیوم خان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ اب اس سے زیادہ کیا کرسکتا ہوں۔" قیوم خان نے باچاخان اور قائداعظم ملاقات فلاپ کرائی تھی۔ ایک بار باچاخان نے قائدعوام یعنی ذوالفقار علی بھٹو سے بھی ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ بھٹو نے کہا تھا کہ "جو پاکستان رہ گیا ہے میں اسے تعمیر کروں گا ایک نیا پاکستان بنادوں گا۔" باچاخان نے کہا۔ "یہ لڑکا مجھے اچھا لگا ہے۔ اس نے تعمیر کی بات کی ہے۔ میں اس سے ملوں گا۔ میری اس سے ملاقات کا Arangement کرو۔ مفتی محمود ہنس دیئے اور کہا کہ "آپ بھٹو کو نہیں جانتے۔" ولی خان نے بھی کہا کہ "آپ مل لیں دیکھ لیں لیکن اس کا مزاج آپ سمجھ نہیں سکیں گے۔" باچاخان نے ان سے کہا۔ "تم سیاسی لوگ ہو' خواہ مخواہ ایسی باتیں کرتے ہو۔"

ذوالفقار علی بھٹو نے حیات محمد شیرپاؤ سے مشورہ کیا کہ "غفار خان مجھ سے ملنا چاہتے ہیں مجھے کیا کرنا چاہیے۔" شیرپاؤ نے اسے کہا کہ "باچاخان کا بہت بڑا منصب ہے' آپ خود ان کے گھر جائیں۔ وہ آپ کے لیے بہت مفید ہوں گے۔ ہندوستان اور افغانستان

سے تعلقات بنانے اور صوبوں کے مابین یگانگت کرانے میں معاون ثابت ہوں گے ان میں یہ قدرت ہے۔" اس ملاقات کی بھنک پھر قیوم خان کے کان میں پڑ گئی۔ وہ پھر فائل لے کر بھٹو کے پاس آ گیا اور کہا کہ وہ تو انڈیا کا لیڈر ہے' کابل کا لیڈر ہے۔ آپ اسے پاکستان کا بھی لیڈر رہنا چاہتے ہیں۔ پھر ہم کہاں جائیں گے۔" بھٹو نے اس کی بات مان لی اور یہ ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کے بعد بھٹو نے باچا خان کے بارے میں "مسٹر پختونستان" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ بھٹو صاحب انگریزی کے آدمی تھے۔ وہ جب کسی کا مذاق اڑاتے تو انگریزی Phrases جوڑتے تھے۔ یہی ان کی "شاعری" ہوا کرتی تھی۔ مثلاً انہوں نے کرمانی کے بارے میں کہا کہ Who is She? بھٹو اس طرح کے خطابات دے کر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔

باچا خان اور بھٹو کی ملاقات سازش کا شکار ہو گئی۔ یہ بات مجھے افراسیاب خٹک نے حیدر آباد جیل میں بتائی تھی' کیونکہ حیات محمد شیر پاؤ' افراسیاب خٹک کو پسند کرتے تھے اور ان کے دوستوں میں سے تھے۔ خٹک اسٹوڈنٹ لیڈر تھا۔ بہت بڑا نظریاتی آدمی ہے۔ کابل میں بھی رہا ہے۔ میری اجمل خٹک کے ساتھ بھی ملاقات تھی۔ وہ بھی اچھا بھلا شاعر ہے' اور آدمی بھی کھرا ہے۔ میں نے ان سے ضیاء دور میں احتساب کو اولین حیثیت دینے پر اختلاف کیا تھا۔ اجمل خٹک آج موجودہ حکومت کے ساتھ ہیں تو ان سے بہت سارے اختلافات ہیں لیکن ایک انسان ہونے کی حیثیت سے وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ یہاں مسلم لیگ کے ایک دھڑے نے باچا خان کو گالیاں دیں' برا بھلا کہا اور وہی زبان استعمال کی جو قیوم خان استعمال کرتا تھا کیونکہ یہ دھڑا مسلم لیگ کے نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ اشتراک پر خوش نہیں ہے' ویسے نیشنل عوامی پارٹی اپنی پنجاب کی قیادت سے پوچھتی ہی نہیں ہے۔ یہاں راؤ مہروز اختر ان کا ہی آدمی ہے۔ ان کے ہاں میں ہاں ملانے والی چیز ہے ویسے بھی نیشنل عوامی پارٹی کو پنجاب کی قیادت سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے حکومت میں شامل ہونے کی ایک وجہ تو یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگوں کے کام ہو سکیں کیونکہ وہ ممبر بن کر اسمبلیوں میں تو چلے جاتے ہیں لیکن لوگوں کے کام نہیں ہوتے۔ کراچی میں ان کا ایم کیو ایم سے جھگڑا ہوا اس میں پٹھانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کا اثر پشاور پر بھی ہوا' لیکن جو سیاسی اخلاقیات ہمیں باچا خان نے بتائیں کہ "ایک آدمی بھی اگر ساتھ نہیں ہے تو حق کی بات کہتے چلے جانا۔" ہم اگر باچا خان کے Follower کہلاتے ہیں تو اس کی بات پر عمل بھی کرتے۔ میں تو ایک شاعر ہوں مجھے بھی بڑے مواقع ملے تھے۔ ایوب خان نے کہا تھا کہ زمین لے لو' پیسے لے لو' پرمٹ لے لو' لائسنس لے لو' تم مادر ملت کے ساتھ نہ جاؤ۔ ہمارے بھی ساتھ بھی نہ آؤ صرف بیمار ہو کر ہسپتال میں پڑے رہو۔ تمہاری انا بھی محفوظ رہے گی وہ بھی مجروح نہ ہو گی...... لیکن ہم تمام عیش و عشرت تیاگ کے یہاں تک آ گئے ہیں۔ تمام مراعات مل سکتی تھیں۔ دھوپ اور سایہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے لیکن ہم نے اپنے لیے دھوپ منتخب کی ہے اور یہ

زندگی خود اختیار کی اور اس راستے کا خود انتخاب کیا ہے۔ باچا خان نے بھی اپنا راستہ خود منتخب کیا تھا۔ وہ اگر انڈیا میں ہوتے تو پریذیڈنٹ ہوتے مگر ان کا ایسا سبھاؤ ہی نہیں تھا۔ ایک بات ہے کہ ولی خان نے باچا خان کی ''سنت'' پر عمل ضرور کیا ہے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے ولی خان سے کہا کہ ''تم پریذیڈنٹ بن جاؤ'' تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ''یہ میرا سبھاؤ نہیں ہے میں پریذیڈنٹ نہیں بنوں گا' تمہارے ساتھ نہیں آؤں گا۔ تم آئین پر عمل کرو۔ اگر تمہیں خدشہ ہے کہ میں پریذیڈنٹ یا وزیراعظم بننا چاہتا ہوں تو میں یہاں سے پانچ سال کے لیے باہر چلا جاتا ہوں اور اگر تم نے آئین پر عمل نہیں کیا تو فوج پہلے تمہارے گھر آئے گی۔'' اور یہی ہوا۔ بھٹو نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ ''میں ولی خان کی باتیں غور سے سنتا تھا' میں نے غلطیاں کیں عوام پر انحصار نہیں کیا ''طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں'' کا جو میرا اصول تھا' اس پر میں نے عمل نہیں کیا۔ میں نے حکومت اور بیوروکریسی پر ہی انحصار کیا تھا۔'' یہ بھٹو کا اعتراف تھا۔

باچا خان سے ملاقات ان کے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے ہوئی تھی۔ میں کسی جلسے کے لیے پشاور گیا ہوا تھا' میں نے اپنے ورکرز سے کہا کہ ''میں باچا خان سے ملنا چاہتا ہوں۔'' وہ مجھے باچا خان کے پاس لے گئے۔ اس وقت ان کے پاس کچھ پختون بیٹھے ہوئے تھے اور وہ پشتو میں گفتگو کر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ حبیب جالب آئے ہیں۔ باچا خان نے اردو میں گفتگو شروع کر دی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ ''دیکھئے جناح کا پاکستان تو ختم ہو گیا اب چار بھائی رہ گئے ہیں۔ ایک جرگہ بلایا جائے اور جس کا جو حق بنتا ہے اسے دے دیا جائے۔ کوئی پانی لے جاتا ہے کوئی بجلی لے جاتا ہے۔ ہمیں بھی کچھ دیا جائے۔'' ہمیں کا مطلب یہ ہے کہ وہ Within the Country رہتے ہوئے سیاست کر رہے ہیں اور اپنی ڈیمانڈز ملک کے اندر رہتے ہوئے کر رہے ہیں اس لیے ان کی صورت حال جی ایم سید سے تو نسبتاً بہتر ہے حالانکہ جی ایم سید تو پاکستان بنانے میں قائداعظم کے ساتھ تھے۔ باچا خان نے جو بھی مطالبہ کیا اس ملک کے اندر رہ کر کیا ہے۔ میں نے ان کی باتیں سنیں اور کہا کہ بابا آپ ساری عمر ہمیں تقریریں سناتے رہے ہیں میں آج ایک ہدیہ تبریک آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے جرمن ہٹلر کے خلاف جنگ لڑی' آپ کو پہلا سلام۔ پھر انگریزوں کے ساتھ جنگ کی۔ احمد آباد کے فسادات میں جو مسلمان گھروں کو چھوڑ کر کیمپوں میں چلے گئے تھے۔ آپ ان کو کیمپوں میں ڈھونڈتے رہے۔ جب آپ کانگریس کے ایک وزیر کے ساتھ انہیں ڈھونڈنے کے لیے جا رہے تھے تو ایک کمیونسٹ لیڈر نے آپ کو روک کر کہا تھا کہ یہ شخص آپ کو ان تک نہیں پہنچائے گا تو آپ نے اس وزیر کو اتار دیا تھا اور وہ کمیونسٹ آپ کو ان کیمپوں میں لے کر گیا تھا جہاں آپ نے تقریر کی تھی کہ ''تم اتنے بزدل ہو گئے ہو کہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہاں آ گئے ہو۔ حوصلہ کرو۔ میں آیا ہوں۔'' پھر آپ نے

انکو ان کے گھروں میں بحال کیا اور کہا تھا کہ ''نہ ہندو میں ایمان رہا اور نہ ہی مسلمان میں رہا ہے۔ مجھے کیمونسٹ اچھا لگا۔'' میں آپ کو سلام پیش کرتا ہوں۔ آپ نے افغانستان کی جنگ میں امریکی سامراج کا ساتھ نہیں دیا۔ آپ نے کہا تھا کہ یہاں مسلمانوں کا کشت وخون ہو رہا ہے۔ میں یہاں امریکہ کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ آپ نے امریکی سامراج کو للکارا اور مجاہدین کا ساتھ نہیں دیا۔ میں آپ کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ میں نے یہ تمام باتیں انکے گوش گزار کیں۔ وہ سنتے رہے۔ جب میں کہہ چکا تو وہ باچا خان جو کسی کو چائے کا نہیں پوچھتے تھے انہوں نے کہا کہ ''حبیب جالب کے لیے کھانا لے کر آؤ۔'' باچا خان بہت خوش ہوئے۔ اس وقت ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ میں نے کہا۔ ''بابا! کھانا تو میں ولی خان کے ساتھ کھاؤں گا۔ ان سے میرا ملنا ہے سو میں اب آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ میں چلا آیا اور آ کر ولی خان کو بتایا کہ میں نے باچا خان کے سامنے دس منٹ تقریر بھی کی اور انہوں نے بڑے تحمل سے مجھے سنا اور میرے لیے کھانے کا آرڈر بھی دیا۔ ولی خان کہنے لگے۔ تم تو بڑے خوش قسمت ہو ہماری تو وہ سنتے بھی نہیں ہیں۔ اجمل خٹک نے ان کی وفات کے بعد ایک بیان میں کہا تھا کہ ''باچا خان جلال آباد میں دفن ہوئے تو ان کی اس خواہش کا مقصد یہ تھا کہ وہ ''امن کا پل'' بننا چاہتے تھے۔'' اجمل خٹک کی یہ بات سو فیصد درست ہے۔ باچا خان امن و آشتی کے آدمی تھے۔ لڑائی جھگڑے کے حق میں نہیں تھے۔ ان سے بڑا کام لیا جا سکتا تھا مگر حکومتوں نے ان کی انا کو بڑی ٹھیس پہنچائی۔ ان کو عمر بھر قید رکھا۔ ان کی بے عزتی کرتے رہے۔ ان کی تذلیل کرتے رہے۔ یہ باتیں پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے حق میں نہیں تھیں۔ ان کی وفات پر جو اجتماع ہوا۔ وہاں ساری دنیا سے لوگ آئے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی عظمت کیا تھی اور کیا مقام تھا۔ پاکستان ایک بڑی متبرک چیز ہے ہمارا بہت مقدس ملک ہے۔ اس میں ہم رہتے ہیں۔ یہ ہماری زندگی اور ہماری جان ہے۔ اگر پاکستان میں دس یا پندرہ شہروں میں باچا خان کی عظمت کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو اس سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کا دنیا میں جو مقام اور مرتبہ ہے وہ اسی طرح سربلند رہے گا۔ باچا خان نے ہمیشہ اس ملک کے اندر رہ کر مطالبات کئے ہیں۔ ان کا صاحبزادہ جو ہمیشہ اپوزیشن کا لیڈر رہا۔ آج وہ حکمرانوں کے ساتھ شامل ہے تو ہنسی آتی ہے کیونکہ آدھی مسلم لیگ اسے ''محب وطن'' کہتی ہے اور باقی آدھے اسے ''غدار'' کہتے ہیں۔ اور اس کے باپ کو غدار کہتے ہیں۔ غدار کہنے کا عمل جو ہے وہ اب Out of Date ہو چکا ہے کیونکہ یہاں اتنی بار غدار کہا گیا اور پھر انہی ''غداروں'' کو سینے سے بھی لگا لیا جاتا ہے۔

شہید

کسی بھی ڈکٹیٹر کو اپوزیشن نے نہیں اتارا بلکہ فوج نے ہی آ کر اتارا ہے۔ ایوب خان کو بھی اس کی فوج نے ہی اتارا تھا۔ ضیاء الحق

کو بھی اپوزیشن نے نہیں اتارا تھا بلکہ فرشتہ اجل نے ہی آسمان سے آ کر اتارا تھا۔ ڈکٹیٹرز کو میں شہید نہیں مانتا۔ میں تو حسن ناصر کو شہید مانتا ہوں جو صحیح معنوں میں شہید ہیں۔ انہوں نے مزدوروں کسانوں کے راج کے لیے کام کیا تھا۔ وہ شہید کر دیے گئے۔ جو لوگ اپنی کرسی کے لیے شہید ہوئے اور اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے شہید ہو گئے تو ان کے لیے میں نے کہا تھا کہ

جو اوجڑی میں مارا گیا بس وہ مر گیا
خاکی تھا اور خاک کی صورت بکھر گیا
منشائے ایزدی کے مطابق گزر گیا
ہر بے گنہ کا خون مقدر کے سر گیا

چنگیز خاں شہید ہلاکو شہید ہے
آیا جو اس زمیں پہ ڈاکو شہید ہے
جو اس نگر میں کر کے مرا "کو" شہید ہے

کاذب کے واسطے ہے ہر اک روز روزِ عید
کیا کیا نہ اہل صدق کی مٹی ہوئی پلید
بیچے شنید ان کی نہ اوپر ہی کچھ شنید
جو مر رہے ہیں سندھ میں ہرگز نہیں شہید

کہیے یہی یقیں سے شیطاں عظیم ہے
جو بھی ہے اس کے تابع فرماں عظیم ہے
یہ ایک واہمہ ہے کہ انساں عظیم ہے

ہر بوالہوس ہے معتبر و باوفا یہاں
ہر راہزن ہے راہبر و میر کارواں
ہر اہل زر ہے خاک نشینوں کا ترجماں
لوگ اپنے قاتلوں کے ہیں عشاق میری جاں

لبریز جام و درد تہہ جام کو لکھو
حسن تمام بجھتی ہوئی شام کو لکھو
وجہ نشاط نشتر آلام کو لکھو

نہ تو بھٹو کو شہید مانتا ہوں اور نہ ہی ضیاء الحق کو شہید مانتا ہوں' میں تو حسن ناصر کو شہید مانتا ہوں۔ بھٹو کی پھانسی کے خلاف میں نے بیان دیا تھا کہ اسے پھانسی نہیں دینی چاہیے تھی کیونکہ ججوں میں اختلاف تھا۔ اب کوئی وزیر اعظم تو قتل نہیں کرتا ہے۔ میانوالی جیل میں راؤ رشید سے گفتگو ہوئی تو میں نے کہا تھا کہ یہ مان لیں کہ بھٹو صاحب بڑے اچھے آدمی تھے اس کے کارندوں نے یہ قصور کیا ہوگا مگر منتخب تو ان ہی کے کئے ہوئے تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بھٹو صاحب نے کہا ہو کہ ''اوئے تم کیا بجو بے ہو احمد رضا قصوری کو فکس نہیں کر سکتے ...... '' جیسے بھٹو کے عہد میں ہی مولانا نورانی کا گریبان پکڑا گیا تھا۔ میں نے راؤ رشید سے کہا' اس طرح بات ہوئی ہوگی کہ ''سرزنش کر دینا یا گریبان پکڑ لینا۔'' بھٹو صاحب نے یہ تو نہیں کہا ہوگا کہ اسے گولی مار دو اور انہوں نے جا کر گولی مار دو جو نواب احمد خان کو لگ گئی اور اتفاق دیکھئے کہ یہ حادثہ وہیں پر ہوا جہاں بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تھی وہاں پہلے بورسٹل جیل تھی اب تو شادمان کالونی بن گئی ہے۔ اس وقت نواب احمد خان نگران مجسٹریٹ تھے۔ ان کی نگرانی میں ہی بورسٹل جیل میں یہ پھانسی دی گئی تھی۔ بھٹو کی پھانسی کا کیس کسی بھی طرح نہیں بنتا تھا۔ ہر چند کہ میرا بارہ سال کا بچہ طاہر عباس مر چکا تھا' اس کا سوئم تھا میں سوگوار بیٹھا تھا کہ بھٹو نے مجھے جیل کے اندر کر دیا۔ میری بیوی آج تک اس واقعہ کو نہیں بھولی۔ پیپلز پارٹی کے لوگوں میں یہ خوبی ہے یا خامی کہ وہ اندھے عقیدت مند ہیں۔ انہیں بھٹو فیملی سے ''اندھی عقیدت'' ہے۔ ہر پارٹی میں یہ بات ہوتی ہے لیکن عبدالولی خان کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ سنٹرل ورکرز کمیٹی میں ہر ایک کی بات سنتے ہیں لیکن طاقت سے اپنی بات منوا لیتے ہیں لیکن جو بھی کرنا چاہتے ہیں اسے پارٹی کے اندر جمہوری انداز سے طے کرتے ہیں۔ بزنجو کے خلاف پارٹی کے اندر اس وقت پچاس ساٹھ تقریریں ہوئی تھیں جب آئین کے مسئلے پر بھٹو کے ساتھ گفتگو

چلی تھی اور کوئی معاہدہ ہوا تھا۔ بزنجو ولی خان سے اختلاف رکھتے تھے۔ وہ کسی بھی صورت میں بھٹو کے ساتھ Confrontation کے حق میں نہیں تھے۔ جب ساری کمیٹی نے کہا کہ اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تو پھر وہ متحدہ محاذ بنا تھا۔ بزنجو صاحب میرے ساتھ جیل میں تھے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ "بھئی میں تو ولی خان کی قید میں ہوں۔ بھٹو کی قید میں نہیں ہوں۔" میں نے ان سے کہا کہ آپ نے کہا تھا کہ پنجاب کا کوئی بھی آدمی ہو جب پہاڑوں پر چڑھ جائیں گے تو وہ ہمارے ساتھ نہیں آئے گا۔ دیکھئے میں پہاڑوں پر تو نہیں آیا۔ آپ کے ساتھ جیل میں بیٹھا ہوں۔

ہول ٹائم لیڈر

ذوالفقار علی بھٹو کو میں اس بات کے لیے Appreciate کروں گا کہ اس نے تمام پاکستان میں رابطہ عوام جاگیرداروں سے زیادہ کیا ہے۔ وہ ہول ٹائم لیڈر بن گیا تھا۔ جب تک کوئی سہروردی' پنڈت نہرو' گاندھی' غفار خان یا بھٹو کی طرح ہول ٹائم لیڈر نہ ہو گا وہ عوام میں اپنی شہرت اور مقام نہیں بنا سکتا۔ میاں محمود علی قصوری ہمارے بزرگ دوست تھے۔ بڑا کام کرتے تھے لیکن وہ بھی جیسے "ہفتہ شجر کاری" ہوتا ہے ایسے ہی "ہفتہ سیاست" منایا کرتے تھے۔ وہ اہل حدیث تھے۔ وہ مجھے شیخ رفیق یا کسی اور کو ساتھ لے لیتے اور اہل حدیث میں جا کر ایک جلسہ برپا کر آتے تھے۔ ان کے جلسے میں دو چار سو آدمی ہوتے تھے۔ جب تک وہ NAP میں رہے وہ رونق نہ ہو سکی۔

مسلم لیگ کی سیاست

سیاست ایک بہت کٹھن اور مشکل راستہ ہے۔ یہاں لوگ ہندوستان کے خلاف ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ ہے جبکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم آزاد اور خود مختار ہوں۔ ہماری خارجہ پالیسی غیر جانبدار ہو۔ یہ کام یہاں مشکل ہے۔ بھٹو صاحب آئے تو انہوں نے بھی ہندوستان کے خلاف "ہزار سال جنگ کرنے" کا نعرہ لگایا تھا یہاں کچھ ایسا ہی مزاج بن چکا ہے۔ گورنمنٹ میں آنے کے لیے کچھ ایسا ہی مزاج ہونا چاہیے۔ یعنی Reactionary سیاست کا علمبردار ہو اور سامراج کے تابع ہونا چاہیے۔ ہم ان دونوں چیزوں کے دشمن ہیں۔ NAP کی جب تک بھی سیاست رہی وہ گورنمنٹ میں نہیں آئے۔ مسلم لیگ والے "ری پبلکن" ہو گئے تھے جب باچا خان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب چیف منسٹر ہوئے تھے۔ ڈاکٹر خان صاحب جو اپنے آپ کو بڑا ہی ایماندار اور نظریاتی سمجھتے تھے تو ان کے ہاں بھی ایکا یک کنونشن لیگ بن گئی تھی پھر ری پبلکن لیگ بن گئی۔ کونسل لیگ بن گئی۔ اب بھی کئی مسلم لیگیں ہیں۔ رنگ اور مزاج

بدلتے رہتے ہیں۔ فوج اور بیوروکریسی کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں اس لیے برسراقتدار آ جاتے ہیں۔ کھوڑو کے زمانے سے لے کر آج تک جمہوریت کو جتنا نقصان مسلم لیگ نے پہنچایا ہے اور کسی نے نہیں پہنچایا۔ جمہوری رو اور جمہوری عمل کو قائم نہیں ہونے دیا۔ اس لیے جتنے بھی غیر مسلم لیگی ہیں وہ یہاں جمہوری عمل کے لیے قربانیاں دیتے رہے ہیں۔ عبدالولی خان مشرقی پاکستان بھی گئے انہیں کہا گیا کہ شیخ مجیب الرحمن سے بات کرو۔ مجھے تو اب اے این پی والے مسلم لیگی لگنے لگے ہیں۔ وہ پاکستان میں جمہوریت کی جنگ لڑتے رہے ہیں اس جنگ میں ان کے لوگ مارے گئے ہیں۔ بھٹو کے زمانے میں ولی خان پر بھی گولی چلی ہے۔ ان کا ڈرائیور مر گیا تھا۔ اس کے بیٹے پر بھی تشدد ہوا تھا۔ انہوں نے ضیاء الحق کی بھی حمایت نہیں کی تھی۔ ہم ولی خان کے ساتھ تھے۔

NAP کی سیاست

ایک دفعہ ہم پشاور گئے۔ پارٹی کا کنونشن تھا۔ بزنجو کارکنوں سے پوچھ رہے تھے کہ "پی پی پی کے ساتھ جو نیا معاہدہ ہوا ہے اس پر چلنا چاہیے یا نہیں۔" سب کی یہ مرضی تھی کہ اس معاہدے پر چلنا چاہیے لیکن پنجاب سے ہمارے ایک دوست فاروق قریشی نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ "ہم لوگ جیلوں میں گئے ہم پر غداری کے الزام عائد ہوئے ہمیں اس معاہدے سے نکل جانا چاہیے۔" اس معاہدے کے ساتھ چل کر ہم پارٹی کو بڑھا سکتے تھے اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکتے تھے لیکن پنجاب کے لوگوں کی وجہ سے وہ معاہدہ ٹوٹ گیا۔ یہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ اس معاہدے کی اپروول پارٹی کی سنٹرل کمیٹی سے لی جانا تھی۔ سنٹرل کمیٹی کی اکثریت اس معاہدے کے خلاف تھی جو بزنجو نے کیا تھا۔ کیونکہ بزنجو ہمارا نمائندہ تھا۔ سنٹرل کمیٹی کے اجلاس میں اس کے خلاف تقریباً 100 تقریریں ہوئی تھیں۔ بزنجو نے بڑے حوصلے کے ساتھ اپنے خلاف یہ تقریریں سنی تھیں' مجھے اس پر ترس آ گیا' لہٰذا میری تقریر اس کے خلاف نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جیل کے اندر بھی بزنجو کہا کرتے تھے کہ "میں تو ولی خان کی جیل میں ہوں' بھٹو کی جیل میں نہیں ہوں۔" میں نے اسے پی کہا کہ میں نے آپ کی اور بھٹو کے ساتھ سمجھوتے کی مخالفت کی تھی کہ بھٹو کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا لیکن آپ کے ساتھ جیل میں بیٹھا ہوں۔ بزنجو میں بڑی خوبیاں تھیں۔ اس نے جیلیں کاٹی تھیں مگر اپنے اصولوں پر قائم رہا۔ جب ارباب سکندر اور بزنجو گورنر ہو گئے تو ولی خان نے مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ "اب آپ NAP کے عہدیدار نہیں رہے ہیں۔" اس کا مقصد یہی تھا کہ NAP کی لیڈری کریں یا گورنریاں کر لیں اور NAP کا لیڈر میں ہی رہوں۔ اس نے اپنی تدبیر سے یہ منوا لیا تھا کہ تم لوگ بھٹو کے گورنر ہو گئے ہو اب تمہارا کوئی Claim نہیں ہونا چاہیے کہ تم NAP کی صدارت کی طرف آؤ اور یہ ایک وجہ اختلاف کی بنی تھی۔ اس لیے انہیں گورنریاں دلوا کر سیاست سے نکال باہر کیا۔ بعد میں وہ اس آگ میں سلگتے رہے کہ ہم کیوں نہ پارٹی کے صدر ہوئے'

صدر بننے کا بھی شوق ہوتا ہے۔عہدیداروں نے بھی ہماری پارٹی کو تباہ کیا تھا۔یہی جھگڑے چلتے رہے کہ ہم سیکرٹری جنرل بنیں۔صدر بنیں۔NAP کے اندر جو لوگ تھے ان کی پنجاب کے بارے میں اچھی رائے نہیں تھی اس لیے پنجاب سے NAP کا کوئی صدر نہیں بن سکتا تھا۔پنجاب کی بیوروکریسی کی وجہ سے یہ وجہ نزاع بنی ہوئی تھی وہ پنجاب کے کسی آدمی کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے تھے۔یہ تعصب تھا اس لیے میاں محمود علی قصوری پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔قصوری صاحب سینئر آدمی تھے اگر انہیں صدر بنا بھی دیا جاتا تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔بہر کیف چاروں صوبوں کے لوگوں نے ولی خان کو صدر چن لیا۔جب پشاور میں کنونشن ہوا تھا تو مجھے انہوں نے پنجاب میں اور نہ ہی سینٹر میں کوئی جگہ دی تھی۔محمود علی قصوری اور سید رفیق طاہر اور دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ حبیب جالب ہماری جیب میں اس لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اس کنونشن کے بعد ولی خان نے ایک جگہ مجھے کہا کہ ''اب ڈھاکہ میں آپ سے ملاقات ہوگی۔''میں نے کہا کہ کیسے ہوگی میں تو سینٹرل کمیٹی کا ممبر نہیں ہوں تو اجمل خٹک نے ولی خان سے کہا کہ ''یاران کا نام آپ دے دیں۔''اس طرح ولی خان نے مجھے سنٹرل کمیٹی کے لیے نامزد کیا تھا۔ہمارے پنجاب کے لوگوں نے نہیں کیا تھا۔

پیپلز پارٹی

میاں محمود علی قصوری الیکشن لڑنا چاہتے تھے۔انہوں نے ادھر ادھر جائزہ لیا اور سوچا کہ وہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ہی الیکشن جیت سکتے ہیں اس لیے وہ پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔وہ وزیر قانون بھی ہو گئے تھے لیکن بھٹو نے انہیں بری طرح زچ کیا تو ہم نے کہا۔''میاں صاحب! آپ بھٹو کو جانتے نہیں تھے؟ وہ تو After-8 یا After-12 کا ہی آدمی ہے۔قصوری صاحب کہنے لگے۔''مجھے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔''میں نے کہا۔''آپ نے ہم سے کب پوچھا تھا۔بھٹو نے ان کو تنگ ہی کیا اور پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل جے اے رحیم کے بچوں کو چوری کے مقدمات میں ملوث کیا اور اس کی بیٹی کے ساتھ کیا کیا تھا۔بہر کیف پیپلز پارٹی ایک بڑی پارٹی ہے۔ہمارا ایک دوست شیخ رفیق احمد ''نیپ فیم'' اس میں شامل ہے۔شیخ رشید ہمارے دوست ہیں۔پرانے مسلم لیگی ہیں اگر انہیں قیوم خان Better لگتا ہے باچا خان سے تو یہ بھی مسلم لیگیت ہے۔یہ لوگ ہجوم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔اگر انہیں کوئی پارٹی پر اعتراض ہے تو پھر باہر آ جائیں۔ہمارا پیپلز پارٹی سے کوئی رابطہ نہیں ہے نہ ہم اس کے ممبر ہیں۔اپوزیشن پارٹی کی حیثیت سے ہم اسے قبول نہیں کرتے ہیں۔ہمارا پیپلز پارٹی سے ویسے بھی تعلق نہیں رہا ہے۔آج بھی نہیں ہے۔لیکن ضیاء الحق کی باقیات کے مقابلے میں بے نظیر بھٹو بہتر ہیں کیونکہ ان کا سیاسی بیک گراؤنڈ ہے۔ہم تو ان لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ہم مکمل جمہوریت چاہتے ہیں مکمل جمہوریت کا دور تو یہاں آیا ہی نہیں ہے۔آج بھی ہم جمہوریت کی بحالی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔یہاں جمہوریت پر ہمیشہ فوج کا سایہ

مسلط رہا ہے۔ ہمارے سیاست دان ہی فوج کو سیاست میں شامل کرنے کی بات کرتے ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں بے نظیر بھٹو کا یہ بیان پڑھا تھا کہ ''ہم فوج کو اقتدار میں شامل نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ ہم مکمل جمہوریت کے لیے لڑ رہے ہیں۔'' اس بیان سے مجھے خوشی ہوئی تھی۔ ہمیں کچھ حوصلہ ہوا ہے کہ بے نظیر بھٹو بھی یہ چاہتی ہیں کہ فوج کو سیاست میں ملوث نہیں ہونا چاہیے اور نہ اسے اقتدار کا حصہ دار بنانا چاہیے۔

مولانا مودودی

یہ لائن کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کی تھی کہ امن اور جمہوریت کے لیے جماعت اسلامی کو بھی ساتھ ملانا پڑے تو ملاؤ۔ چنانچہ اپوزیشن کے اتحاد بنتے رہے ہیں جماعت اسلامی بھی اس میں شامل ہوئی۔ مولانا مودودی میں ایک خوبصورتی یہ تھی کہ اگر جمہوریت کا موضوع زیر بحث ہے تو وہ پھر جمہوریت کی ہی بات کرتے تھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ سوشلزم یا کمیونزم کو گالیاں نہیں دینا شروع کر دیتے تھے۔ جیسا کہ یہاں کے دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ یہ مودودی صاحب میں حسن تھا کہ اگر جمہوریت کا ذکر چل رہا ہے تو جمہوریت پر ہی بات کر رہے ہیں۔ اگر آئین پر گفتگو ہو رہی ہے تو آئین کے متعلق ہی بات کرتے تھے۔ وہ خوبصورت لہجے میں تقریر کرتے تھے۔ وہ ایک اچھے ادیب اور نثر نگار بھی تھے' شعر بھی کہتے تھے۔ میاں محمود علی قصوری کے ہاں اپوزیشن کا ایک اجتماع تھا۔ وہاں مجھ سے فرمائش کی گئی کہ کچھ سناؤ۔ میں نے یہ غزل سنائی تھی کہ

اپنوں نے وہ رنج دیے ہیں بیگانے یاد آتے ہیں
دیکھ کے اس بستی کی حالت ویرانے یاد آتے ہیں
اس نگری میں قدم قدم پہ سر کو جھکانا پڑتا ہے
اس نگری میں قدم قدم پر بت خانے یاد آتے ہیں
آنکھیں پر نم ہو جاتی ہیں غربت کے صحراؤں میں
جب اس رم جھم کی وادی کے افسانے یاد آتے ہیں
ایسے ایسے درد ملے ہیں نئے دیاروں میں ہم کو
بچھڑے ہوئے کچھ لوگ پرانے یارانے یاد آتے ہیں
جن کے کارن آج ہمارے حال پہ دنیا ہنستی ہے

کتنے ظالم چہرے جانے پہچانے یاد آتے ہیں
یوں نی لٹی تھی گلیوں گلیوں دولت اپنے اشکوں کی
روتے ہیں تو ہم کو اپنے غم خانے یاد آتے ہیں
کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالب
چاروں جانب سناٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں

حمید نظامی

غزل کے مقطع کو سید ابوالاعلیٰ مودودی نے دو بار سنا۔ یہ مقطع حمید نظامی کو بھی پسند تھا۔ حمید نظامی اپنے خیالات میں ایک جمہوریت پسند انسان تھے۔ ان کی مری میں ایوب خان سے تلخ انداز میں گفتگو ہو گئی تھی۔ ایوب خان کا لہجہ خاصا توہین آمیز تھا۔ ان کے دل پہ یہ زخم تھا۔ ایک گہرا داغ تھا۔ ان کو سخت تکلیف ہوئی تھی۔ انہیں بھی اس غزل کا یہ مقطع پسند تھا۔ حمید نظامی مرحوم ایک جگہ آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ میں بھی وہاں بیٹھتا تھا تو وہ مجھ سے کہتے۔ ''جالب صاحب وہ کیا تھا؟ کوئی تو پرچم لے کر نکلے.......'' تو پھر میں ان کو سناتا تھا۔ حمید نظامی نے ''نوائے وقت'' میں ''کوئی تو پرچم لے کر نکلے'' کے زیر عنوان ایک ایڈیٹوریل بھی لکھا تھا۔ حمید نظامی انتہائی شریف اور خوددار انسان تھے۔ حکومتیں ان سے لرزتی تھیں اور وہ اپنا احترام کروانا جانتے تھے۔ ان سے اختلاف اپنی جگہ لیکن وہ ایک خوبصورت دل و دماغ کے انسان تھے اور ایک سنجیدہ متین آدمی تھے۔

◆◆◆

چھوڑے ہوئے یار

دلی کلاتھ ملز کے مشاعرے میں ہم جایا کرتے تھے۔ وہاں بہت سارے شعراء سے ملاقات ہوتی تھی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی سے بھی وہیں ملاقات ہوئی تھی وہ میرے بزرگوں کی طرح تھے ان سے میرا تبادلہ خیال ہوا بہت ساری باتیں ہوئیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور دوست ہو گئے۔ میری پہلی کتاب ''برگِ آوارہ'' کا دیباچہ بھی ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ہی لکھا تھا۔ وہاں ساحر لدھیانوی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک دفعہ جب میں اپنا کلام پڑھ چکا تو ساحر مجھے مشاعرہ گاہ سے باہر لے گئے اور کہنے لگے کہ ''شہزادی نیپال نے آپ کو مشاعرے میں سنا ہے وہ آپ کو اپنے ہاں دعوت دینا چاہتی ہے میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں جالب کو آپ کے گھر لے کر آؤں گا۔ مجھے امید ہے آپ میری بات رکھ لیں گے۔'' میں نے ساحر سے کہا کہ شہزادی نے اردو کہاں سے سیکھی ہے؟ کہنے لگے کہ ''اس کا شوہر دلی میں رہتا ہے شاید وہاں سے سیکھی ہے۔ وہ خود اردو سمجھ لیتی ہے۔'' میں نے ساحر لدھیانوی سے کہا کہ آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں ہے جب آپ لاہور میں ''سویرا'' کے ایڈیٹر تھے تو اس وقت میں آپ کے سامنے ایک میز پر بیٹھا کرتا تھا کیونکہ میں نو آموز تھا اور میں آپ کو وہاں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ آپ کے پاس بڑے بڑے شاعر آیا کرتے تھے میں آپ کی ان کے ساتھ Discussion سنا کرتا تھا۔ میرا آپ سے تعارف یکطرفہ ہی تھا۔ میں ہی آپ کو اس وقت بھی جانتا تھا ویسے بھی آپ معروف شاعر تھے۔ میری باتوں کا ان پر اثر ہوا اور ساحر مجھ سے کہنے لگے کہ ''میں آپ کی سچائی اور سادگی کی آپ کو داد دیتا ہوں۔ آپ آج جس مقام پر ہیں یہ آپ کے بڑے شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ آپ ایک مخلص اور سچے آدمی ہیں۔ لوگ تو ایسی باتوں کو چھپایا کرتے ہیں۔'' میں نے کہا کہ میں تو اپنی یہ عزت افزائی سمجھتا ہوں کہ آج میں اس مقام پر ہوں کہ آپ مجھے کسی مشاعرے میں چلنے کی دعوت دے رہے ہیں اس سے زیادہ میری خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے۔ ساحر لدھیانوی سے بمبئی میں بھی ملاقاتیں رہیں وہ ایک عظیم المرتبت شاعر تھے فلمی گیتوں کو انہوں نے ایک حسن بخشا تھا اور غزل و نظم کہنے میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے مجموعہ کلام ''تلخیاں'' نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے بلکہ ان کے لکھے ہوئے گیت فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ ساحر لدھیانوی بہت بڑے شاعر تھے اور بہت بڑے انسان بھی تھے۔

کرشن چندر، عصمت چغتائی

بمبئی کے ایک مشاعرے میں عصمت چغتائی' کرشن چندر اور مجروح سلطانپوری سے بھی ملاقات ہوئی۔ کرشن چندر بڑا خاموش

طبع انسان تھا۔ اس کے افسانوں میں لینڈ اسکیپ شاعری ہوتی تھی۔ وہ بہت ہی متین اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ میں ان کو دیکھ کر حیران اور ششدر رہ گیا کہ یہ آدمی جو اپنے افسانوں میں اتنا گونجتا اور گرجتا ہے اس قدر خاموش طبع ہے مگر بڑا آدمی تو خاموش ہی رہتا ہے اس کا فن بولتا ہے۔ کرشن چندر سے میں بے حد متاثر ہوا۔ وہاں عصمت چغتائی کی خوبصورت اور بے باکانہ گفتگو بھی مجھے یاد ہے۔ وہ محفلوں میں ''مردانہ وار'' ہی بیٹھا کرتی تھیں۔ یہ نہیں تھا کہ وہ بلانوش قسم کی خاتون تھیں لیکن خیال خاطر احباب کے لیے تھوڑا سا ''شوق'' بھی کر لیا کرتی تھیں۔ ان کے فن میں بھی ایک واشگاف اور بے باکانہ گفتگو کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک محبت کرنے والی عورت تھیں اور دوسرے فنکاروں شاعروں اور افسانہ نگاروں کا احترام بھی کرنا جانتی تھیں۔ فکری طور پر وہ سیکولر تھیں۔

شکیل بدایونی، نوشاد

میں بمبئی میں اکثر مجروح سلطانپوری کے ہاں ٹھہرتا تھا۔ ایک دفعہ مجروح بمبئی سے باہر گئے ہوئے تھے تو شکیل بدایونی کے ہاں ٹھہر گیا۔ شکیل بڑے بلند پایہ شاعر تھے۔ انہوں نے بھی فلم کے لیے بڑے معتبر اور معروف گیت لکھے ہیں۔ ان کے قریب ہی موسیقار نوشاد کا گھر تھا۔ بمبئی میں چونکہ کھٹمل بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لیے میں اپنا بستر زمین پر لگا کر سوتا تھا۔ ایک دن میں سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ کسی نے دروازہ Knock کیا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک سانولے رنگ کا آدمی کرتے پائجامے کے لباس میں چپل پہنے ہوئے کھڑا ہے۔ میں نے کہا 'فرمایئے!' کہنے لگے۔ ''شکیل صاحب ہیں؟'' میں نے جواب دیا۔ ''جی' اندر ہیں۔ آپ کی تعریف؟'' کہنے لگے۔ ''جی مجھے نوشاد کہتے ہیں۔'' میں فوراً مودب ہو گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ جناب ہم تو آپ سے ملنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ آج ہی شکیل بدایونی سے بات ہوئی تھی اور طے ہوا تھا کہ آپ سے ملیں گے۔ اب میں نے جو ان سے تغافل برتا تھا اس خفت کو مٹانے کے لیے میں نے اس طرح کور کیا۔ شکیل بھی آ گئے۔ انہوں نے نوشاد صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ انہوں نے کہا کہ جالب صاحب اچھے شاعر تو ہیں مگر بہت اچھا پڑھتے بھی ہیں۔'' اب نوشاد صاحب نے مجھ سے فرمائش کر دی کہ ''کچھ سنائیں۔'' میں نے ان سے کہا کہ آپ کے سامنے ترنم کے ساتھ کیا سنائیں' آپ تو خود بادشاہ ترنم ہیں۔ ہم آپ کے سامنے کیا پڑھیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ''شکیل خود بھی بہت اچھا پڑھتے ہیں لیکن انہوں نے آپ کی بہت زیادہ تعریف کی ہے اس لیے ہم تو آپ کو سننے کے مشتاق ہیں۔'' میں نے پھر انہیں اپنی یہ غزل سنا دی۔

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے

پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دل نغمہ خواں چھوڑ آئے

وہ سبزہ وہ دریا وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے

حسیں پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رت وہ سماں چھوڑ آئے

بہت دور ہم آ گئے اس گلی سے
بہت دور وہ آستاں چھوڑ آئے

بہت مہرباں تھی وہ گلپوش راہیں
مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے

بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں
نشیمن سر گلستاں چھوڑ آئے

یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

چلے آئے ان رہگزاروں سے جالب
مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

اس غزل کو میں نے ترنم کے ساتھ سنایا۔ اس زمانے میں میری آواز بھی اچھی تھی۔ نوشاد صاحب بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ "آپ کی غزل بھی اچھی تھی اور آپ کا ترنم بھی غیر معمولی ہے۔" موسیقار اعظم نوشاد نے ہمیں یوں داد دی۔ ان کی دعوت پر ہم ان کے گھر بھی گئے۔ ایک نشست شعر و سخن ہوئی اور ان کے ساتھ تصویریں بھی کھنچیں۔ نوشاد صاحب سے مل کر جی بہت خوش ہوا اور وہ سخن فہم بھی ہیں اور سخن سنج بھی۔ اگرچہ ایک موسیقار کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا ہے پھر بھی اگر اسے شعر کا ذوق ہو اور وہ حروف سے واقفیت رکھتا ہو تو یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ نوشاد صاحب میں یہ خوبی تھی۔

گوالیار کا مشاعرہ

میں شکیل بدایونی کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں گوالیار سے ایک شاعر مشاعرے میں دعوت دینے کے لیے آئے۔ شکیل نے مدراس جانا تھا' وہاں انہوں نے کسی فلم کے گیت لکھنے تھے۔ انہوں نے معذرت کر لی۔ لیکن اس کا بہت اصرار تھا۔ وہ بضد تھا کہ مشاعرے میں ضرور چلیں۔ شکیل بدایونی نے کہا کہ "میرا تو Contract ہے فلم کا' اس لیے میں تو پابند ہوں۔" انہوں نے میرا اس سے تعارف کرا دیا کہ حبیب جالب پاکستان سے آئے ہیں' نوجوان شاعر ہیں' ان سے آپ درخواست کریں۔ اگر یہ مانتے ہیں تو ان کو لے جائیں مگر یہاں کے شاعروں کے ساتھ آپ کا جو رویہ ہے وہ ان کے ساتھ نہ رکھنا۔ یہ اس Category کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا' ان کو ذرا اچھی جگہ ٹھہرانا' معاوضہ بھی ان کو ٹھیک دینا۔" انہوں نے کہا کہ "جناب یہ تو بہت اچھا ہوگا اگر حبیب جالب ہمارے ساتھ چلیں' ہم ان کو پورا خیال رکھیں گے۔" میں نے بھی حامی بھر لی اور کہا کہ میں دہلی جا رہا ہوں راستے میں گوالیار ہے۔ وہاں مشاعرہ پڑھ کر آگے چلا جاؤں گا۔

خمار بارہ بنکوی وہاں کے مشہور شاعر ہیں۔ غزل بہت اچھی کہتے ہیں ان کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے اور انداز گفتگو بھی الگ ہی ہے۔ بہت ہنس مکھ تھے طبیعت میں فراخی اور شگفتگی تھی۔ شکیل بدایونی نے ان کی ڈیوٹی لگا دی کہ "جالب صاحب کو آپ ریل میں سوار کرا دیجئے گا۔ چنانچہ وہ مجھے ریلوے اسٹیشن لے گئے اور انہوں نے ٹی ٹی کے حوالے مجھے کیا اور ان کے کان میں کچھ کہا۔ اب پتہ نہیں کہ انہوں نے اس کے کان میں کیا کہا۔ گاڑی چل پڑی۔ وہ ٹکٹ چیکر میرے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ اپنا کام

کریں۔ جائیں ٹکٹ وغیرہ چیک کریں۔ وہ کہنے لگا کہ "جناب میں آپ کے لیے بیٹھا ہوں۔ خمار صاحب نے کہا تھا کہ ان کا خیال رکھنا۔" ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک سکھ لڑکا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ سلسلہ تعارف شروع ہوا۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے اور میں شاعر ہوں' تو ان لوگوں کی طرف سے فرمائش ہوگئی۔ اب چونکہ ان ہم سفروں کے ساتھ میرا ایک تعلق سا بن گیا تھا اس لیے میں کچھ اخلاقی طور پر پابند بھی ہو گیا تھا اس لیے میں نے ان کی دلجوئی کے لیے ان کے حکم کی تعمیل کی اور وہ مجھے سن کر بہت خوش ہوئے۔ وہ ٹکٹ چیکر بھی بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا۔ "صاحب آپ تو بڑے اچھے شاعر ہیں۔ مجھے تو حیرت ہوئی ہے کہ خمار صاحب نے ایسا کیوں کہا تھا کہ آپ کا خیال رکھوں' آپ سفر کے دوران اتر جاتے ہیں۔ منزل پر نہیں پہنچتے۔ مجھے تو آپ میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔" میں نے ان کو جواب دیا کہ یہ عیب آپ میں ہو تو ہو مجھ میں تو نہیں ہے۔ ویسے خمار صاحب کی مذاق کرنے کی عادت ہے۔ انہوں نے ایسا کہہ دیا ہوگا۔ سکھ لڑکا بھی میرا دوست ہو گیا تھا۔ میرے پاس ایک بیگ تھا جو میری بغل میں ہی رہتا تھا۔ اس میں میرا پاسپورٹ تھا۔ اگلے اسٹیشن پر اس لڑکے نے کہا کہ "آیئے ڈائننگ کار میں چل کر چائے پیتے ہیں۔" میں نے کہا' چلیے! ڈائننگ کار پر اسٹوڈنٹس کا قبضہ تھا' بہت رش تھا۔ اس رش میں سوار ہونا محال نظر آتا تھا۔ سکھ لڑکا تو اندر گھس گیا لیکن میری بغل میں چونکہ بیگ تھا اور وہ چڑھنے کی کوشش میں بار بار نیچے گر پڑتا تھا۔ میں سوار نہ ہو سکا۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی اور میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ اب وہ جو خمار صاحب نے اس ٹکٹ چیکر کے کان میں سرگوشی کی تھی کہ یہ گاڑی سے اتر جائے گا....... وہ واقعہ سچ ثابت ہو گیا۔ اب وہ ٹکٹ چیکر پریشان ہوا ہوگا کہ کتنے اچھے شاعر ہیں بس ایک ہی عیب ہے کہ گاڑی سے نیچے اتر جاتے ہیں۔ میں جہاں رہ گیا تھا وہ للت پور کا اسٹیشن تھا۔ للت ایک راگ ہوتا ہے یہ اس کے نام پر چھوٹا سا شہر تھا میں نے وہاں سے ٹیلیفون کر کے گوالیار اطلاع دے دی۔ اب وہ پہلا ٹکٹ کلکٹر جو میرا مداح ہو گیا تھا اور جس کے سپرد مجھے کیا گیا تھا وہ افسوس کر رہا تھا' ڈبے میں میرا سامان رہ گیا تھا۔ سامان تو اصولی طور پر کلاک روم میں جاتا ہے۔ لیکن ڈبے کے تمام مسافروں نے یک زبان ہو کر کہا کہ "وہ بڑے اچھے شاعر ہیں پاکستان سے آئے ہیں ہم ان کا سامان کلاک روم میں نہیں جانے دیں گے بلکہ یہ سامان گوالیار جائے گا جہاں انہوں نے ٹھہرنا تھا۔" دوسرا ٹکٹ کلکٹر ڈیوٹی بدلنے پر آیا اس نے یہ ماجرا دیکھا تو بولا۔ "میری ملازمت کو اتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ میں نے تو ایسا شخص کوئی نہیں دیکھا۔ جس کی سارے ڈبے والے تعریف کرتے ہوں اور اس کے سامان کی حفاظت کر رہے ہوں۔ میرے دل میں تو یہ اشتیاق پیدا ہو گیا ہے کہ اس شاعر سے ملوں اور اسے سنوں۔"

میں رات دس بجے گوالیار پہنچ گیا۔ وہاں دعوت دینے والے صاحب آئے ہوئے تھے انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہوں

نے کہا "اگر آپ اور زیادہ لیٹ ہو جاتے تو ہم مشاعرہ ساری رات جاری رکھتے۔ شکر ہے آپ بخیریت آ گئے۔" وہ مجھے گوالیار میں "لاہور ہوٹل" لے گئے اور وہاں جا کر ٹھہرایا اور مجھ سے کہنے لگے۔ "دیکھئے یہاں کے جو شاعر ہیں' میں ان سے ذرا آپ کو الگ رکھوں گا اور آپ کی جو تواضع مدارت ہوگی اس میں بھی وہ شامل نہیں ہوں گے آپ ہی کو صرف وہ لوازمات میسر ہوں گے۔" میں نے اس سے کہا کہ بھئی تم کیا کہہ رہے ہو۔ اکیلے وکیلے کچھ نہیں ہوگا یہاں ساؤ تھکنت آیا ہوا ہے میں تو خود اپنے ہاتھوں ان کی خاطر داری اور تواضع کروں گا۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ "لاہور ہوٹل" کے مالک کو بلوائیں۔ اس کے مالک ایک لالہ جی تھے۔ وہ آئے' میں نے اس سے کہا کہ میں لاہور سے آیا ہوں۔ اس نے جب یہ سنا تو بہت خوش ہوا اور پنجابی بولنے لگا۔ اس نے اپنے ملازموں کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ "اوئے منڈیو! ایدھر آؤ' اٹھاؤ سامان تے کسے چنگے کمرے وچ لے چلو۔ اوئے لاہور توں ساڈا بندہ آیا ہویا اے۔" اس نے میری بڑی عزت افزائی کی۔ دوسرا کمرہ جو نسبتاً اچھا تھا' اس میں منتقل کر دیا۔

گیارہ بجے مشاعرہ گاہ پہنچے۔ میں نے قمیض اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ ان دنوں میں Slim اور نوجوان تھا۔ اب ہر شاعر نے شیروانی پہنی ہوئی تھی۔ مجھ سے تقریباً سب ہی سینئر تھے۔ مجھے دیکھ کر کسی کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ پاکستان سے آیا ہوا شاعر حبیب جالب ہے۔ میں وہاں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ڈیڑھ بجے میری باری سنانے کی آئی۔ میں چونکہ وہاں مہمان تھا۔ اب انہی میزبان نے اپنی "کمپنی کی مشہوری" کے لیے ہمارے بارے میں فرمایا کہ "اس شہر میں فراق آ چکے ہیں' ساحر آ چکے ہیں' سردار جعفری آ چکے ہیں' شکیل بدایونی آ چکے ہیں ان سب کا استاد حبیب جالب آیا ہے۔ آپ انہیں سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے' تڑپ اٹھیں گے' کیا لکھتا ہے...... کیا پڑھتا ہے۔" انہوں نے تعارف ہی تعارف میں مجھے اتنا اوپر اٹھا دیا جیسے وہ "مغل اعظم" کے مکالمے بول رہے ہوں۔ اب میں پریشان تھا کہ یہ کیا ہوا میرے ساتھ۔ اس نے میرے بارے میں جو کہا ہے' وہ تو میں نہیں ہوں۔ میں تو ان اساتذہ سے جن کا اس نے ذکر کیا ہے بہت جونیئر ہوں۔ جب میں مائیک پر آیا تو لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا کہ یہ کہاں کا استاد ہے! یہ تو خود طالب علم لگتا ہے۔ میں نے کہنا شروع کیا۔ "حضرات! آپ کا ہنسنا بجا ہے۔ یہ جو آپ ہنس رہے ہیں یہ آپ تعارف کرانے والے صاحب کے جھوٹ پر ہنس رہے ہیں۔ جب شکیل بدایونی نے مجھے ان کے حوالے کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا تو انہوں نے میرے ساتھ یہ "سلوک" کیا ہے۔ جو میرے اساتذہ میرے سینئر ہیں اور جن کا میں بے حد احترام کرتا ہوں ان کا مجھے استاد بنا دیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے یہ سب اپنی کمپنی کی مشہوری کے لیے کیا ہے' اس پر آپ ہنسیں نہ بلکہ روئیں اور جب میں گوالیار آ رہا تھا تو ریل میں سوچ رہا تھا کہ میں وہاں اپنا کلام سنانے جا رہا ہوں جہاں تحریک آزادی ہندوستان کی سب سے

بڑی مجاہدہ جھانسی کی رانی دفن ہے اور جہاں تان سین کا مزار ہے۔ میں جب اس شہر کی طرف آ رہا تھا تو بہت ہی لرزاں تھا کہ میں ایسے عظیم المرتبت سامعین کے سامنے کیا کلام پیش کروں گا۔"

جب میں نے یہ مختصری تقریر کی تو اس پر تالیاں بج گئیں۔ پھر میں نے کہا۔ "آپ مجھے ان صاحب کے جھوٹ سے الگ کر کے سنیں اور میں نے اتنا "معر جھوٹا" آج تک نہیں دیکھا۔" جب میں نے مشاعرے میں اپنا کلام سنایا تو لوگوں نے بہت پسند کیا اور سنتے چلے گئے۔ میں نے مشاعرے میں اپنی پانچ چھ غزلیں سنائیں۔ دوسرے دن گوالیار میں میرا چرچا تھا۔ اب وہی میزبان صاحب مشاعرے کے بعد مجھے کہہ رہے تھے کہ "ہم نے تو یہی سوچا تھا کہ آپ کو لوگ سنیں گے اور داد بھی ملے گی۔" میں نے ان سے کہا کہ آپ کی مہربانی اور شکریہ آپ نے تو مجھے فلاپ کر دیا تھا۔ یہ انداز گفتگو غلط تھا۔ بہرکیف یہ آپ کا اپنا ایک انداز ہے آپ کی مہربانی ہے۔

لاہور ہوٹل کا مالک بھی بہت خوش تھا۔ وہاں مجھے ایک نوجوان لڑکا ملا۔ اس نے مجھے کہا کہ "جب آپ لاہور اسٹیشن پر اتریں تو لاہور کو میرا اسلام کہیے گا۔" گوالیار میں مشاعرے کے سامعین کا یہ عالم تھا کہ پاکستان کے شاعران کے معیار پر پورا نہیں اترتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا تہذیب اور ادب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کچھ ایسا ہی تاثر میں نے وہاں محسوس کیا تھا مگر جب انہوں نے مجھے سنا تو بے پناہ داد دی اور بہت خوش ہوئے۔ وہاں مشاعرے میں جب میں نے اپنے یہ شعر پڑھے۔

نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں
خدا کا نام کوئی لے تو چونک اٹھتے ہیں
ملے ہیں ہم کو وہ رہبر خدا کے رستے میں

وہاں علامہ انور صاحب صابری احراری ہوا کرتے تھے وہ فوراً مائیک پر آئے اور کہا کہ واہ واہ کیا شعر کہا ہے کہ

خدا کا نام کوئی لے تو چونک اٹھتے ہیں
ملے ہیں ہم کو وہ رہبر خدا کے رستے میں

"حبیب جالب نے جو یہ چودہ سال پاکستان میں گزارے یہ اس کی کہانی ہے۔ اسکی روداد اور داستان ہے۔" وہ جب مائیک سے ہٹے تو میں نے کہا۔ "شعر کبھی کبھی علامہ حضرات کے سر سے بھی گزر جاتا ہے۔ شعر جو ہے انٹرنیشنل ہے۔ خدا پاکستان میں ہی نہیں

ساری دنیا میں ہے۔ اس لیے میں نے پاکستانی سیاست کے پیش نظر تو شعر نہیں کہا ہے' یہاں جیسے علامہ صاحب نے پاکستانی خدا کو Exploit کر لیا ہے تو یہ سراسر Exploitation کی بات ہے۔" دوسرے دن صبح ہوتے ہی ایک نیشنلسٹ میرے پاس آیا' کہنے لگا کہ "کل تو آپ نے کمال کر دیا۔ اس علامہ انور صابری کو بہت اچھا جواب دیا۔ آپ تو بڑے باہوش آدمی ہیں ورنہ آپ کا تو پاکستان میں داخلہ ہی بند ہو جاتا۔" اس نے تو بڑی سوچی سمجھی سازش کی تھی۔" میں نے کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کہاں کیا بات کرنا چاہیے۔ ہم تو دونوں ملکوں کے عوام کے حق میں بات کرتے ہیں۔ مجھے پاکستان کے عوام نے پیار دیا ہے تو ہندوستان کے عوام بھی مجھے بہت پسند کرتے ہیں۔ میں نے انڈیا میں یہ بات محسوس کی ہے۔ جنگ نہ ہندوستان کے عوام کے لیے بہتر ہے اور نہ پاکستان کے عوام کے لیے سود مند ہے۔ ہم اس منافرت اور جنگ و جدل کے خلاف ہیں اور دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کا مضبوط رشتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو

یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ اس کے بعد تو میرا پاسپورٹ ہی ضبط ہو گیا۔ ۳۳ برس تک ضبط رہا۔ میں دوبارہ ہندوستان نہ جا سکا۔ اس زمانے میں ہر سال ہم دلی کلاتھ ملز کے مشاعرے میں جایا کرتے تھے۔ اس مشاعرے کے منتظمین کا گروپ بہت اچھا تھا۔ ان کا سیکولر ذہن تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو جو پرائم منسٹر تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ "ہم پاکستانی شعراء کو سننا چاہتے ہیں۔" ہم پرائم منسٹر ہاؤس گئے۔ میرے ساتھ شوکت تھانوی' حفیظ جالندھری اور تلوک چند محروم اور ایک دو اور شاعر بھی تھے۔ اس مشاعرے کی صدارت پنڈت نہرو کر رہے تھے' اگر انہیں کسی شاعر کا شعر پسند آتا تو پنڈت جی خفیف سی گردن ہلا دیتے تھے۔ جیسے دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ مکرر' واہ واہ' پھر کہیے۔ وہ ایسا نہیں کہتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو بہت پڑھے لکھے' ذہین' عالم اور باعمل سیاست دان تھے ان میں کوئی بناوٹ یا تصنع نہیں تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک Diginity تھی۔ اٹھنے بیٹھنے میں ایک وقار جھلکتا تھا ان میں بے تابانہ داد دینے کا انداز میں نے نہیں دیکھا۔ حفیظ جالندھری کو بھی سنا گیا۔ انہوں نے اپنا گیت سنایا تھا۔ میں نے فرمائش کے تحت یہ غزل سنائی۔

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے

چھوڑے ہوئے دیاروں کو دیکھنے کی ہمیں آرزو تھی۔ میں نے وہاں برسر مشاعرہ کہا تھا کہ سیاسی طور پر ان چھوڑے ہوئے دیاروں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا لیکن

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

وہاں ایک میٹنگ لگی ہوئی تھی جو ہجرت سے متعلق تھی۔ مہاجرین آ جا رہے ہیں۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر۔ میری غزل اس میٹنگ کا اظہار تھی جسے پنڈت جی نے بھی پسند کیا تو یہ دکھ دونوں طرف تھا کہ یہ اتنا بڑا Unrest کیوں ہوا۔ حفیظ جالندھری نے آگے بڑھ کر پنڈت نہرو سے تلوک چند محروم کے وظیفے کی سفارش کر دی کہ یہ وظیفہ انہیں دیا جائے۔ انہوں نے حامی تو نہیں بھری بات سن لی۔ بس ہو جائے گا کا تاثر دیا تھا۔ ہماری ان سے گفتگو نہیں ہوئی۔ انہیں کسی دوسری میٹنگ میں بھی جانا تھا۔ وہ اندر چلے گئے اور دوسری شیروانی بدل کر پھول لگا کر آ گئے۔ شیروانی کے ساتھ پھول لگانا ان کی عادت تھی۔ وہ ڈیڑھ منٹ میں ہی آ گئے تھے۔ اس زمانے میں اندرا گاندھی سیاست میں نہیں آئی تھیں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ دوسرے کمرے میں بیٹھی مشاعرہ سن رہی تھیں۔ پنڈت نہرو کو اپنا کلام سنانے کا ہمیں شرف حاصل ہوا تھا۔

مٹی کی ٹھنڈک

میرے پاس پی کلاس ویزہ تھا۔ میں جب وہاں مشاعرے میں جاتا تھا تو میرے پاس ایک بیگ ہوا کرتا تھا۔ سامان وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ آتے ہوئے بھی کوئی سامان نہیں لاتا تھا۔ ادھر والے لوگ سمجھتے تھے یہ کوئی درویش آدمی ہے نہ کچھ لاتا ہے نہ لے جاتا ہے۔ میرے ساتھ کوئی بکس یا صندوق نہیں ہوتے تھے۔ دہلی میں میرا ایک دوست امیر دہلوی رہتا ہے جو ہوٹل کے مالکان میں سے ہیں۔ امیر دہلوی میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم چھٹی جماعت میں اکٹھے ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے بھی میرے اعزاز میں ایک دو نشستوں کا اہتمام کیا تھا۔ ایک مشاعرہ امرتسر میں تھا۔ گوپی چند نارنگ نے مجھ سے کہا کہ آپ کو وہاں جانا چاہیے۔ میں نے کہا کہ وہ معاوضہ بہت تھوڑا دیتے ہیں۔ میں اسے عزت افزائی نہیں سمجھتا' میں تو واپس پاکستان جا رہا ہوں کیونکہ میرے والد صاحب کا خط آیا ہے۔ میرے والد صوفی عنایت اللہ مرحوم بہت سادہ آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے ای پوسٹ کارڈ لکھ دیا تھا کہ گھر کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ انہوں نے تمام حالات صاف صاف پوسٹ کارڈ میں لکھ دیئے تھے۔ والد صاحب ایک شریف النفس انسان تھے۔ زیادہ چالاک آدمی نہیں تھے۔ میں نے وہ کارڈ دیکھا تو چل پڑا۔

جالندھر کا اسٹیشن آیا تو وہاں گاڑی نے گھنٹہ بھر رکنا تھا۔ میں اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ وہاں موٹریں کھڑی تھیں اور آوازیں آ رہی تھیں ٹانڈہ...... ٹانڈہ۔ یہ وہ قصبہ تھا جہاں میرے بھائی مشتاق نے ہمیں جانے کو کہا تھا۔ میرے پاس چونکہ پی

کلاس کا ویزہ تھا' صرف چوبیس گھنٹے ہی یہاں Stay کر سکتا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں ٹانڈہ جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ امیر دہلوی نے مجھے پاجامہ کرتہ شیروانی اور چپل دی تھی جو میں پہنے ہوئے تھا۔ میں ہندوستانی لباس میں ''ہندوستانی'' ہی لگ رہا تھا۔ لوگ مجھے پہچان نہیں سکتے تھے۔ میں ٹانڈے اتر گیا۔ وہاں سے میرا گاؤں میانی افغاناں ساڑھے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ پکی سڑک بن چکی تھی۔ میرے بچپن میں تو وہاں کچا راستہ تھا جس کا اپنا ایک مزا تھا۔ جب ہم گرمیوں میں ننگے پاؤں چلتے تھے تو اس مٹی کی ٹھنڈک بہت بھلی لگتی تھی۔ دو رویہ درخت تھے' ان کی چھاؤں تھی لیکن وہ کچا راستہ پکی سڑک بن چکا تھا۔ میں سائیکل رکشہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے ایک سردار چلا رہا تھا۔ اس نے مجھے قصبے کے پاس سلاٹر ہاؤس کے سامنے اتار دیا۔ وہاں سے پیدل ہی گاؤں کی طرف چل پڑا۔

گاؤں کا نقشہ میرے ذہن میں تھا۔ پٹھانوں کے گھر تھے۔ ان کے کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ خواتین اپنے رواج کے تحت باہر بیٹھی چرخہ کات رہی تھیں۔ سب مل جل کر بیٹھا کرتے تھے۔ کوئی روک یا پردہ نہ ہوتا تھا۔ یہ ہماری روایت اور تہذیب تھی مگر میں نے دیکھا اس تہذیب کے نشانات بھی نہیں رہے تھے۔ وہ ندی بھی سوکھ گئی تھی جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اس پر ایک پکا پل قائم تھا' ایک کھجور کا درخت جو بہت گھنا تھا' وہ بھی دکھائی نہ دیا۔ میں جب اپنی نانی کے ساتھ ازار بند بیچنے جایا کرتا تھا تو نانی اس کھجور کے درخت کے بارے میں کوئی کہانی سنایا کرتی تھیں' کیونکہ اسے کہانیاں گھڑنے کا ڈھب آتا تھا اور اس کے سنانے کا انداز بھی اپنا ہوتا تھا۔ نانی نے اس کھجور کے درخت کے بارے میں یہ بتایا تھا کہ یہاں ایک سانپ رہتا ہے اور اس کی کوئی لمبی سی کہانی سناتی تھی۔ جب بھی وہ درخت آتا تھا تو میں خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ میری نانی ایک خاص دعا پڑھ کر مجھ پر پھونک مارتی تھی اور ہم ادھر سے گزر جاتے تھے۔ کوئی نشان نہ رہے۔ وہ جو تھے' مزار تھے اور قبرستان تھا۔ ایک خاص جگہ کو ''بنا'' کہتے تھے۔ درخت جو تھے اس کو کاٹ کے وہیں قبر بناتے تھے' اس میں شہتیر لگاتے تھے وہ جگہ بھی نہیں تھی۔ اس کی جگہ آبادی بن گئی تھی۔ میں وہاں سے ہوتا ہوا ایک گلی میں ایک سنار کے مکان پر پہنچ گیا جس کا لڑکا مہک رام تھا۔ وہ میرے بھائی مشتاق مبارک کا کلاس فیلو تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ اوپر سے آواز آئی۔ ''کون ہے؟'' میں نے کہا کہ نیچے تشریف لایئے۔ وہ آیا اور کہا کہ ''مہاراج میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' میں نے کہا کہ میں مشتاق کا بھائی حبیب ہوں۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور کہا ''اوے حبیب تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟'' وہ مجھ سے لپٹ گیا اور پھر کچھ خوفزدہ سا ہوا' وہ مجھے اندر لے گیا۔ ان کی حالت بہتر نہیں تھی۔ وہ متوسط درجے کے مغل تھے۔ مجھے اس نے چائے پلائی۔ میں نے اس سے کہا کہ تم کچھ خوفزدہ سے ہو گئے ہو' خوفزدہ نہ ہو' میرے پاس پاسپورٹ اور ویزہ ہے۔ میں شاعر ہو گیا ہوں اور تمہارے پرائم منسٹر پنڈت جواہر لال نہرو کو کلام سنا کر آ رہا ہوں۔ ڈی سی کنور مہندر سنگھ بیدی میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ تم خواہ مخواہ گھبرا گئے ہو۔ مت گھبراؤ

اور تمہیں کچھ گانے وانے کا شوق تھا۔ اب بھی ہے؟ اس نے کہا ''ہاں ہے۔'' میں نے کہا ہم تمہیں کسی فنکشن میں پاکستان بلائیں گے تم ضرور آنا۔ اس طرح میں نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ اس کو حوصلہ دیا۔ میں نے اسے کہا کہ تم مجھے میرا گھر تو دکھادو۔ اس نے مجھے ٹال دیا اور کہنے لگا کہ ''کبھی اکٹھے ہو کر آنا تو اپنا گھر دیکھ لینا۔'' اس نے مجھے میرا گھر نہیں دکھایا۔ میں نے اس سے اپنے دادا کے بارے میں پوچھا جسے سب لوگوں تایا تایا کہتے تھے۔ تایا فضل کے نام سے وہ جانا جاتا تھا۔

ہمارے دادا تقسیم کے وقت وہیں رہ گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میرا کیا ہے کسی مسجد میں نماز پڑھ لیا کروں گا۔ مکان خاصا بڑا تھا۔ ہمارے مکان میں کنواں تھا۔ ایک چھوٹی سی باغیچی بھی تھی۔ گائے بھینس اور گھوڑے باندھنے کے لیے جگہ بھی تھی۔ محلے بھر کی عورتیں ہمارے گھر سے پانی بھرتی تھیں۔ اس نے کہا کہ میں یہیں رہوں گا تو زندگی گزر جائے گی۔ میرا دادا گائیڈ ہوا کرتا تھا۔ کھانے اور کیک وغیرہ بھی بنایا کرتا تھا۔ جو کوئی بڑا آدمی آتا تھا اسے گھماتا تھا۔ پورا ہندوستان دکھاتا تھا۔ بڑے آدمیوں کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے بھی اس کا ایک دبدبہ تھا۔ خود بھی اسے کھانے پینے کا شوق تھا یعنی ''مشروب مغرب'' سے بھی مستفیض ہوا کرتا تھا۔ یہاں پاکستان میں کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ جہاں ہم دادا کو چھوڑ آئے تھے وہاں کسی نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ قبضہ فطری تھا کیونکہ یہاں کے مکانوں پر بھی ہندوستان سے آنے والوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ ایک روایت میں نے یہ سنی تھی کہ اس قبضے کے دوران دادا کو قتل کر دیا گیا تھا۔ تقسیم کے وقت فطرت اور منافرت عروج پر پہنچ گئی تھی۔ دنیا ہوش وحواس کھو بیٹھی تھی۔ لوگ پاگل ہو گئے تھے۔ انسانیت مر چکی تھی اور احساس ختم ہو چکا تھا۔ جب میں نے مہک رام سے پوچھا کہ ہمارے دادا کا کیا بنا' وہ زندہ ہیں یا مر گئے؟ تو اس نے جواب نہ دیا۔ بس اتنا ہی کہا کہ ''پھر بتائیں گے۔'' کیونکہ وہاں سکھوں کا ہولڈ ہو چکا تھا اور وہ ہندو تھا اس لیے وہ کوئی بات بتانے سے گریز کر رہا تھا' ڈرتا تھا۔ اس لیے اس نے مجھے میرا گھر بھی نہیں دکھایا۔ واپس آتے ہوئے اس نے میرا چھوٹا بیگ اٹھالیا اور مجھے سلاٹر ہاؤس کے پاس ہی سائیکل رکشے میں بٹھا دیا۔ کسی نے بھی مجھے نہیں پہچانا۔ میری گفتگو اور لباس سے یہی لگتا تھا کہ میں ہندوستان کا ہی شہری ہوں میں دوبارہ ٹانڈہ اسٹیشن پر آ گیا۔ جالندھر سے گاڑی میں بیٹھ کر میں پاکستان میں آ گیا۔ یوں میں نے اپنے گاؤں کو آدھے سے بھی کم دیکھا۔ تمام سیاسی باتوں سے قطع نظر گھر کی یاد بھلائے نہیں بھولتی۔ جہاں آدمی پیدا ہوتا ہے اس کی جنم بھومی اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ چھوڑی ہوئی جگہ کو کیسے بھلا سکتے ہیں وہ Haunt کرتی رہتی ہے۔

فراق گورکھپوری

دہلی میں ایک مشاعرہ تھا۔ جس میں ساحر لدھیانوی' علی سردار جعفری' سکندر علی وجد' خواجہ احمد عباس اور فراق گورکھپوری بھی

تھے۔ میں تو فراق صاحب کا بے حد مداح ہوں۔ ایک زمانے میں ہندوستان میں فراق صاحب کے سب ہی مداح تھے اور ان کے خوشہ چین تھے۔ یہاں ہمارے ایک دوست ناصر کاظمی بھی ان کے متاثرین میں سے تھے۔ ناصر کاظمی اچھے دوست تھے۔ میرے ہم عصر تھے۔ وہ ٹی ہاؤس میں بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بات فراق صاحب کی چل نکلی۔ میں نے لفظ فراق کہا ہی تھا کہ ناصر کاظمی نے فوراً کہا ''کون فراق' کیسا فراق' کس کا فراق۔'' میں نے کہا ''تمہارا تو دماغ ہی آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ فراق تمہارا باپ اور کون!'' اس پر وہ ہنس پڑے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ''ارے یار! تم سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کہاں رہتے ہو؟'' میں نے کہا کہ ''تم سے ملاقات کیا ہو! ابھی میں نے بات فراق صاحب کی کرنا چاہی اور تم نے کہہ دیا کون فراق...... ہم فراق صاحب کا بہت ادب کرتے تھے کیونکہ وہ ایک صاحب طرز شاعر تھے۔ اپنا اسلوب رکھتے تھے۔ دہلی کے ایک مشاعرے میں میں نے یہ غزل پڑھی۔

جن کی آنکھیں غزل ہر ادا شعر ہے
وہ مری شاعری ہے مرا شعر ہے
وہ حسیں زلف شب کا فسانہ لیے
وہ بدن نغمگی وہ قبا شعر ہے
وہ تکلم لہکتی ہوئی چاندنی
وہ تبسم مہکتا ہوا شعر ہے
پھول بھی ہیں بہاریں بھی ہیں گیت بھی
ہم نشیں اس گلی کی فضا شعر ہے
جس سے روشن تھا دل وہ کرن چھن گئی
اپنے جینے کا اب آسرا شعر ہے
اپنے انداز میں بات اپنی کہو
میر کا شعر تو میر کا شعر ہے
میں جہان ادب میں اکیلا نہیں
ہر قدم پر مرا ہم نوا شعر ہے

عرش پر خود کو محسوس ہم نے کیا
جب کسی نے کہا واہ کیا شعر ہے
اک قیامت ہے جالب یہ تنقید لو
جو سمجھ میں نہ آئے بڑا شعر ہے

اس غزل میں ایک شعر تھا' میں نے کہا فراق صاحب ملاحظہ فرمایئے' عرض کرتا ہوں کہ

اپنے انداز میں بات اپنی کہو
میر کا شعر تو میر کا شعر ہے

اس پر فراق صاحب نے داد نہیں دی بلکہ ایک ہنکارا سا ابھرا ''ہونہہ'' اب اسٹیج سے بھی اور سامعین بھی مجھے داد دے رہے ہیں۔ ساحر لدھیانوی' سردار جعفری' سکندر ولی وجد اور خواجہ احمد عباس کہہ رہے ہیں کہ پھر پڑھو۔ میں نے پھر کہا' فراق صاحب ملاحظہ فرمایئے۔

اپنے انداز میں بات اپنی کہو
میر کا شعر تو میر کا شعر ہے

مشاعرہ ختم ہو گیا۔ فراق صاحب واپس اپنے شہر گورکھ پور چلے گئے۔ ایک مشاعرہ کلکتہ میں تھا۔ وہاں بھی میں نے پڑھا تھا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی ناظم مشاعرہ تھے جو ایک نہایت مخلص انسان تھے۔ انسان کا لفظ شاید ان کے لیے ہی بنا ہے۔ ان میں کوئی تعصب نہیں تھا۔ مسلمان شعراء کی جتنی خدمت انہوں نے کی ہے' کسی مسلمان بادشاہ' راجہ یا نواب نے بھی نہیں کی ہو گی۔ وہ صرف مسلمان شاعروں پر ہی مہربان نہ تھے بلکہ نریش کمار شاد کی بھی انہوں نے بڑی خدمت اور پذیرائی کی تھی۔ انہوں نے مجھے اس مشاعرے کے لیے بلوایا تھا۔ میں براڈوے ہوٹل کلکتہ میں تنہا کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ منتظم مشاعرہ میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ ''آپ کو مشاعرہ میں کب لائیں اور آپ کچھ ''مشروب مغرب'' بھی شوق کریں گے' پہلے پیتے ہیں یا مشاعرے کے بعد پئیں گے؟'' میں نے کہا کہ آپ کو کس نے بتا دیا ہے کہ میں پیتا ہوں۔ میں تو نہیں پیتا۔ وہ صاحب دیال سنگھ کالج لاہور میں پروفیسر رہ چکے تھے۔ وہ حیران ہوئے اور بولے کہ ''آپ کے پاکستان کے شعراء نے ہمیں خطوط لکھے ہیں کہ آپ مائیک پر آ کر واویلا کرتے ہیں۔ مشاعرہ تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور آپ آ کر گر جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''دیکھ لیجئے' میں تو یہ شوق ہی نہیں کرتا ہوں۔'' میں سمجھ گیا تھا کہ میرے

خلاف بہت زہر اگلا گیا ہے۔ میں براڈوے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میری جیب میں پیسے تھے' نیچے بار تھی۔ میں وہاں سے منگوا سکتا تھا۔ میں نے سوچا' اس چھوٹی سی بات کے لیے ان کا کیوں احسان اٹھایا جائے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ فراق صاحب کے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے کہا۔ ''فراق صاحب! آداب عرض'' مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ ''بھئی آداب وداب بعد میں' پہلے یہ بتایئے آپ نے ہمیں دلی میں وہ شعر سنا دیا۔ ہم نے اگر باندازِ میر چار پانچ غزلیں کہہ دیں تو آپ نے ہم پر تنقید کر دی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کی وہ غزلیں کہاں پڑھی ہیں۔ میں نے تو آپ کا کلام ''رمز و کنایات'' اور ''شبستان'' ہی پڑھا ہے میں تو آپ کو صاحب طرز شاعر مانتا ہوں اور آپ کا طالب علم ہوں۔ ایک نوجوان انکے ساتھ بیٹھا ہوا تھا شاید ان کا شاگرد تھا۔ اس نے میری حمایت کرتے ہوئے کہا کہ ''حبیب جالب تو آپ کے بڑے عاشق ہیں۔'' فراق صاحب پھر بولے کہ ''اچھا صاحب! ہم تو حیران ہوئے تھے کہ ہمارا دوست نوجوان پاکستانی شاعر حبیب جالب جن کا ہم نے الہ ریڈیو سے ذکر کیا تھا اور اپنے تذکروں اور مضامین میں بھی ان کی شاعری کے بارے اچھی رائے دی ہے۔ وہ ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ ہمارے دوست کو کیا ہوا۔'' میں نے کہا ''فراق صاحب' میں نے تو ناصر کاظمی' خلیل الرحمن اعظمی اور ایک آدھ شاعر کے پیش نظر یہ شعر کہا تھا کہ

اپنے انداز میں بات اپنی کہو
میر کا شعر تو میر کا شعر ہے

پھر انہوں نے کہا ''ہاں بھئی گلاس لاؤ'' اور ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے فراق صاحب کے حساب میں اپنا ''شغل'' کر لیا۔ فراق صاحب کے ہاتھوں اور فراق صاحب کے ساتھ بیٹھ کر تو معاملہ ''دوآتشہ'' ہو جاتا ہے۔ وہ میرے ساتھ ہی مشاعرے میں گئے اور وہاں بھی انہوں نے میرا تعارف کرایا کہ ''میرا بائی کا سوز اور سورداس کا نغمہ جب یکجا ہوتے ہیں تو اسے حبیب جالب کہتے ہیں۔'' فراق چونکہ ہندی میں رباعیات کہہ رہے تھے اس لیے میں نے وہاں ایسی ہی ہندی آمیز سادہ سی غزل سنائی۔

لوک گیتوں کا نگر یاد آیا
آج پردیس میں گھر یاد آیا
جب چلے آئے چمن زار سے ہم
التفاتِ گل تر یاد آیا
تری بیگانہ نگاہی سر شام

یہ ستم تا بہ سحر یاد آیا
ہم زمانے کا ستم بھول گئے
جب ترا لطف نظر یاد آیا
تو بھی مسرور تھا اس شب سر بزم
اپنے شعروں کا اثر یاد آیا
پھر ہوا درد تمنا بیدار
پھر دل خاک بسر یاد آیا
ہم جسے بھول چکے تھے جالب
پھر وہی راہ گزر یاد آیا

مجھ سے اور غزلیں بھی انہوں نے سنیں تو فراق صاحب نے کہا کہ ''اگر میں مر بھی جاؤں تو میرے بعد کچھ شاعر ایسے ہیں جو نامور ہوں گے۔ ان میں حبیب جالب بھی شامل ہیں۔'' یہ فراق گورکھپوری کے اسلوب و انداز کی بات تھی۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ ہندی' سنسکرت' فارسی اور انگریزی ادبیات کا استاد تھا۔ وہ ایک عالم تھا۔ حسن عسکری اور ممتاز حسین جیسے نقاد ان کے شاگرد تھے۔ فراق صاحب ذرے سے لے کر آفتاب تک کا علم رکھتے تھے۔ وہ جب گفتگو کرتے تو علم و دانش کے دریا بہا دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ گورکھپور میں ان کے گھر پر ہی کیف و سرور کی محفل تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''میں نے اپنے گھر کہا ہے کہ آپ کے لیے دلی سے ایک تحفہ حبیب جالب لایا ہوں۔'' پھر انہوں نے کہا ''اور تمہارے لیے امرودوں کا عرق لایا ہوں۔'' الہ آباد امرودوں کے لیے مشہور ہے۔ اس محفل میں ایک شخص شہاب جعفری بھی موجود تھا۔ فراق صاحب بہت ہی معلومات افزاء گفتگو کر رہے تھے۔ شاعری اور مذہب پر۔ اسلام اور ہندو ازم پر۔ ان کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ مسلمان کے خلاف ہو جاتے تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے اور ثابت کر دیتے کہ وہ اچھے نہیں ہوتے۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہندو کے خلاف شروع ہو جاتے اور ہندوؤں کی بیخ کنی کر کے رکھ دیتے تھے۔ کوئی موضوع بھی ان کے زیر بحث ہوتا تو وہ پھر کسی کا بھی چراغ اپنے سامنے نہ جلنے دیتے تھے۔ وہ اتنے بڑے عالم تھے اور ان کے مقابل ہمارا علم ''انگوٹھا چھاپ'' تھا۔ گفتگو کرتے ہوئے وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔ ''ہاں تو جالب صاحب آپ کا اس بارے کیا خیال ہے؟'' میں نے کہا' جناب میں تو آپ سے علم حاصل کر رہا ہوں اور محظوظ ہو رہا ہوں آپ کو Intrupt نہیں کروں گا۔ آپ بات

جاری رکھیں۔ شہاب جعفری ہر دوسرے تیسرے منٹ مداخلت کرتا۔ فراق صاحب ترقی پسندوں کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ''ترقی پسند چھوٹے بچے کو بھی پیار کریں گے تو کہیں گے کہ یہ بڑا ہو کر ہڑتال کرائے گا' جیل جائے گا۔ یہ اس کو منا چاند یا پھول نہیں کہیں گے۔'' شہاب جعفری نے پھر مداخلت کی تو میں نے اس کو کہا کہ کان ادھر لاؤ۔ اس نے کان ادھر کیا تو میں نے کہا تم بڑے الو کے پٹھے ہو۔ شہاب جعفری سیخ پا ہو گیا اور بولا ''کیا کہا؟'' فراق صاحب نے بھی پوچھا کہ ''کیا کہا ہے؟'' میں نے فراق صاحب سے کہا میں نے ان کے کان میں کہا ہے کہ مجھے کل پاکستان چلے جانا ہے مجھے فراق صاحب کی باتیں سننے دیں۔ مداخلت نہ کریں۔ شہاب جعفری بھی میری اس توضیح پر خوش ہو گیا۔ فراق گورکھپوری بہت بڑے شاعر عالم اور نقاد تھے' ان کا نام تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

محمد رفیع

کنور مہندر سنگھ بیدی کے بارے میں نے عرض کیا کہ وہ بڑے شاعر اور بڑے انسان تھے۔ ایک خاص ادا اور انداز سے مشاعرے کی نظامت فرمایا کرتے تھے۔ نظامت کے فرائض کو خوبصورتی سے ادا کیا کرتے تھے اور ہندوستان کے تمام مشاعروں میں نظامت کے لیے مشہور ہو گئے تھے۔ وہ سنگرور میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہاں بھی ایک مشاعرہ ہو گیا کنور صاحب کے ہندوستانی فلم انڈسٹری سے بھی بہت تعلقات تھے۔ یعنی ہر شعبے میں ان کے مداحین تھے۔ اس مشاعرے کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس میں فلم آرٹسٹ بھی خاص طور سے شریک ہوئے تھے۔ گلوکار محمد رفیع تھے۔ اداکار بھگوان تھے اور پنجابی فلموں کے نامور ہیروئین اندرا بلی بھی تھی۔ محمد رفیع سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ لاہور ہی کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے میری غزل ترنم کے ساتھ سنی تو بہت محظوظ ہوئے۔ جب ہم واپس دہلی جا رہے تھے تو کرائے کی بس میں سوار تھے۔ سب لوگ تھے۔ محمد رفیع سے لوگوں نے فرمائش کی کہ آپ کچھ سنائیں۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ رفیع صاحب میرا بھی جی چاہتا ہے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کچھ سنائیں۔ انہوں نے میری بات کو اہمیت دی اور گانا سنانا شروع کیا۔ بہت سارے گیت سنائے ان کے ساتھ ہی ایک ڈھولک والا بھی تھا اور چھوٹا سا ہارمونیم بھی تھا۔ سب ہی بہت لطف اندوز ہوئے۔ محمد رفیع کی آواز میں جو قوت اور پھیلاؤ تھا۔ اسے میں سن کر حیرت زدہ ہوا کہ قدرت نے اسے کیا آواز دی ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی

ایک مشاعرہ یاد آتا ہے۔ شاید صنام میں تھا۔ ایک صاحب ساحر صنامی تھے وہ تحصیل دار تھے۔ مشاعرہ ان کے زیر اہتمام تھا۔ رات کو مشاعرہ ختم ہو گیا تو مہتمم مشاعرہ بانی مشاعرہ یا منتظم مشاعرہ جسے کہتے ہیں (کئی لفظ ہیں اس کے لیے) وہ غائب ہو گیا۔ عجیب مشاعرہ تھا۔ اس میں چار ساحر اکٹھے ہو گئے تھے۔ ساحر صدیقی' ساحر ہوشیار پوری' ساحر صنامی اور ساحر کپور تھلوی۔ اب ہم تین ''ساحروں'' کے ساتھ ساحر صنامی کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ہمیں معاوضہ ادا کرے تو ہم پاکستان روانہ ہوں۔ بڑی مشکلوں سے ساحر ہوشیار پوری اور رام پرکاش اسے ڈھونڈ کر لائے۔ نجم الحسن اپنے زمانے کے بہت بڑے اداکار تھے ساحر ہوشیار پوری کے ہم زلف ہیں۔ وہ ساحر صنامی کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ ''تم نے بڑی تذلیل کرادی ہے۔ پاکستان شاعر کیا کہیں گے۔'' تو وہ کہنے لگا۔ ''چھوڑ و یار لو پیو۔'' انہوں نے پھر کہا۔ ''تمہیں شرم آنی چاہیے۔'' اور برا بھلا کہا اور اس کو لے آئے۔ اس نے ہمیں معاوضہ دے دیا۔ یہ بات جب کنور مہندر سنگھ بیدی کو معلوم ہوئی تو اس نے ساحر صنامی کو تحصیل داری سے معطل کر دیا اور کہا کہ ''تم نے ہمارے دوستوں کے ساتھ یہ سلوک کر کے جرم عظیم کیا ہے۔'' دو چار مہینے کے بعد اس کی سزا معاف کر دی تھی لیکن اسے سزا ضرور دی۔ کنور صاحب بہت عظیم انسان تھے۔ وہ جب بھی پاکستان آتے ان کی بہت پذیرائی ہوتی تھی۔ بہت سارے لوگ ان کو بحیثیت ایک انسان اور ایک شاعر کے طور پر بہت پسند کرتے تھے۔

حسرت موہانی ایوارڈ

انڈیا میں اکتیس بتیس سال تک دوبارہ نہ جاسکا کیونکہ میرا پاسپورٹ ضبط رہا۔ جوانی کے سارے برس قید و بند کی صعوبتوں اور پابندیوں میں گزر گئے۔ جب دوبارہ ہندوستان گیا تو مجھے عالمی اردو کانفرنس کے ایک مشاعرے کی دعوت ملی تھی۔ انیس صدیقی اس کے منتظم تھے۔ اس میں ''حسرت موہانی ایوارڈ'' میوزک ڈائریکٹر نوشاد نے مجھے دیا تھا۔ میں شدید بیمار تھا۔ بخار کی شدت کے ساتھ اپنے ہوٹل میں پڑا ہوا تھا۔ مشاعرے کا وقت ہو گیا۔ انیس صدیقی نے کہا کہ ''آپ بہت بیمار ہیں آپ نہ آئیں۔ چلئے آپ کی شرکت ہو گئی۔'' انہوں نے معاوضہ میرے سرہانے رکھ دیا۔ میں نے کہا کہ ''آپ گیارہ بجے کے قریب کار بھیج دیں' اتنی دیر میں اپنے آپ کو مجتمع کرتا ہوں۔'' ان سے پہلے اندیور آیا جو ایک معروف شاعر ہے' وہ ہمارا دوست ہے۔ جب ہم قتیل شفائی کے ساتھ بمبئی گئے تھے تو ایک رات اس کے ہاں بھی ٹھہرے تھے۔ اندیور انتھک آدمی ہے۔ وہ دیوانہ وار آیا۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ ہندی میں بات کرتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''چنتا نہ کریں' ٹھیک ہو جائیں گے۔'' یہ ''چنتا'' اس کی مجھے بہت اچھی لگی۔ مشاعرے میں جانے کے لیے گیارہ بجے گاڑی آ گئی۔ میں گرم سی اونی ٹوپی پہن کر اور چادر اوڑھ کر ہمت کر کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ مشاعرے میں پہنچ گیا۔

ہندوستان بھر کے شاعر آئے ہوئے تھے۔ ساڑھے بارہ بجے میری باری آئی۔ پتہ نہیں میرے اندر کیسے ہمت آ گئی تھی۔ میں نے دو تین نظمیں سنائی تھیں۔ یہی احساس تھا کہ جو پیسے ملے ہیں انہیں حلال تو کیا جائے پھر وہ یہ نہ کہیں کہ روپے دے دیئے تھے اور مشاعرہ پڑھے بغیر ہی چلا گیا۔ دوسرے دن ٹائمز آف انڈیا میں یہ خبر ہائی لائٹ ہوئی کہ "حبیب جالب نے نظم سنائی۔" آواز میں وہ زور تو نہیں تھا لیکن اس کے جذبے میں وہی طاقت تھی' اس کا وہی جذبہ برابر موجود ہے اس کی ہمت جواں ہے تھکی نہیں باہمت ہے۔" مجھے حسرت موہانی ایوارڈ ملا تھا۔ حسرت موہانی تاریخ ادب کی بہت بڑی شخصیت ہیں۔ وہ ایک شاعر' نقاد' بہادر صحافی اور سیاستدان کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ جہاں وہ رہتے تھے' وہ حسرت موہانی روڈ ہی تھا۔ حسرت موہانی ایک بڑے آدمی ہونے کے باوجود ایک عام اور معمولی آدمی کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ روزانہ خود اپنے ہاتھوں نل گیڑ کے مٹکا پانی سے بھرتے تھے۔ ان کے ہاں ایک صاحب مہمان آئے ہوئے تھے۔ اس نے کہا کہ "مولانا لایئے میں پانی بھر دیتا ہوں۔" مولانا نے کہا کہ "کل کون بھرے گا۔" ایک ریڈیو کے مشاعرے کے بعد منتظمین نے انہیں ڈرتے ڈرتے پانچ سو روپے کا چیک دیا تو کہنے لگے۔ "یہ کیا ہے؟" انہوں نے کہا کہ "حضور آپ کو اس سے بھی زیادہ دینا چاہتے ہیں' یہ معمولی سا چیک ہے۔" مولانا حسرت موہانی نے ان سے پوچھا کہ "ریاض خیر آبادی کو کیا دیا۔" انہوں نے کہا کہ "جی! پچیس روپے دیئے ہیں۔" مولانا نے کہا کہ "وہ مجھ سے بڑے شاعر ہیں' ان کو پچیس روپے اور مجھے پانچ سو دے رہے ہو۔ مجھے بھی پچیس روپے دو۔" انہوں نے پانچ سو لوٹا دیئے اور پچیس روپے ہی لیے۔ یہ اس بڑے آدمی مولانا حسرت موہانی کی شان تھی۔

◆◆◆

دیوانے یاد آتے ہیں

ایک دفعہ ٹیکسالی لاہور کے باہر ہم کو دھر لیا گیا۔ میرے علاوہ رؤف طاہر اور شیخ عبداللہ ایڈووکیٹ تھے۔ میں نے پولیس سے کہا کہ مجھے لے جاؤ اور ان کو چھوڑ دو۔ شیخ عبداللہ نے کالا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کو تو پولیس والے نے چھوڑ دیا اور ہمیں تھانے لے گیا۔ ہم نے فون کر کے اطلاع کر دی۔ ہماری ضمانت حامد سرفراز کے ماموں نے دی تھی۔ گھر آ گئے اور پھر رات کافی ہاؤس کی طرف گئے۔ رات کے گیارہ بجے کا عمل ہو گا۔ ایک بار پولیس نے پھر پکڑ لیا اور ہمارا چالان کر دیا۔ مجھے یاد آیا کہ یہاں صغیر حسین جو ایس پی پولیس ہیں وہ میرے پرانے دوست ہیں۔ جب وہ طالب علم تھے اور اچی سن کالج میں پڑھتے تھے تب سے ہماری دوستی چلی آ رہی تھی۔ میں دوسرے دن ان کے پاس چلا گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ "شیخ صغیر حسین میرے دوست یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم کو رات تمہاری پولیس نے پکڑ لیا تھانے لے گئے اور ہمارا چالان کر دیا۔" اس نے معلوم کیا اور پھر مجھ سے کہا کہ "آپ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ نے شراب پی رکھی تھی۔" "تو....... شاعر کیا حقہ پیئے گا شاعر تو ان باتوں سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔" پھر انہوں نے متعلقہ تھانے میں ٹیلیفون کیا اور تھانیدار سے کہا۔ "دیکھو! میں ابھی پنجاب میں رہوں گا۔ جالب میرا پرانا یار ہے۔ یہ کبھی "بحالت غیر" تمہیں نظر بھی آئے تو اسے گھر تک پہنچانا تمہارا فرض ہے۔" میں صغیر حسین کا بڑا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے پرانے تعلقات کا احترام کیا۔

دوستی کا احترام

یحییٰ خان کا دور تھا اور کراچی میں ایک مشاعرہ تھا۔ سعد اللہ خان کا ایک شعر جو ایک فلمی گیت کی پیروڈی تھا، میں نے اسی کے نام کے ساتھ مشاعرے میں پڑھا تھا کہ

آؤ بچو شکل دکھائیں تم کو نکا خان کی
جس کی خاطر ہم نے دی قربانی پاکستان کی

یہ شعر میں نے پڑھ دیا۔ شیخ صغیر حسین ایس پی اس وقت کراچی میں تھے تو کسی آفیسر نے یا پولیس مین نے ان سے کہا تھا کہ "اس پر مقدمہ بنائیں۔" لیکن صغیر حسین نے مداخلت کی کہ "چھوڑو جالب ہمارا یار ہے۔" یہ بات انہوں نے مجھے بتائی تھی جب وہ ریٹائر ہو گئے تھے۔ ان کے ایک دوست سعید باجوہ ہوا کرتے تھے وہ دونوں ہم جماعت تھے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی اس کے ہاں

ایک ذہنی خوبصورتی تھی۔ وہ بڑا پرسوز آدمی تھا۔ میں جب لندن گیا تو صبغت اللہ قادری کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ سعید باجوہ کو پتہ چلا تو وہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا اور بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ جب باہر نکلے تو فٹ پاتھ پر پیدل چل جا رہے تھے کہ ایک کار نے انہیں روند ڈالا۔ ان کو بہت چوٹیں آئیں وہ بمشکل تمام بچ گئے۔ میں انہیں دو تین مرتبہ دیکھنے کے لیے گیا۔ پاکستان آتے ہوئے انہوں نے شیخ صغیر حسین کے لیے کچھ عطریات وغیرہ بھیجے تھے۔ انہوں نے میری کلیات ''حرف سردار'' بھی منگوائی تھی جو میں نے پاکستان آ کر انہیں بھجوا دیں۔ پولیس میں سب لوگ ہی برے شمار نہیں ہوتے ہیں۔ شیخ صغیر حسین کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ پولیس والوں کو ''اوپر'' سے یہ آرڈر ملتے تھے انہیں مجھ سے کوئی دشمنی تو نہ تھی۔ اب ان کی یہ مجبوری تھی کہ حکم ملا ''حبیب جالب کو پکڑ لو اس پر مقدمہ بنا دو۔'' وہ اس کی تعمیل کر دیتے تھے۔ پولیس حدود سے تجاوز کرتی ہے۔ ایک روٹین کے تحت یہ ان کا رجحان اور انداز ہے کہ وہ لوگوں پر تشدد کرتے ہیں اور انہیں پریشان کرتے ہیں۔ اب میں جن کو زمانہ طالب علمی سے جانتا تھا۔ وہ میرا کلام بھی سنا کرتے تھے۔ پھر وہ سروس میں گئے تو آفیسر ہو گئے۔ شیخ صغیر حسین بھی ایسے ہی دوست تھے جو میری عزت افزائی کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ باسط میر ان کی گرفت میں تھے' ان پر کوئی بم کیس بنا ہوا تھا۔ میں صغیر حسین کے پاس ان کے وکلاء کو لے کر پہنچا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ بچے ہمارے ورکر ہیں تو یہ بم کا قصہ کہانی کیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ ''ان کے لیے آپ کیسے آ گئے؟'' میں نے کہا کہ وہ میری پارٹی کے آدمی ہیں۔ اب ان کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ ''میں پولیس مین بھی تو ہوں۔'' شیخ صغیر حسین میں ایک سادگی اور شرافت تھی۔ میں نے کہا کہ ''چھوڑو یار میں نے سنا ہے کہ تم ان پر تشدد کر رہے ہو' ایسا نہ کرو۔ کہنے لگے۔ ''نہیں ماریں گے۔'' تو انہوں نے بعد میں باسط میر اور ان کے ساتھیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایوب خان کے عہد کا واقعہ تھا۔

جوئے کا کیس

جنرل ضیاء الحق کے دور میں بھی مجھ پر جوئے کا ایسا ہی کیس بنا دیا گیا تھا۔ پہلے تو شراب کے کیس بنا دیتے تھے۔ اب ذرا انہوں نے ''جدت'' پیدا کی تھی۔ میرے ایک دوست ٹمپل روڈ لاہور میں رہتے تھے۔ وہ ہمارے مزاج کے آدمی ہیں۔ ہم آٹھ بجے رات کے بعد ان کے ہاں بیٹھا کرتے تھے۔ اس کا اپنے مالک مکان سے جھگڑا رہتا تھا جو اس کے مکان کے اوپر والے حصے میں رہتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی پولیس نے ہم سب کو جو اس دن وہاں بیٹھے ہوئے تھے ''جوا کھیلنے'' کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ وہاں ایک طارق باجوہ ایڈووکیٹ بھی تھے' ان کو نکال دیا گیا۔ وکیل ہونے کا بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ یہ رعایت انہیں بھی مل گئی حالانکہ وہ ہمارے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ پولیس نے ہم پر کیس یہ بنایا کہ ہم مکان سے باہر دری بچھا کر ''منگ پتا'' (تاش کے ذریعے جوا) کھیل رہے تھے اور

کمرے کے اندر سے بجلی کا بلب نکال کر باہر لگایا ہوا تھا۔ پولیس نے یہ کیس گھڑ لیا تھا۔ فروری کا مہینہ تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ جوا تو کمرے کے اندر بیٹھ کر بھی کھیلا جا سکتا تھا' سردی میں باہر روشنی لے جا کر کھیلنے کی کیا ضرورت تھی۔ پولیس کے بقول باہر کھمبے پر بلب نہیں تھا۔ اس لیے کمرے سے لائٹ باہر لائی گئی۔ اب عام طور پر جوئے کے مقدمات میں یہی ہوتا ہے کہ جواری کسی کھمبے کے نیچے بیٹھ کر جوا کھیل رہے ہیں تو پولیس نے بھی اپنا کیس ''مضبوط'' بنانے کے لیے یہ کہانی بنائی تھی۔ انہوں نے ''داؤ پر لگی ہوئی رقم'' یعنی ہماری جیبوں سے تمام پیسے نکال لیے تھے۔ رات بھر ہم حوالات میں رہے' دوسرے دن ہماری ضمانت ہو گئی تھی۔ میں ڈاکٹر خالد رانجھا ایڈووکیٹ کا بڑا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے ہماری پیروی کی تھی۔ سوڈانہ صاحب جن کے گھر یہ واقعہ ہوا تھا ان کے ہمسایہ میں گلزار ایڈووکیٹ رہتے ہیں' ہمارے بہت پیارے دوست ہیں۔ کبھی وہ ہمارے ہم مشرب تھے لیکن آج کل ''عالم ترک'' سے گزر رہے ہیں۔ ان کو معلوم ہوا تو وہ آئے اور آ کر یہ بیان حلفی دے دیا کہ پولیس نے ہمیں کمرے کے اندر سے پکڑا ہے۔ ایک وکیل کی گواہی سے جو اس مکان کے ساتھ ہی رہتا تھا' اس سے یہ مقدمہ ہی غلط ہو گیا اس لیے ہمیں چھوڑ دیا گیا۔

دوست احباب

ڈاکٹر خالد رانجھا ادیبوں اور شاعروں کے کام آتے رہتے ہیں۔ وہ حسین نقی کے بھی وکیل رہے ہیں۔ نیک سیرت اور خدا پرست باپ کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے سرگودھا میں اپنے والد کے نام پر امراض چشم کا ہسپتال بھی بنایا ہوا ہے۔ جہاں پر آنکھوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ وہاں ہم اس ہسپتال کی افتتاحی تقریب میں گئے تھے۔ افتتاح جسٹس اے سلام کے ہاتھوں ہوا تھا جن کے ساتھ ہمارے بڑے پرانے تعلقات تھے۔ وہ جب وکیل ہوا کرتے تھے تو ہمارے ہم خیال تھے۔ اس لیے ہماری پرانی دوستی چلی آ رہی تھی۔ میں نے اس تقریب میں جو کلام پڑھا وہ ظاہر ہے کہ جمہوریت کے حق میں تھا اور آمریت کے خلاف تھا' اب ایک جسٹس کی صدارت میں ہم پڑھ رہے تھے تو ہمیں کون پکڑتا۔ تقریب کے اختتام پر چیف جسٹس سلام نے کہا کہ ''میں تمہیں اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا اور تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ کر آؤں گا۔'' ڈاکٹر خالد رانجھا نے مجھ سے کہا کہ ''ٹھہر جائیں' کل چلے جائیں۔'' میں نے کہا ''آپ مجھے جانے دیں میں ''انصاف کے سائے'' میں اپنے گھر بخیریت پہنچ جاؤں گا۔

لاہور میں ایک بینیفٹ مشاعرہ ہمارے لیے ہوا تھا۔ جس کی روح رواں کشور ناہید تھیں۔ اس مشاعرے میں خالد رانجھا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مشاعرے میں تمام شاعر آئے تھے۔ جناب احمد ندیم قاسمی' کراچی سے محسن بھوپالی اور پیرزادہ قاسم تھے۔ میرے بینیفٹ کے لیے ہر مکتبہ فکر کے لوگ آئے تھے۔ اعتزاز احسن' نثار عثمانی' آئی اے رحمن' سابق جسٹس خالد محمود اور میاں ممتاز محمد خان

دولتانہ آئے تھے ان کے علاوہ فلم آرٹسٹ مصطفیٰ قریشی' فیض صاحب کی بیگم ایلس فیض' ان کی بیٹی سلیمہ ہاشمی اور بہت سارے لوگ تھے۔ان سب کا آنا میرے لیے بہت بڑا واقعہ ہے۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ مقدمات جو بنتے ہیں ان میں کسی وکیل دوست کا ہماری پیروی کرنا بھی ہماری عزت افزائی تھا کہ وہ اپنا قیمتی وقت نکال کر عدالتوں میں آتے تھے۔ میں ڈاکٹر خالد رانجھا کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام وکلاء کا بھی تہہ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے میرے اوپر بنائے گئے مقدمات کی پیروی کی تھی۔

مولانا چراغ حسن حسرت

مولانا چراغ حسن حسرت نے کافی ہاؤس لاہور میں مجھ سے فرمائش کی تھی کہ ''مولانا اپنی یہ غزل تو سناؤ۔''

اس شہر خرابی میں غم عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

ہوتا یوں تھا کہ چراغ حسن حسرت کافی ہاؤس میں اپنی ٹیبل کے سامنے بیٹھ جاتے تھے اور لوگ ان کے گرد حلقہ بگوش ہو جاتے تھے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بڑے صحافی' نقاد' شاعر اور ادیب تھے۔اسی وجہ سے لوگ ان کا احترام کیا کرتے تھے۔اس دن میں وہاں لاء کالج کے اسٹوڈنٹس آفس میں بیٹھا ہوا تھا' میری طبیعت حاضر نہیں تھی کہ مولانا چراغ حسن حسرت کی آواز آئی۔ ''مولانا ادھر آؤ۔'' اب میں فوراً ان کے پاس گیا۔ ہمارے زمانے میں بزرگوں کا احترام ہوا کرتا تھا۔اب لوگ اس سے گریز کرتے ہیں۔اپنے آپ کو ہی ''بزرگ'' سمجھتے ہیں یا اپنے علاوہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ہم بڑوں کا ادب دل سے کیا کرتے تھے۔ میں نے مولانا چراغ حسن حسرت کے حکم کی تعمیل کی اور یہ غزل انہیں سنائی۔

اس شہر خرابی میں غم عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

یہ ہنستا ہوا چاند یہ پر نور ستارے
تابندہ و پائندہ ہیں ذروں کے سہارے

حسرت ہے کوئی غنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے کوئی پھول ہمیں دل سے پکارے

ہر صبح مری صبح پہ روتی رہی شبنم

ہر رات مری رات پہ ہنستے رہے تارے
کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غم جاناں
کب تک کوئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے

سیف الدین سیف آ گئے۔ ان سے بھی کلام سنا گیا۔ ریاض قادر اور ناصر کاظمی آ گئے۔ انہوں نے کچھ سنایا۔ اس دن انڈیا اور پاکستان کا کرکٹ میچ تھا۔ لوگ انڈیا سے بھی آئے ہوئے تھے۔ کافی ہاؤس بھر گیا تھا اور "مشاعرہ گاہ" بن گیا تھا۔

عوامی شاعر

مجھے یہ فخر ہے کہ چراغ حسن حسرت جیسے قادر الکلام شاعر اور عظیم صحافی نے بھی مجھے یہ عزت دی کہ میرا کلام فرمائش کر کے سنا اور مجھے داد سے نوازا۔ اسی لیے میں نئے دور کے نئے نقادوں کی چنداں پرواہ نہیں کرتا کیونکہ مستند شعراء نے مجھے داد دی ہے۔ حکمران طبقے کے ساتھ وابستہ ادیب و شاعر اپنی ذلت و رسوائی کو چھپانے کے لیے ہم میں کیڑے نکالتے ہیں۔ وہ اپنے اس عمل پر نہیں شرماتے۔ ایسے بھی ادیب و شاعر ہیں جو مراعات یافتہ ہیں مگر خود کو انقلابی کہتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ "ہم حق گو ہیں۔ ہم نے ہمیشہ سچ لکھا ہے جو دل پہ گزرا ہے وہی کہا ہے۔" لیکن ان کی یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ وہ کہتے کچھ ہیں اور ان کی زندگی کچھ اور طرح سے گزرتی ہے۔ ان کے گفتار و کردار میں ہم آہنگی نہیں ہے اسی لیے ٹی وی' ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ساتھ وابستہ ہونے کے باوجود عوام میں ان کو مقبولیت حاصل نہیں ہوتی ہے نہ ہی ان کو پذیرائی نصیب ہوتی ہے۔ ذرائع ابلاغ ہی کافی نہیں ہوتے ہیں' لوگوں کے ذہن کے قریب رہ کر ان کی ذہنی فضا کی عکاسی کرنا ہی شاعر اور شعر کو قبولیت کا درجہ دیتا ہے۔ دوسرے حضرات خوف کی وجہ سے عوام کے دل کی بات نہیں کہتے اور جب تخلیق پر "خوف کا سایہ" پڑ جاتا ہے تو تخلیق بھی "خوفزدہ" ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر سچائی پیدا نہیں ہوتی۔ سچ بولنے کے لیے دار و رسن سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ علامتوں اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ استعاراتی شاعری بری ہوتی ہے۔ بہت بڑا شعر بڑے اچھے انداز میں اساتذہ نے کہا ہے اور وہ لوگوں میں اور ادب میں لافانی ہو گیا ہے۔ لیکن جہاں لوگ پچاسی فیصد ان پڑھ ہوں وہاں استعاراتی شاعری عوام کی شاعری نہیں بن پاتی ہے۔ میں نے عوام کی زبان میں بات کی ہے۔ اپنی شاعری میں مترنم بحور کے تکنیکی تجربات بھی کیے ہیں اور شاعری کو گیت کے قریب تر لایا ہوں۔ یہ زبان لوگوں کی سمجھ میں آئی اور انہوں نے مجھے داد دی ہے۔ اپنی شاعری کے ذریعے مختلف موضوعات پر میں نے مقررین سے زیادہ موثر انداز میں بات کی ہے۔ اسی لیے مادر ملت کے جلسوں میں مادر ملت کی تقریر کے بعد یہ آواز لگ جاتی تھی کہ "حبیب جالب...... حبیب جالب......" اور

میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا تھا کہ مادرِ ملت کی تقریر کے بعد جلسہ ختم۔ میں انکے بعد اب کچھ سناؤں گا۔ فیض صاحب مجھے ''عوامی شاعر'' کا جو لقب دے گئے ہیں وہ میرے نام کا ایک لازمی جزو بن گیا ہے۔ میں نے ایک نظم لکھی تھی کہ

فرنگی کا جو میں دربان ہوتا
تو جینا کس قدر آسان ہوتا
مرے بچے بھی امریکہ میں پڑھتے
میں ہر گرمی میں انگلستان ہوتا
مری انگلش بلا کی چست ہوتی
بلا سے جو نہ اردو دان ہوتا
جھکا کے سر کو ہو جاتا جو سر میں
تو لیڈر بھی عظیم الشان ہوتا
زمینیں میری ہر صوبے میں ہوتیں
میں واللہ صدر پاکستان ہوتا

سید محمد جعفری طنز و مزاح کے حوالے سے اپنے دور کا بڑا منفرد شاعر تھا۔ طنزیہ شاعر اکبرالہ آبادی کے بعد انہیں یہ بلند مرتبہ ملا تھا۔ شوکت تھانوی اور ظہیر جبل پوری ان کے مقابل نہیں آتے تھے۔ سرسید گرلز کالج کراچی میں ایک مشاعرہ تھا۔ جہاں فیض صاحب پرنسپل ہوتے تھے۔ اس مشاعرے میں طالبات کی طرف سے میرے لیے بار بار فرمائشیں آرہی تھیں کہ ''وہ نظم سنائیں۔'' میں ان دو عظیم المرتبت شاعروں کی موجودگی میں ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے ابھر رہا تھا اور مجھے لوگوں میں Popular Poet کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہاں مجھ سے سید محمد جعفری نے بھی کہا تھا کہ ''آپ تو عوامی شاعر ہو گئے ہیں۔''

یاسمین

اداکارہ یاسمین پہلے جعفر شاہ بخاری کی بیگم تھیں تب سے ہی ہماری ان سے جان پہچان تھی۔ انہوں نے فلم ''بھروسہ'' میں ہیروئین کا رول ادا کیا تھا۔ جس کا گانا میں نے لکھا تھا۔ یاسمین میرا کلام سنتی تھیں انہیں بہت پسند تھا۔ وہ علاؤالدین سے بھی متاثر تھیں د جس طرح ایک فنکار دوسرے فن کار کا قدردان ہوتا ہے۔ یاسمین کا شعر و سخن سے تعلق ہے وہ ایک سخن شناس، سخن فہم اور باذوق خاتون

ہیں۔ بخاری سے علیحدگی کے بعد ان کی سید شوکت حسین رضوی سے شادی ہوگئی۔ میرا وہ بڑا احترام کرتی ہیں ان کو میرا کلام ازبر ہے۔ یاسمین کسی ثقافتی وفد کے ساتھ کابل جا رہی تھیں۔ اس وفد میں سیف الدین سیف' سبطین فضلی اور دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ اسلام آباد میں ایک محفل منعقد ہوئی۔ اس میں کچھ فوجی حضرات بھی شامل تھے۔ یاسمین سے فرمائش کی گئی کہ وہ کچھ سنائیں تو انہوں نے وہاں میری نظم "دستور" سنا دی۔ نظم سننے کے بعد وہاں کچھ لوگ سخت ناراض و نالاں ہوئے کہ یہ نظم کیوں سنائی ہے۔ وہ دورہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ صورت حال یہ پیدا ہوگئی تھی کہ وفد سے کہا گیا یاسمین کو الگ کیا جائے اور انہیں ساتھ نہ لے جایا جائے۔ یہاں سیف الدین سیف نے Stand لیا تھا۔ انہوں نے برملا کہا تھا کہ "یہ کوئی بری بات نہیں ہے' یاسمین نے ٹھیک نظم پڑھی ہے۔ وہ نہیں جائیں گے تو ہم بھی نہیں جائیں گے۔" یہ صورت حال پھر ٹھیک ہوگئی لیکن انہوں نے جرات دکھا دی تھی۔ ایک دفعہ میں نے بمبئی میں بھی اشوک کمار کو یہ نظم سنائی تھی۔ وہاں بھی یاسمین موجود تھی۔ یاسمین نے شوکت حسین رضوی کے ہاں مجھے بلایا تھا اور میرا کلام میری آواز میں ٹیپ کیا تھا۔ شوکت صاحب متحدہ ہندوستان کے بہت بڑے ڈائریکٹر ہیں۔ دلیپ کمار کو دلیپ کمار بنانے میں شوکت حسین رضوی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہ ان کی فلم "جگنو" میں ہیرو آئے تھے۔ اس سے پہلے دلیپ کی فلمیں فلاپ ہوگئی تھیں۔ لیکن "جگنو" سے ان کو پہلی کامیابی ملی تھی۔ لاہور آ کر شوکت حسین رضوی نے فلم "خاندان" بنائی تھی۔ ان کا نور جہاں کے ساتھ معاملہ عشق و عاشقی چل رہا تھا۔ نور جہاں کے لواحقین میاں محمود علی قصوری کے پاس آئے تھے کہ "ایک سید ہماری لڑکی کو بھگا کر لے گیا ہے۔ آپ مقدمہ لڑیں۔" میاں صاحب نے یہ کیس نہیں لیا تھا۔ ایک دفعہ میاں محمود علی قصوری نے مجھے بتایا تھا کہ نور جہاں کی شوکت حسین رضوی کے ساتھ شادی کی تقریب میں وہ بھی شریک تھے کیونکہ نور جہاں قصور کی رہنے والی تھی اور محمود علی قصوری بھی قصور کے تھے۔ شوکت حسین رضوی بڑے باکمال ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی وجہ سے سینما کو بڑا فروغ ملا۔ پھر یہ بانیان میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا یاسمین پر بھی اثر ہوا کیونکہ وہ شعر و سخن سے قریب تھیں۔ جوش ملیح آبادی بھی ان کے ہاں قیام پذیر ہوا کرتے تھے۔

شیخ خورشید

شیخ خورشید بہت زیرک اور بڑے ذہین آدمی تھے اور سخن فہم بھی تھے۔ ان کا مزاج کچھ صوفی ازم کی طرف راغب تھا' وہ تصوف پسند تھے۔ کافی ہاؤس میں وہ آیا کرتے تھے۔ حمید نظامی' شیخ خورشید اور نسیم حسن شاہ کا گروپ تھا۔ شیخ خورشید مرنجان مرنج آدمی تھے۔ مزاجاً وہ آزادی پسند تھے۔ عبداللہ بٹ بھی ان کے حلقہ ارباب میں شامل تھے۔ عبداللہ بٹ بھی ذہین آدمی تھے۔ ان کی ذہانت سے لوگ خائف رہتے تھے اور ان کے مداح بھی تھے۔ ان کی شخصیت خوبصورت اور پرکشش تھی۔ وہ سارا دن اپنے ہی خلاف کام کرتے

رہتے تھے۔ جو بات ان کے دل میں ہوتی وہی ان کے لب پر ہوتی تھی۔ عبداللہ بٹ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ اس لیے ہمیشہ تنگ دست ہی رہے اور ہمیشہ ان کے کام بگڑتے ہی رہے۔

شیخ خورشید ۱۹۶۲ء کے دستور پر جسے ایوب خان نے قوم پر مسلط کیا تھا بہت دکھی تھے، وہ ناخوش ونالاں تھے اور بہت زیادہ اس کی مخالفت میں تھے۔ ایک دفعہ شیخ خورشید نے مجھے کافی ہاؤس سے اٹھایا اور اپنی کار میں بٹھایا۔ مال روڈ پر ہم سفر کر رہے تھے تو راستے میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ "یہ Contribution لائلپور کے گھنٹہ گھر کی طرح ہے۔ جدھر سے بھی جاؤ سامنے صدر آتا ہے۔" وہ ۱۹۶۲ء کے دستور سے مطمئن نہیں تھے۔ میں بہت خوش ہوا کہ اتنا بڑا دانشور اس دستور کے خلاف ہے۔ ہم بھی ایوب خان کی آمریت اور اس کے دستور کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ابھی دو چار دن ہی گزرے ہوں گے کہ شیخ خورشید وزیر قانون ہو گئے اور ایوب خان کے ساتھ مل گئے۔ ان کی تصویر "پاکستان ٹائمز" میں چھپی۔ جس میں وہ وہ ٹوپی پہنے ہوئے تھے تو میں نے اس پر یہ شعر کہا تھا کہ

کرنے خود اپنی بات کی تردید آ گیا
ٹوپی پہن کے ہال میں خورشید آ گیا

یہ شعر چھپ گیا اور ان تک پہنچ گیا۔ میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ شاید اسمبلی کا سیشن تھا۔ میں نیشنل عوامی پارٹی کے سنٹرل کمیٹی کے رکن مسیح الرحمن سے باتیں کر رہا تھا کہ شیخ خورشید آتے ہوئے دکھائی دیے۔ شیخ صاحب نے مجھے دیکھ کر کہا کہ "میں نے وہ شعر سن لیا ہے وہ مجھ تک پہنچ گیا ہے مگر میں اپنے چیمبر میں آپ کو کافی پلا کے سنوں گا۔" مسیح الرحمن نے کہا۔ "بھائی اس کو اندر نہ کر دینا۔" انہوں نے کہا۔ "پوچھ لو اس سے یہ میرا بہت پرانا دوست ہے۔" میں ان کے ساتھ ان کے چیمبر میں چلا گیا۔ انہوں نے مجھے کافی پلائی اور مجھ سے بڑے کھلے دل کے ساتھ وہ شعر سنا۔ پرانے لوگوں میں یہ خوبصورتیاں تو تھیں کہ ان میں Tolerence ہوتی تھی۔ شیخ خورشید ویسے بھی ذہین، ہمدرد اور بہت پیار کرنے والے انسان تھے۔ اب ہر کوئی تو Committed آدمی نہیں ہوتا کہ ہم اس پر پابندیاں لگائیں کہ وہ ضرور ہمارے ساتھ رہے یا اپوزیشن کے ساتھ مل کر عوام کے حقوق کے لیے عملی طور پر جدوجہد کرے۔

پہلا حدود کیس

ضیاء الحق کے دور میں ہم پر ہی پہلا حدود کیس بنایا گیا تھا۔ میرے ایک دوست ڈسٹرکٹ کورٹ بار کے سینئر نائب صدر منتخب ہوئے تو انہوں نے مجھے اپنے دفتر میں دعوت دی۔ سردی کا موسم تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں یہیں رہ جاتا ہوں کیونکہ رات کا وقت

ہے راستے میں پولیس کھڑی ہوتی ہے۔ اس لیے آدمی جہاں بیٹھے وہیں رہ جائے۔ چونکہ وہ سینئر نائب صدر ڈسٹرکٹ کورٹ ہو گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ ہمیں کون پکڑ سکتا ہے۔ انہوں نے مجھے رکشے میں بٹھایا اور مجھے سنت نگر میرے گھر چھوڑنے جا رہے تھے کہ ہم پرانی ججوں (سیکرٹریٹ لاہور کا علاقہ) کے پاس ہی دھر لیے گئے۔ پولیس والوں نے ہمیں روکا۔ وہ باہر نکلا۔ اس نے کہا کہ "میں سینئر نائب صدر ڈسٹرکٹ کورٹ ہوں اور رکشے کے اندر شاعر انقلاب حبیب جالب بیٹھے ہیں۔" وہ اے ایس آئی تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ ہم دونوں کو تھانے لے گیا۔ تھانیدار نے مجھ سے پوچھتا ہے کہ "آپ نے شراب کہاں سے پی ہے؟" میں نے اس سے کہا کہ "ہم تو ہمیشہ اپنے ساتھ ایک وکیل رکھتے ہیں۔ یہ ہمارے وکیل جو سینئر نائب صدر ڈسٹرکٹ کورٹ ہیں' آپ ان سے ہی بات کریں۔" انہوں نے میری بات حیرانی سے سنی اور وکیل صاحب سے مخاطب ہوئے۔ اب وہ کہہ رہے ہیں کہ "میں سینئر وکیل ہوں اور نائب صدر وغیرہ وغیرہ اور پھر ٹیلیفون کریں۔" لیکن وہ کہیں جا نہیں رہا تھا۔ شاید کٹا ہوا تھا۔ پولیس والے ہمیں "ملاحظے" کے لیے لے گئے۔ لاء کالج لاہور کے ساتھ ہی پولیس سرجن بیٹھتا تھا۔ رات کے ڈھائی بجے تھے۔ اس وقت وہاں ڈاکٹر صابر علی تھے۔ وہ ہمارے دوست تھے۔ وہ جب طالب علم تھے تو اس وقت انہوں نے ہمیں سن رکھا تھا۔ بڑا ذہین اور باذوق آدمی تھا۔ انہوں نے ہمیں پولیس سے اپنی تحویل میں لے لیا اور پولیس کو اپنے کمرے سے باہر بٹھا دیا۔ اب انہوں نے ہمیں پانی پلایا پھر چائے پلائی۔ آدھے آدھے گھنٹے تک چائے پلاتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارے اندر جو "اثر" ہے وہ زائل ہو جائے۔ اس طرح ہمارے پیشاب سے الکوحل نہیں نکلی اور انہوں نے کوئی پچھلی تاریخ کا نسخہ دے کر بتایا کہ فلاں دوائی پی رکھی تھی' اس سے یہ حالت تھی۔ اس طرح ہم رہا ہو گئے۔ لیکن اخبار میں یہ خبر چھپنے سے یہ ہوا کہ آل انڈیا ریڈیو سے خبر نشر ہو گئی کہ "حبیب جالب کو کوڑے لگائے گئے۔" انڈیا کے کسی شاعر نے ایک قطعہ بھی وہاں اخبار میں چھپوا دیا تھا کہ

گھر سے پی کر شراب نکلا تھا
یہ خطا تھی حبیب جالب کی
پاک سرزمین پہ ناداں
نقل کرتا ہے مرزا غالب کی

اس خبر کی تردید بھی آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئی کہ کوڑے نہیں لگے۔ اس کیس کے دوران میاں محمود علی قصوری نے بھی حسب عادت ہماری سرپرستی کی تھی۔ میاں صاحب ہمارے سرپرست اعلیٰ تھے۔ ہم نے سیاست میں قدم ان کی قیادت کے تحت ہی رکھا

تھا۔ اس لیے وہ ہمارے نگہبان اور پاسبان بھی تھے۔ وہ ایک دفعہ ہمارے لیے کہیں سے روسی ''کیف آور مشروب'' لے آئے اور ہم سے کہا۔ ''لو پیو'' ہم نے ان سے کہا کہ ہم نہیں پیتے تو انہوں نے کہا۔ ''اچھا رہنے دو۔''

پھر انہوں نے سوار خان کو فون کیا جو اس وقت گورنر بھی تھے۔ میاں صاحب نے ان سے کہا کہ ''جناب اگر آپ کی آدمی چھاؤنی نہیں پہنچی تو پھر حبیب جالب کو کوڑے ماریں یا اس پر مقدمہ چلائیں اور اگر پہنچی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ پہنچی ہے تو پھر میں جالب کا مقدمہ لڑوں گا۔'' میاں قصوری کے بقول سوار خان نے کہا تھا کہ ''ہم تو حبیب جالب پر کوئی مقدمہ نہیں چلانا نہیں چاہتے پتہ نہیں انہیں کس نے پکڑ لیا ہے۔''

چوہدری ظہور الٰہی ہمارے مہربان دوست تھے ہم ایک وقت میں اکٹھے رہے ہیں۔ انہوں نے بھی مار کھائی اور جیل میں بھی رہے۔ ہم ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ جب جمہوریت کے لیے اپوزیشن میں وہ ہوتے تھے انہوں نے کہیں سے یہ سن لیا تھا کہ مجھے پولیس نے پکڑا ہے تو انہوں نے کہا کہ ''میں ضیاء الحق کو کہہ دوں گا کہ استاد دامن اور حبیب جالب کو کچھ نہ کہا جائے اور ان پر اس طرح کے مقدمات نہ بنائے جائیں۔''

◆◆◆

ذہن میں اجالا

بہت سارے دوست اور مہربان ایسے ہیں جن کی محبت اور قدر دانی نے میرے حوصلوں اور عزم کو جواں رکھا۔ ان میں میرے خیال اور ہم مشرب بھی تھے اور بیشتر ایسے تھے جنہوں نے میرے نظریہ وفن کے ساتھ گہری وابستگی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور میری تحسین کی ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ ان کی محبتیں اور عقیدتیں میری کٹھن راہ کی مسافتوں کو کسی حد تک کم کرتی رہی ہیں۔ سردار خالد محمود کارپوریشن کے مجسٹریٹ تھے۔ وہ ہمارے پرانے جاننے والے تھے۔ بہت نیک اور بہت اچھے آدمی ہیں۔ وہ ہائیکورٹ بار کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں۔ میری ایک نظم کا کیس ان کے روبرو پیش ہوا تھا تو انہوں نے مجھے اس پر رہا کر دیا تھا۔

میاں عبدالخالق

میاں عبدالخالق جو پنجابی میں تقریر کیا کرتے تھے ان کے پنجابی پڑھنے کا انداز اور لب و لہجہ بہت خوبصورت تھا۔ پنجابی ادب کا مطالعہ بھی اتنا وسیع تھا کہ برجستہ شعر پڑھا کرتے تھے جیسے شاعر مشاعرے لوٹا کرتے ہیں بالکل اسی طرح وہ جلسے لوٹ لیا کرتے تھے۔ وہ مینار پاکستان کے معمار بھی ہیں۔ ہمارے دکھوں کے ساتھی تھے اپوزیشن میں ہم ایک ساتھ رہے ہیں۔ ان کا انتقال میرے سامنے ہوا تھا۔ میاں عبدالخالق سی آر اسلم اور ملک غلام نبی صبح سویرے لارنس گارڈن میں سیر کیا کرتے تھے۔ ان کا آپس میں یارانہ تھا' میاں عبدالخالق مسلم لیگی تھے لیکن وہ اینٹی امپریلسٹ ہو گئے تھے' ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ امریکہ ہمیں خود کفیل نہیں ہونے دیتا اور نہ ہی آزاد ہونے دیتا ہے یہ دست نگری جو ہے یہ موت ہے۔ ان کو مسلم لیگ نے کارپوریشن کا چیئرمین بنانے کی پیش کش بھی کی تھی مگر انہوں نے ٹکٹ نہیں لیا تھا۔ انہوں نے پی پی پی کے ٹکٹ کو ترجیح دی تھی جو انہیں مل نہیں سکا اور یہ صدمہ ان کی موت کا باعث بھی بنا تھا۔ میاں عبدالخالق صبح جب مجھے ٹیلیفون کرتے تھے تو پندرہ پندرہ منٹ باتیں کیا کرتے تھے اور سیاسی صورت حال پر ناخوش و نالاں تھے کہ یہ ملک کدھر جا رہا ہے۔ وہ تعمیر و ترقی کے خواہاں تھے کہ یہاں مفلوک الحال' غریبوں' مزدوروں' کسانوں' چھوٹے چھوٹے دکانداروں اور چھابڑی والوں کو زندگی کی سہولیات میسر ہو سکیں۔ میاں عبدالخالق کئی چھابڑی والوں کے ساتھ بھی بیٹھے رہتے اور ان سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ ان کی امداد و تعاون بھی کرتے تھے۔ میرے ساتھ ان کا مشفقانہ اور سرپرستانہ رویہ تھا۔ وہ میرے ہم خیال ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ کسی کی مدد کرتے ہیں تو پھر وہ ان کو اپنے سانچے میں

ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے حکومتوں نے مجھے نت نئے طریقوں سے پھانسنے کی کوششیں کی ہیں مگر میں ان کے دام میں نہیں پھنسا۔ میاں عبدالخالق ایسا آدمی نہیں تھا وہ مجھے Appreciate کرتا رہا ہے۔ میں نے ایک نظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے لیے کہی تھی کہ

نہ جا امریکہ نال کڑے
ایہ گل نہ دیویں ٹال کڑے
اینے قتل آزادی نوں کیتا
اینے ایس دھرتی دا لہو پیتا
اینے کٹوایا بنگال کڑے
نہ جا امریکہ نال کڑے
ایہ روس دے نال لڑوندا اے
ایتھوں لوکاں نوں مروندا اے
سانوں تیرا بڑا خیال کڑے
نہ جا امریکہ نال کڑے
گل ٹھیک ای کہندا ساقی وی
کتے چلا نہ جاوے باقی وی
کر راکھی دیس سنبھال کڑے
نہ جا امریکہ نال کڑے

یہ نظم جب انہوں نے سنی تھی تو اس کی تعریف یوں کی تھی کہ "تمہارا شعر دل میں اترتا ہے۔" پیپلز پارٹی کے جیالوں نے یہ نظم لکھنے پر میری سخت مخالفت کی تھی۔ ان دنوں میں بیمار تھا اور میو ہسپتال لاہور میں داخل تھا۔ جیالوں نے ہسپتال کے باہر آ کر میرے خلاف مظاہرہ کیا تھا۔ یہ نظم محترمہ بے نظیر بھٹو تک پہنچی تو انہوں نے کسی سے پوچھا کہ یہ "کڑے" کسے کہتے ہیں تو انہیں بتایا گیا اس کا مطلب بیٹی ہوتا ہے تو پھر انہوں نے کہا کہ "حبیب جالب نے یہ نظم میرے خلاف نہیں لکھی بلکہ یہ ان کی جرات اور سچائی کا اظہار ہے۔" محترمہ بے نظیر بھٹو کی یہ اعلیٰ ظرفی ہے کہ انہوں نے میری اس نظم کی تحسین کی تھی۔ جیالوں کو اعتراض تھا کہ میں نے بی بی کو "کڑے"

کہ کر ان کی تحقیر کی ہے جبکہ بلھے شاہ نے کہا تھا کہ ”کر کتن ول دھیان کڑے“

یہ جیالوں کی بے خبری اور لاعلمی ہے کہ وہ کسی بات کو سیاق و سباق سے ہٹ کر دیکھنے کے عادی ہیں اور بغیر جانے بوجھے اندھی عقیدت پسندی پر یقین رکھتے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو جلا وطنی کے بعد جب وطن تشریف لائی تھیں تو میں نے ایک نظم ان کے بارے میں لکھی تھی۔ یہ جنرل ضیاء الحق کا خوفناک دور تھا۔

نہتی لڑکی

ڈرتے ہیں بندوقوں والے ایک نہتی لڑکی سے
پھیلے ہیں ہمت کے اجالے ایک نہتی لڑکی سے
ڈرے ہوئے ہیں مرے ہوئے ہیں لرزیدہ لرزیدہ ہیں
ملاّ' تاجر' جنرل جیالے ایک نہتی لڑکی سے
آزادی کی بات نہ کر لوگوں سے نہ مل' یہ کہتے ہیں
بے حس ظالم دل کے کالے ایک نہتی لڑکی سے
دیکھ کے اس صورت کو جالب ساری دنیا ہنستی ہے
بلوائوں کے پڑے ہیں پالے ایک نہتی لڑکی سے

پانچ لاکھ کی پیش کش

جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا' چوہدری شجاعت حسین ان کے وزیر تھے۔ ایک دن تھانے والوں نے فون کیا کہ ”آپ کے گھر کا ایڈریس کیا ہے؟ چوہدری شجاعت حسین آنا چاہتے ہیں۔“ میں نے انہیں بتایا کہ سروبا گارڈن میں ہے' وہ آ جائیں۔ وہ آ گئے۔ ان کے ساتھ جو لوگ تھے ان کو وہ اندر لے کر نہ آئے' خود تنہا ہی آ گئے۔ میری بیوی اسے جانتی تھی۔ اس سے بھی ملے اور مجھ سے کہا کہ ”آپ بیمار ہیں ان دنوں تو میں یہ پیسے لایا ہوں۔ آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا کہ ”ان پیسوں کو تو میں قبول نہیں کروں گا' یہ آپ واپس لے جائیں۔ آپ کے والد چوہدری ظہور الٰہی جو میرے بہت اچھے دوست تھے ان کی اس پیشکش کو میں نے قبول نہیں کیا تھا جب انہوں نے مجھے ماڈرن فلور ملز کے ویلفیئر آفیسر کا عہدہ پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ پانچ ہزار روپے آپ ہر مہینے تنخواہ لے جایا

کرنا اور آپ صرف دستخط کرنے ہی آیا کریں۔ میں نے چوہدری ظہور الٰہی سے کہا تھا کہ چوہدری صاحب ہم آپ کے ساتھ تو ہیں لیکن اتنے زیادہ ساتھ بھی نہیں ہیں۔ آپ کے یہ پانچ ہزار مجھے بہت پریشان کریں گے۔ اس لیے میں معافی چاہتا ہوں' مجھ پر آپ یہ مہربانی نہ کریں۔ میاں محمود علی قصوری کے ہم زلف سید مجاہد علی تھے' بہت نیک آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے انشورنس کرنے کے کام پر لگا دیا تھا کہ اس طرح تمہاری انا کو بھی ٹھیس نہیں پہنچے گی اور یہ کام بھی چلتا رہے گا تو چوہدری ظہور الٰہی مرحوم نے بھی مجھ سے انشورنس ہی کرائی تھی۔ قسط ایک ہی دی تھی' اس کے بعد نہیں دی تھی۔ چوہدری شجاعت حسین نے پھر اصرار کیا اور میری بیوی سے مخاطب ہوئے کہ ''دیکھیے یہ کیا کر رہے ہیں' انہیں روکیں' انہیں سمجھائیں' آپ میرا ساتھ دیں۔'' میری بیوی جو کہ میرے کہنے کے مطابق ہی زندگی گزارتی رہی ہے اس نے بھی پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے پھر اسے کہا کہ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے اور پھر یہ جنرل ضیاء الحق کا خوفناک عہد' آپ یہ مہربانی مجھ پر نہ فرمائیں اور یہ پیسے لے جائیں۔ اس نے کہا کہ ''میں کبھی نہیں آؤں گا۔'' میں نے جواب دیا کہ آپ ہمارے بھتیجے ہیں آپ اس حیثیت سے ہمیشہ آئیں آپ کے لیے ہمیشہ ہمارے دل کے اور گھر کے دروازے کھلے ہیں۔ یوں اگر آئیں گے تو میں آپ کے ساتھ تعاون نہیں کروں گا۔ تو وہ چلے گئے۔ وہ میرے لیے پانچ لاکھ روپے لے کر آئے تھے لیکن میں نے ایک آمر کی طرف سے اس خطیر رقم کو ٹھکرا دیا۔

جمہوریت کا ایوارڈ

بے نظیر کا دورِ حکومت آیا تو انہوں نے میرے لیے پچاس ہزار روپے جمہوریت کی خدمات کے اعتراف پر اعلان کیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں یہ ایوارڈ نہیں لیتا۔ میں نے انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے ایک اور طریقہ کار نکالا تھا۔ فہمیدہ ریاض نیشنل بک فاؤنڈیشن کی ڈائریکٹر تھیں۔ انہوں نے چاروں صوبوں کے ادیبوں اور شاعروں کو منتخب کیا۔ پنجاب کی طرف سے میرا انتخاب کیا گیا۔ میرے لیے ایک لاکھ روپے اور سونے کا گولڈ میڈل دینے کا اعلان کیا گیا۔ کشور ناہید کو فہمیدہ ریاض نے بتایا تو کشور نے کہا کہ ''وہ پہلے ہی پچاس ہزار روپے لینے سے انکار کر چکا ہے۔ وہ کہاں لے گا' معاملہ خراب ہو جائے گا۔'' فہمیدہ ریاض نے مجھے خط لکھا' میں نے وہ خط اپنے احباب کو دکھایا۔ عابد حسن منٹو' آئی اے رحمان' نثار عثمانی اور اختر قزلباش سے اس کے بارے میں مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''یہ آپ کو آپ کی کتابوں پر انعام دیا جا رہا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن دے رہا ہے اور منتخب وزیر اعظم یہ ایوارڈ دیں گی۔ آپ نے تو ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف بھی نظمیں لکھی ہیں۔'' یوں میں نے ان لوگوں کی رائے کا احترام کیا جو زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ان کی بات کو میں نے مان لیا اور یہ انعام لے لیا۔ چوہدری شجاعت حسین نے قومی اسمبلی کے کیفے ٹیریا میں یہ بیان دیا کہ ''میں

اس کے پانچ لاکھ روپے لے کر گیا تھا' وہ حبیب جالب نے قبول نہیں کیے۔ میں حیران ہوں کہ بے نظیر بھٹو سے اس نے ایک لاکھ روپے کیسے لے لیے' لیکن لکھے گا وہ اپنی مرضی سے ہی۔" یہ آخری فقرہ جو اس نے لکھا" لکھے گا اپنی مرضی سے ہی" اس کے لیے چوہدری شجاعت حسین کا میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری عزت افزائی کی اور اپنی محبت کا اظہار کیا' اس کی یہ بات صحیح ہے کہ میں لکھتا اپنی مرضی سے ہوں لیکن میں یہ فرق ضرور بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ دور تھا جنرل ضیاء الحق کا اور ضیاء الحق ایک ڈکٹیٹر تھا۔ اس کا ریفرنڈم میرے لیے قبول نہیں کیا۔ اس کا آنا اور اتنا عرصہ رہ جانا اس کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے اسلام کو جس طرح سے Exploit کیا وہ بھی مجھے منظور نہیں تھا اس لیے میں نے اس کے پانچ لاکھ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔

بے نظیر کو چاہیے تھا کہ اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ دوستی کرتی اور غلام مصطفیٰ جتوئی' غلام مصطفیٰ کھر' ڈاکٹر مبشر حسن اور دوسرے حضرات کے پاس جاتی' ان کو اپنا بزرگ مانتی' تسلیم کرتی۔ یہ اس کے واقعتاً دوست تھے۔ چونکہ وزیر اعظم ہونا تو پھر بھی بے نظیر کو ہی تھا۔ اگر یہ ان کو بھی اپنے ساتھ رکھتیں تو بہتر تھا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اور ولی خان کے ساتھ اشتراک نہ کر کے بے نظیر بھٹو نے بڑی غلطی کی تھی اس لیے یہ لوگ آمروں کے جانشینوں سے جا ملے تھے۔ وہ جو شجاعت حسین نے کہا تھا کہ لکھے گا اپنی مرضی سے تو میں نے بے نظیر کے دور میں کہا تھا کہ

وہی حالات ہیں فقیروں کے
دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے
اپنا حلقہ ہے حلقہ زنجیر
اور حلقے ہیں سب امیروں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے
وہی اہل وفا کی صورت حال
وارے نیارے ہیں بے ضمیروں کے
سازشیں ہیں وہی خلاف عوام
مشورے ہیں وہی مشیروں کے

بیڑیاں سامراج کی ہیں وہی
وہی دن رات ہیں اسیروں کے

حکومت کی شاعری

پاک ٹی ہاؤس (کافی ہاؤس) میں بڑے اچھے اچھے لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ ہماری ان کے ساتھ ملاقاتیں رہتی تھیں۔ مولانا چراغ حسن حسرت' منظور قادر' ناصر کاظمی' اور ریاض قادر جن سے روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ منظور قادر جب وزیر ہو گئے تو ایک دن کچھ فوجیوں کے ساتھ وہاں تشریف لائے' انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ''سنائیں بھئی' آج کل کیا ہو رہا ہے؟'' میں ٹوائلٹ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ ابھی حاضر ہو کر بتاتا ہوں۔ میں ٹائلٹ سے واپس آیا ان کے ساتھ ایک جرنیل بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے منظور قادر سے کہا کہ چار مصرعے عرض کرتا ہوں۔

ذہانت رو رہی ہے منہ چھپائے
جہالت قہقہے برسا رہی ہے
ادب پر افسروں کا ہے تسلط
حکومت شاعری فرما رہی ہے

منظور قادر کہنے لگے۔ ''یہ رائٹرز گلڈ میں کیا ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا کہ تبصرہ تو یہی ہے جو آپ کو سنایا ہے۔ منظور قادر' سر عبدالقادر کے لڑکے تھے' سر عبدالقادر ادب دوست تھے' نقاد تھے' دیباچے ان کے ہوتے تھے۔ صدارتیں ان کی ہوتی تھیں۔ منظور قادر خود بھی شعر کہہ لیتے تھے۔ ان کی شاعری عجیب و غریب تھی۔ وہ جب ایوب خان کی وزارت سے نکلے' تو ان کے ہاں مجھے میر عبدالقیوم کے صاحبزادے رحمان لے کر گئے تھے۔ رحمان' چوہدری ظہور الٰہی اور جسٹس مولوی مشتاق حسین کے ساتھ ہی زخمی ہوئے تھے۔ ظہور الٰہی مر گئے' رحمان بھی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وفات پا گئے۔ رحمان کے ساتھ منظور قادر کے گھر جانا ہوا تو وہاں انہوں نے مجھے بتایا کہ ''جب تم نے مری کے مشاعرے میں اپنی نظم ''دستور'' سنائی تھی تو ہم نے کہا تھا کہ ہمارا دستور نہیں چل سکتا۔ ایک لڑکا اپنا دستور پڑھ گیا ہے۔'' انہوں نے ہمارا کلام سنا اور بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ''ہمیں ہٹانے میں ساٹھ فیصد حصہ مادر ملت کا ہے اور باقی چالیس فیصد تمہارا ہے۔'' منظور قادر بڑے مخلص اور معاملہ فہم آدمی تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ''بھئی آج کل کیا کر رہے ہو؟'' میں نے کہا کہ کرنا کرانا کیا ہے' میاں محمود علی قصوری کے ہم زلف سید مجاہد علی ہمارے لیے کچھ کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں

انشورنس کرنے کے دھندے پر لگا رکھا ہے۔ وہ ہمیں Discourage نہیں کرتے ہیں' کچھ نہ کچھ دے دیتے ہیں۔ منظور قادر نے کہا کہ "انہیں کل لے آیئے گا۔" میں انہیں لے گیا تو انہوں نے اپنے دونوں لڑکوں اور دونوں بیویوں کی انشورنس کرائی۔ اس طرح میری انا کو ٹھیس بھی نہیں پہنچی۔ سید مجاہد علی نے مجھ سے کہا تھا کہ "اگر تمہیں کوئی کہے کہ دس ہزار لے جاؤ تو نہ لینا اس سے تمہاری انا کو ٹھیس پہنچے گی اور تمہارے لیے یہ ٹھیک نہ ہوگا بلکہ یہ انشورنس کا کام کرو۔" اس طرح ہمارا وقت گزر رہا تھا۔ جب حکومتوں سے ٹکر لی جائے تو ذریعہ معاش کوئی نہیں رہتا اس لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا پڑتا ہے۔

عبداللہ بٹ

عبداللہ بٹ جو معروف صحافی تھے' ہمارے بڑے اچھے دوست تھے۔ وہ ایک خوش گو' ذہین' لطیفہ گو اور محفل کو زعفران زار بنا دینے والی شخصیت تھے۔ گفتگو میں ان کے سامنے کم ہی لوگ ٹکتے تھے۔ شورش کاشمیری کی ان سے اکثر ان بن رہتی تھی۔ عبداللہ بٹ اپنا نقصان کرنے کے "بادشاہ" تھے۔ وہ کافی ہاؤس میں کوئی بات ایسی کہہ دیتے جو حکومت تک پہنچ جاتی تھی اور پھر ان کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ "بھئی تیرے دل و دماغ کیسے تندرست رہ گئے۔" اکثر آٹھ بجے رات کے بعد ان کے ساتھ نشست ہوتی تھی۔ انڈیا میں ایک مشاعرہ تھا۔ یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ اس وق میرا پاسپورٹ بحال تھا۔ مشاعرہ پڑھنے دکن گیا۔ مشاعرے کی صدارت گورنر بھیم سین سچر نے کی تھی جو گوجرانوالہ کے پرانے نیشنلسٹ تھے۔ عبداللہ بٹ بھی نیشنلسٹ اور کانگرسی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان میں مسلم لیگ کی حکومت اس کو تنگ کرتی تھی۔ اس کا کاروبار جمنے نہیں دیا۔ فلاپ ہو گیا تھا۔ عبداللہ بٹ بڑے مزے سے سنایا کرتے تھے کہ تقسیم سے پہلے میں نے ایک مسلم لیگی کو پانچ سو روپے ادھار دیئے تھے جب پاکستان بن گیا تو میں نے اس سے مطالبہ کیا کہ میرے پانچ سو روپے واپس کر دو۔ تو اس نے چلا کر کہا" اوئے تو قائداعظم کو گالی دیتا ہے۔" بہت سارے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ "دیکھو' یہ کیا کر رہا ہے۔ ابھی تک پاکستان کو نہیں مانتا' قائداعظم کو گالی دیتا ہے۔" عبداللہ بٹ نے ہنستے ہوئے بتایا کہ میں نے اس کے کان میں کہا' میں پیسے نہیں لیتا یار' تو اس نے کہا۔ "ہاں مان گیا ہے۔" عبداللہ بٹ ابوالکلام آزاد سے بھی واقف تھے۔ مولانا آزاد سے گفتگو کا آغاز کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی لیکن عبداللہ بٹ مولانا آزاد سے بڑے بے تکلف تھے اور اس طرح گفتگو کرتے تھے۔ "ہاں تو مولانا وہ بات یوں ہے کہ......." اور مولانا بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے گفتگو شروع کر دیتے تھے۔

میں انڈیا مشاعرے میں چلا گیا۔ میں نے اپنے منتظمین سے کہا کہ مجھے بمبئی جانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسکے لیے پاسپورٹ

پہلے دہلی جائے گا' وہاں پندرہ بیس دن لگ جائیں گے۔ میں نے کہا' یہاں جلدی ویزا کون دے سکتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ کام یہاں کا گورنر ہی کر سکتا ہے۔ اب مشاعرے کی صدارت بھی گورنر نے ہی کرنا تھا۔ میری غزل ختم ہوئی تو گورنر جانے لگے۔ میں ان کے پاس گیا اور ان کے کان میں کہا کہ بھیم سین سچر صاحب! آپ کو عبداللہ بٹ سلام کہہ رہے تھے۔ وہ چونکے اور پوچھا۔ ''کہاں ہیں عبداللہ بٹ؟'' میں نے کہا' وہ تو لاہور میں رہتے ہیں۔ آپ کا ذکر ہوتا ہے۔ میر عبدالقیوم بھی آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔ اور شیخ حسام الدین بھی ذکر کر رہے تھے۔ ''لڑکے کل تم ضرور آنا اور میرے ساتھ کافی پینا'' گورنر نے مجھ سے کہا۔ اب منتظمین بھی آ گئے اور پوچھنے لگے کہ ''آپ نے کان میں کہا تھا'' میں نے کہا' بس کہہ دیا تھا جو میں نے کہنا تھا۔ دوسرے دن میں گورنر کے ہاں گیا۔ کافی وغیرہ پی۔ گوجرانوالہ کا انہوں نے پوچھا' میں نے کہا۔ کافی پھیل گیا ہے۔ بڑا گنجان آباد ہو گیا ہے۔ اٹھتے وقت میں نے کہا کہ ایک چھوٹا سا کام آپ سے آن پڑا ہے۔ کہنے لگے کہ ''کیا کام ہے جلدی بتائیں۔'' وہ پریشان ہو گئے' پتہ نہیں کیا کام ہے۔ پاکستان کے آدمی کو ہندوستان میں گورنر سے کام آ پڑا ہے۔ میں نے انہیں کہا۔ ''صاحب پریشان نہ ہوں مجھے بمبئی کا ویزہ چاہیے۔'' کہنے لگے ''میں تو پریشان ہو گیا تھا۔'' اتوار کا دن تھا' انہوں نے دفتر کھلوا کے مہریں وغیرہ لگوا کے ویزہ لگا دیا۔ میں نے بھی کہہ دیا۔ آگرہ لکھ دو' مالیر کوٹلہ لکھ دو' انبالہ لکھ دو۔ یہ عبداللہ بٹ کا ہی کمال تھا۔ اس کا ہندوستان میں بھی بہت مقام و مرتبہ تھا۔ عبداللہ بٹ کے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے مگر وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کا ماہر تھا۔ وہ ''چسکی'' لے لیتا تھا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

علمائے کرام

مولانا عبیداللہ انور بھی اپوزیشن میں تھے۔ میں اپوزیشن کے جلسوں میں جاتا تھا یہ سب علماء وہاں ہوتے تھے۔ عبیداللہ انور بہت شریف النفس' ایک نیک دل انسان اور بڑے عالم آدمی تھے۔ ایک دن وہ عید سے پہلے مال روڈ پر مجھے مل گئے۔ جیب سے ایک سو کا نوٹ نکالا اور کہا ''قبول فرمائیں۔ یہ آپ کی عیدی ہے۔'' میں نے کہا ''مولانا آپ عیدی تو دے رہے ہیں' یہ پتہ نہیں کہاں صرف ہو گی۔'' میں نے وہ عیدی قبول کر لی اور جیب میں رکھ لی۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر بھی کار روک کر مجھے سو روپے دے گئے تھے۔ مولانا عبیداللہ انور کے صاحبزادے مولانا اجمل قادری ایک دن مجھے شملہ پہاڑی کے قریب ملے۔ مجھے سینے سے لگایا اور کہنے لگے ''رات ابا خواب میں آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جالب صاحب کو دو سو روپے دے دینا۔'' میں نے کہا کہ اگر انہوں نے کہا ہے تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں اور میں نے دو سو روپے لے لیے۔ مفتی محمود ایک اعلیٰ کردار کے آدمی تھے بلند پایہ اور باعمل عالم تھے۔ وہ ہمارے ساتھ NAP میں شامل تھے۔ حکومت سرحد میں بھی شامل ہوئے تھے۔ اس سے پہلے بھی ان سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ارباب سکندر

مجھے ''او بدمعاش...... او بدمعاش'' کہتے تھے۔ مولانا مفتی محمود بھی مجھے ''بدمعاش'' ہی کہتے تھے۔ میں خوش ہوتا تھا اور کہتا۔ ہوں تو یہی آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ رات کو آٹھ بجے کے بعد جب میٹنگ ہوتی تو وہ کہتے ''باوضو ہو'' میں کہتا۔ نہیں آپ سے ملاقات کے بعد باوضو ہوں گے۔ یہ ان علماء میں Tolerence کی بات کر رہا ہوں کیونکہ یہ لوگ نیشنلسٹ تھے اس لیے دوسرے کی بات تحمل سے سنتے تھے۔

جوش وفیض

جوش ملیح آبادی بہت بڑے شاعر تھے۔ ایک دن ان سے کرشن نگر میں ملاقات ہوگئی۔ وہ اپنے میزبان کی طرف جا رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ''جالب تم نے بڑی استقامت دکھائی۔'' میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اس داد پر بے حد مسرور بھی ہوا۔ ایک دفعہ کشور ناہید کے ہاں دعوت تھی۔ فیض صاحب وہاں آئے تھے۔ میں نے وہاں اپنی یہ غزل سنائی۔

ذرے ہی سہی کوہ سے ٹکرا تو گئے ہم
دل لے کے سر عرصہ غم آ تو گئے ہم

اب نام رہے یا نہ رہے عشق میں اپنا
روداد وفادار پہ دہرا تو گئے ہم

کہتے تھے جو اب کوئی نہیں جاں سے گزرتا
لو جاں سے گزر کر انہیں جھٹلا تو گئے ہم

جاں اپنی گنوا کر کبھی گھر اپنا جلا کر
دل ان کا ہر اک طور سے بہلا تو گئے ہم

کچھ اور ہی عالم تھا پس چہرہ یاراں
رہتا جو یونہی راز اسے پا تو گئے ہم

اب سوچ رہے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے
پھر ان سے نہ ملنے کی قسم کھا تو گئے ہم

انھیں کہ نہ انھیں یہ رضا ان کی ہے جالب
لوگوں کو سرِ دار نظر آ تو گئے ہم

فیض صاحب نے جب یہ غزل سنی تو کہا کہ "لو بھئی تم شاعر ہو گئے ہو۔" ایک خاتون آگے بڑھ کر کہنے لگی۔ "آپ کو اب پتہ لگا ہے کہ یہ شاعر ہو گئے ہیں۔" میں نے اس خاتون کو روکا اور کہا کہ آپ بات نہ کریں۔ ایک بڑا شاعر مجھے داد دے رہا ہے کہیں وہ اپنے الفاظ واپس نہ لے لے۔ میں نے فیض صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ فیض صاحب نے ایوب مرزا کو ڈکٹیٹ کرایا تھا کہ "پنجابی کے وارث شاہ اور بلھے شاہ عوامی شاعر ہیں۔ اردو کے عوامی شاعر حبیب جالب ہیں۔" ایوب مرزا نے یہ بات اپنی تصنیف "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں لکھی تھی۔ انہوں نے کہیں یہ بھی کہا تھا کہ "ولی دکنی سے لے کر فیض تک کسی شاعر کو اتنے سامعین نہیں ملے جس قدر حبیب جالب کو سننے کے لیے ملے ہیں۔"

غلام محمد ہاشمی

مارشل لاء کے زمانے میں پولیس مجھے گرفتار کر کے سول لائنز تھانے میں لے گئی۔ غلام محمد ہاشمی کا بھی وارنٹ نکلا ہوا تھا' جو پرانا احراری تھا اور جس کی نظم "ربا کو چھپا کر" بہت مشہور ہوئی تھی۔ سول لائنز تھانے کے باہر میری بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ تھانیدار نے میری بیوی سے جا کر کہا کہ "جالب صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ غلام محمد ہاشمی کا پتہ میری بیوی سے پوچھ لو اس لیے تم بتا دو تو جالب صاحب کو رہا کر دیا جائے گا۔" میری بیوی نے کہا کہ "جاؤ جاؤ ہمیں کوئی پتہ نہیں اور نہ ہی جالب صاحب ایسی بات کر سکتے ہیں۔" مجھے اور میری بیوی کو غلام محمد ہاشمی کا پتہ معلوم تھا۔ فلیمنگ روڈ پر ایک جگہ NAP کا نیا دفتر تھا' وہیں وہ رہتا تھا۔ جب تھانیدار مجھے پیشی پر ملا تو میں نے اس سے کہا کہ تم حدود سے تجاوز کر گئے ہو۔ تمہارا نام میرے ذہن میں رہے گا۔ میں نے اسے غصے سے کہا تھا کہ تمہیں دیکھ لوں گا۔ میں نے کیا دیکھنا تھا۔ ہم ذاتی انتقام کے آدمی نہیں ہیں لیکن پولیس والوں کی فطرت ہی ایسی ہے کہ شاید ان کی تعلیمات ہی ایسی ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین

انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کراچی میں منائی گئی تھی۔اس کے منتظم اعلیٰ سید سبط حسن تھے۔ہمارے ان سے دیرینہ تعلقات تھے۔ہم ان کی نوازشات کے دل وجان سے مداح تھے۔سبط صاحب کا ہمارے ساتھ رویہ بڑا مشفقانہ اور سرپرستانہ رہا ہے۔انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ ہمارے بارے میں لکھا اور مسلسل لکھتے رہے۔انہوں نے ''جشن غالب'' کا اہتمام بھی کیا تھا۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ کراچی کے شاعر اور ادیب میرے فنکشن کو Avoid کرتے رہے ہیں۔میرے فنکشن میں وہ دلجمعی کے ساتھ شریک نہیں ہوتے۔اس کا سید سبط حسن کو بھی احساس تھا۔وہی لوگ ان کے اردگرد تھے جو ہمیشہ مجھ سے گریزاں رہے تھے بلکہ وہ اپنی ترقی پسندی میں مبتلا رہے۔وہ ضیاء الحق کی اکیڈمی آف لیٹرز میں بھی جاتے تھے۔ان میں بڑے نام بھی آتے ہیں۔ممتاز حسین' حسن عابدی یہ سب جاتے تھے۔میرا ذہن ہمیشہ سید سبط حسن کی سوچ کے مطابق ہی رہا کیونکہ سبط صاحب نے آدم جی ایوارڈ بھی قبول نہیں کیا تھا۔ان کی تعلیمات کے مطابق ہی ہم نے اپنا رویہ بنایا تھا۔سبط حسن بہت ہی مخلص اور سادہ آدمی تھے۔وہ بڑے ادیب' بڑے صحافی اور بڑے لیڈر تھے۔مگر اس وقت انجمن ترقی پسند مصنفین کے حوالے سے جو لوگ ان کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے' میں ان سے متفق نہیں تھا۔بہرکیف ان کا خط آیا تھا اور میں بادل نخواستہ کراچی پہنچ گیا۔وہاں مجھے ادبی کانفرنس کم لگی' سیاسی کانفرنس زیادہ لگی۔شیخ رفیق احمد (پیپلز پارٹی والے) ایک ''ادیب'' کی حیثیت سے وہاں موجود تھے اور ظہیر کاشمیری اپنی پارٹی کی طرف سے اس کانفرنس کے ''نگران'' بنے ہوئے تھے۔انہوں نے خود قمر اجنالوی سے کہا کہ ''میں نے نصرت بھٹو کو کانفرنس کی تمام رپورٹ تیار کر کے پیش کرنا ہے۔'' پریذیڈیم جسے ایوان صدارت کہتے ہیں اس کے اراکین میں ایسے چہرے بھی دیکھے جو بیوروکریٹ تھے۔ٹی وی' ریڈیو کے افسران زیادہ جو اخبارات میں آمروں کی پالیسیاں چلاتے رہے ہیں مثلاً ظہیر بابر وہ بھی صدارت پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے بہت سارے لواحقین تھے۔اس کے مبصرین میں انور سدید جو ہمیشہ سے ترقی پسندوں کے خلاف لکھتے آئے ہیں۔یہ سب مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔میرا نام ایوان صدارت میں نہیں تھا۔جس کا مجھے کوئی صدمہ نہیں تھا۔شیخ رفیق احمد نے وہاں مجھے طنزاً کہا کہ ''ابھی آپ کا نام بھی صدارت کے لیے پکارا گیا ہے آپ کہاں تھے۔'' پہلے تو میں نہیں سمجھا اور سوچا کہ ایک معقول آدمی کیسے مذاق کر سکتا ہے۔میں نے ان سے کہا کہ میرا نام کیسے پکارا گیا ہے۔میں حیران تھا۔وہ دوسرے ہی لمحے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے اور کہا کہ میں تو مذاق کر رہا تھا۔مجھے یہ بات بہت بری لگی۔میرے علاوہ کچھ اور لوگوں کو بھی اعتراضات تھے کہ یہ کیسا ترقی پسند اجتماع ہے جو سائنٹیفک سوچ پر پورا ہی نہیں اتر رہا۔سعیدہ گزدر جو ڈاکٹر سرور کی بہن ہیں اور ہماری بھی بہن ہیں۔مشتاق گزدر ان کے شوہر ہیں۔

بہت نیک اور سادہ آدمی ہیں۔ اس نے ہم پر ایک ویڈیو فلم تیار کی ہے اور ہماری نظموں کا کیسٹ بھی تیار کیا ہے تو سعیدہ گزدر بھی سخت نالاں تھیں ان کو بھی اعتراضات تھے۔ چنانچہ ہم نے یہ طے کیا کہ ہم یہ اعتراضات وہاں کانفرنس کے اجلاس میں اٹھائیں گے۔ میں اور سعیدہ گزدر وہاں الگ الگ گئے۔ میں نے وہاں جا کر ان سے پوچھا کہ یہ جو اجتماع ہم دیکھ رہے ہیں اس کے اندر پرانی حکومتوں کے اراکین' بیوروکریسی کے کچھ اراکین اور جنرل ضیاء الحق کے جلسوں میں جانے والے اشخاص بھی موجود ہیں۔ یہ کیا مسئلہ ہے۔ یہ کیسا ترقی پسند اجتماع ہے اور جو مشاعرہ رات کو ہو رہا ہے۔ اس میں بھی جن شعراء کو شامل کیا گیا ہے وہ بھی ترقی پسندی کے معیار پر پورا نہیں اترتے۔ ان کو ہم نے بیوروکریٹس کی صدارت میں مشاعرے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور ہم جس مقصد اور کاز کے لیے تمام عمر لڑتے رہے ہیں' ہمارا ان لوگوں سے کبھی واسطہ نہیں رہا۔

امپریلزم کے خلاف ہمارا نقطہ آغاز ۱۹۳۰ء کا منشور تھا اس پر ہم قائم ہیں یا نہیں۔ آج یہ کیسی شکل میں اجتماع ہو رہا ہے کہ آپ ایسے آمروں کی محفلوں میں بھی جائیں ایسی حکومتوں سے بھی وابستہ رہیں جو امپریلزم کی لائی ہوئی ہیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت بھی ظاہر ہے کوئی سائنٹیفک حکومت نہیں تھی۔ وہ بھی سامراج کے ایماء پر ہی آئی تھی۔ ہمیں کوئی لائن بنانی چاہیے اور بتانا چاہیے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ہمارا ایک رویہ ہے۔ یہ باتیں ہم نے جو کیں تو شوکت صدیقی نے مجھ سے کہا کہ "میاں تم نہیں جانتے دنیا کیسے چلتی ہے۔" اب "میاں" کہنے والے شوکت صدیقی کا "انجام" سے لے کر "مساوات" تک کا جو سفر ہے اور انہوں نے جو کچھ Contribute کیا ہے' مجھے اس سے بھی اتفاق نہیں تھا اس لیے ان کا جواب مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ میں نے ترقی پسند کانفرنس سے واک آؤٹ کیا۔ میں نے کہا کہ میں ایسی جگہ سے احتجاجاً واک آؤٹ کرتا ہوں' جہاں میرے اعتراضات کو نہیں سمجھا گیا۔ ان کو اہمیت نہیں دی گئی۔ میں چلا آیا۔ اس پر کشور ناہید نے کہا کہ "شراب پیئے ہوئے ہے۔ شراب پیئے ہوئے ہے۔" تو مجھے یوں لگا کہ جیسے کشور ناہید کے "داڑھی" نکل آئی ہے۔ کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں آ گیا۔ بیمار تھا' اس لیے سیدھا ہسپتال چلا گیا۔ سید سبط حسن کو خیال آیا کہ حبیب جالب کو جا کر لے آئیں لیکن میرے مخالفین نے اس ایک اہم آدمی کو جو میرا ہمنوا تھا' روک لیا تھا۔ میں مجاہد بریلوی کے دفتر میں اس انتظار میں تھا کہ سبط صاحب مجھے لینے آئیں گے تو میں چلا جاؤں گا اور مشاعرہ پڑھ دوں گا۔ لیکن انہیں آنے نہیں دیا گیا۔ وہ نہیں آئے۔ ہم نہیں گئے اور یہ اچھا نہیں ہوا کیونکہ لوگ پہلے ہی Bitter تھے وہاں آئے ہوئے شاعروں کو سننا نہیں چاہتے تھے۔ میں اپنی تعریف نہیں کرتا مگر مجھے سننا چاہتے تھے کیونکہ ضیاء الحق کے حلقہ بگوشوں کو سننا نہیں چاہتے تھے۔ عوام کا حافظہ بڑا خوفناک ہوتا ہے وہ آمریت کے ہاتھوں تنگ تھے اس لیے ان شاعروں سے بھی متنفر تھے۔

سید سبط حسن بیمار تھے۔ بیماری کے عالم میں ہی لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں بھی ترقی پسند مصنفین کا پچاس سالہ اجلاس ہو رہا تھا۔ وہ عالم بیماری میں ہی وفات پا گئے۔ ان کو یہی لوگ لے گئے تھے۔ کیونکہ وہ ان کو لاٹھی تھے ان کے بغیر ان کی ترقی پسندی بھی مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے سہارے ہی چل رہی تھی۔ سید سبط حسن کی وفات سے دونوں ملکوں کے ترقی پسند اور روشن خیال لوگوں کا عظیم نقصان ہوا تھا۔

جب میں واک آؤٹ کر رہا تھا تو اعلان ہو گیا کہ اگلے سیشن کی صدارت سعیدہ گزدر فرمائیں گی اس لیے وہ بیچاری رک گئیں ورنہ انہیں میرے ساتھ ہی آنا تھا۔ مشتاق گزدر نے مجھے مجھ سے پوچھا کہ "وہ کیوں نہیں آئیں ان کو بھی آپ کے ساتھ ہی واک آؤٹ کرنا چاہیے تھا۔" میں نے ان سے کہا کہ ان کی مجبوری ہوگی اب اتنی بھی پابندیاں نہ لگائیں ان صدارت کا اعلان ہو گیا تھا اس لیے وہ رک گئیں۔ مشتاق گزدر کی فطرت میں حق گوئی اور منصف مزاجی شامل ہے' جس کا انہوں نے برملا اظہار کیا کہ سعیدہ گزدر کو ساتھ آنا چاہیے تھا۔ مگر میں ایسے کام تنہا ہی کرتا آیا ہوں' ساتھیوں نے بھی بعض جگہوں پر ساتھ نہیں دیا۔

بے گھری اور بے دری

بے شمار لوگوں سے میری واقفیت تھی۔ کئی لوگوں کے گھروں میں رہا ہوں۔ زندگی بے گھری سے وابستہ تھی۔ مدتوں بے گھری اور بے دری کا ساتھ رہا اور اکثر راتیں ویران گزری ہیں۔ ایک دفعہ ایک خانقاہ کے پچھواڑے مجھے رضائی پڑی ہوئی دکھائی دی۔ میرے پاس سونے کی جگہ نہیں تھی۔ میں اسی تلاش میں تھا۔ شدید سردی تھی۔ میں نے رضائی دیکھی اور اس میں گھس گیا۔ وہاں کوئی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "بھائی تینوں شرم نہیں آوندی۔" میں نے کہا۔ "آوندی اے۔" وہاں سے بھاگا اور سردی میں ٹھٹھرتا ہوا ایک مسجد میں جا گھسا۔ مسجد کے مولوی نے مجھے کہا کہ "یہ سونے کی جگہ نہیں ہے۔" میں نے کہا' یہ اللہ کی جگہ ہے تمہارے باپ کی جگہ نہیں ہے۔ میں اللہ کا بندہ ہوں اور یہاں رات گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ وہ پھر کہنے لگا کہ "یہ سونے کی جگہ نہیں ہے۔" انہیں یہاں سے یہاں کے امام مسجد صاحب کی اجازت نہیں ہے۔" میں نے ان سے بحث و تکرار کی تو مولویوں نے میرے ہاتھ اور ٹانگیں پکڑ لیں اور مجھے اٹھا کر مسجد کے باہر پھینک دیا۔

◆◆◆

کچھ لوگ خیالوں میں

ناصر کاظمی

ناصر کاظمی ایک بہت اچھا شاعر تھا۔ اس کا اپنا ایک منفرد اسلوب تھا۔ بڑا شاعر بننے کے لیے تھوڑی مشکل ہوتی ہے اور اس کے لیے بڑا طویل اور کٹھن سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ فیض صاحب تو بڑے شاعر کہلانے کے مستحق ہو گئے ہیں۔ ناصر کاظمی سے بڑی دلچسپ ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ کہنے لگے کہ "آج کی شام تم ہم پر خرچ کرو کیونکہ میری طرف سے چودہ شامیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔" ہم نے اس کے لیے ایک شام روشن کر دی۔ بہت عرصہ گزر گیا تو میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ اب وہ چودہ شامیں جو میرا انتظار کر رہی ہیں ان میں سے کوئی "شام" تم ہمارے دامن میں ڈال نہیں رہے اور جھوٹ ہی بولے چلے جا رہے ہو۔ وہ جھوٹ اس طرح بولتا تھا کہ اس پر غصہ کم آتا تھا بلکہ مزا زیادہ آتا جیسے کوئی بچہ بول رہا ہے۔ جیسے اس نے کہا تھا کہ کون فراق؟ کیسا فراق؟ کس کا فراق اور میں نے کہا تھا کہ تمہارا باپ فراق۔ حالانکہ وہ خود فراق صاحب کا معتقد تھا۔ ناصر کاظمی بہت دلچسپ آدمی تھا اور بہت اچھا شاعر تھا۔

مختار صدیقی بھی پاک ٹی ہاؤس میں آتے تھے بلکہ حلقہ ارباب ذوق میں قیوم نظر سے زیادہ آیا کرتے تھے۔ مختار صدیقی خوش کھو اور بذلہ سنج آدمی تھے اور ایک بڑے شاعر تھے۔ استاد یوسف ظفر بہت پیاری چیز تھے۔ شہرت بخاری کا اپنا ایک انداز ہے۔ یہ سب لوگ سیاست میں نہیں تھے، میں تو عملی سیاست کی طرف نکل گیا تھا۔ کبھی کبھی لوٹتا تو ان سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ شورش کاشمیری نثر و نظم میں قادر الکلام ہو گئے تھے۔ اپنا پورا رسالہ وہ لکھا کرتے تھے۔ ان سے اختلاف اپنی جگہ پر ہے لیکن وہ ایک ذہین آدمی تھے۔ وہ احسان دانش کے شاگرد تھے۔ احرار کا کام تو ہندوستان میں ہی ختم ہو گیا تھا انھوں نے پاکستان کی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ اس لیے شورش کاشمیری کا تعلق تحریک ختم نبوت سے ہو گیا تھا۔

عطاء اللہ شاہ بخاری

احراری رہنما سید عطاء اللہ شاہ بخاری بے پناہ خطیب اور مقرر تھے۔ ان کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی جلسے میں صبح تک بلا تکان تقریر کرتے رہتے اور لوگ ان کو سنا کرتے تھے۔ ان کے خطبات اور تقریروں میں ایسا جادو تھا کہ لوگ انہیں سن کر کبھی روتے تو کبھی ہنس رہے ہوتے وہ بہت بڑے عالم تھے۔ عطاء اللہ سے میری ملاقات شیخ حسام الدین نے ماڈل ٹاؤن میں کرائی تھی۔ شیخ حسام نے مجھ سے کہا کہ دو ایک شعر ترنم سے سناؤ۔ میں نے عطاء اللہ شاہ بخاری کو اپنی یہ غزل سنائی تھی جس کا مطلع تھا۔

انہوں نے وہ رنج دیئے ہیں بیگانے یاد آتے ہیں
دیکھ کے اس بستی کی حالت ویرانے یاد آتے ہیں

اور مقطع تھا کہ

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالب
چاروں جانب سناٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں

ان کے دل کی حالت بڑی نازک تھی۔ غزل کے اشعار سن کر ان پر رقت طاری ہوگئی اور انہوں نے مجھے پڑھنے سے روک دیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ترقی پسندوں سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ جیل میں رہنے کی وجہ سے وہ سب لوگ سے ملا جلا کرتے تھے۔ وہ خود ایک انقلابی آدمی تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ بھائی تو مجھ سے نہ ملا کر کہیں میرا ایمان نہ متزلزل ہو جائے۔ ساحر لدھیانوی کا ایک بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ان سے اپنی ایک قطعہ بند غزل کا دوسرا شعر نہیں ہو رہا تھا۔

ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

ساحر لدھیانوی فوراً عطاء اللہ شاہ بخاری کے پاس گئے اور ان سے جا کر کہا کہ مجھ سے دوسرا شعر نہیں ہو رہا ہے۔ شاہ صاحب نے سنا اور اسی وقت دوسرا شعر کہہ دیا کہ

چمن اسی لیے مالی نے خوں سے سینچا ہے
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

ساحر نے پوچھا کہ "یہ شعر میرا ہے؟" انہوں نے کہا کہ "ہاں اب تمہارا ہو گیا ہے۔" شورش کاشمیری تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مریدین میں شمار ہوتے تھے۔

شورش کاشمیری

میں ''چٹان'' کے دفتر جایا کرتا تھا کیونکہ شورش کے منیجر ملک عبدالسلام میرے بہت اچھے دوست تھے۔ وہ خود بھی ایک اچھا نثر نگار اور ادیب آدمی ہے۔ وہ شورش کاشمیری کا منیجر تھا لیکن دراصل وہ اس کا مشیر خاص ہی تھا۔ ملک عبدالسلام کئی مسلکوں پر ہفت روزہ ''چٹان'' میں لکھ لیتا تھا۔ ہمارا وہ یار غار ہے اب وہ گوجرانوالہ میں رہتے ہیں۔ وہ اکثر شورش کاشمیری کے ساتھ ہی کافی ہاؤس میں آیا کرتے تھے اور شورش کاشمیری میری طرف دیکھ کر انہیں کہتے کہ ''وہ تمہارا یار بیٹھا ہوا ہے۔'' ایک دن رات کو آٹھ یا نو بجے کے قریب شورش سے میری لڑائی ہوگئی تھی تو سید خورشید محمود نظامی اور سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی نے میری ان سے صلح کرادی تھی۔ اس کے بعد شورش کاشمیری سے سلسلہ ملاقات رہا۔

ایک دن میں حسب دستور ''چٹان'' کے دفتر کی طرف جا رہا تھا کہ لکشمی چوک کے نزدیک پولیس والوں نے میرا رکشہ روک لیا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے کا عمل ہوگا۔ انہوں نے مجھے رکشے سے باہر نکال کر تلاشی بھی لی۔ مجھے ان پر بہت غصہ آیا اور میں ''چٹان'' کے دفتر پہنچا۔ وہاں پر ملک عبدالسلام نہیں تھے۔ میں نے شورش کاشمیری کا یہ واقعہ سنایا کہ میرے ساتھ یہ ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''بیٹھ جاؤ۔'' اس وقت وہ اپنی پرنٹنگ مشین کا کوئی پرزہ وغیرہ ٹھیک کر رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ میں بیٹھا رہا۔ میں نے کہا کہ ''میں چلتا ہوں۔'' اس نے پھر مجھے روکا۔ مجھے ''دوہری بوریت'' ہو رہی تھی۔ ایک تو پولیس والوں نے بور کیا وہ دوسرے شورش بور کر رہا تھا اور ملک عبدالسلام بھی نہیں تھا۔ مجھے بہت کوفت ہو رہی تھی اور وہ کہے جا رہا تھا کہ ''بیٹھے رہو'' ایک گھنٹے بعد وہ فارغ ہوا اور میرے ساتھ چٹان کے دفتر سے باہر نکلا اور جہاں پولیس والے کھڑے تھے وہاں پہنچ گیا۔ شورش کاشمیری جاتے ہی ان پر گرج پڑا اور کہا کہ ''یہ کیا تم نے پولیس راج بنا رکھا ہے۔ تم نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ حبیب جالب ہیں ان کی تلاشی لی ہے میں تم کو معاف نہیں کروں گا۔'' وہاں لوگ اکٹھے ہو گئے۔ شورش کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ بہت بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے پولیس والوں کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اب پولیس والے ہمیں تانگے میں بٹھا کر تھانہ گوالمنڈی لے آئے۔ وہاں ایس ایچ او بیٹھا ہوا تھا۔ شورش نے اس پر بھی چڑھائی کر دی اور وہیں سے ادھر ادھر ٹیلیفون کرنے شروع کر دیئے۔ مظفر علی شمسی بھی آ گیا۔ امروز سے فوٹو گرافر بھی آ گیا۔ مجید نظامی سے بھی رابطہ ہو گیا۔ اب تھانے والوں کو مصیبت پڑ گئی کہ یہ کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ شورش کاشمیری نے ان سے کہا کہ ''پولیس والوں پر مقدمہ بناؤ۔'' ایس ایچ او نے کہا کہ آپ ہمیں معاف کر دیں ہم سے غلطی ہوگئی ہے۔ لیکن شورش نہ مانا۔ میں اس کے ساتھ ہی اس کے گھر چلا گیا۔ چیف سیکرٹری پنجاب کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ بھٹو صاحب کو اس معاملے کی خبر ہو گئی اور وہ فون پر کہہ رہے ہیں کہ

''جالب صاحب کو چوٹیں تو نہیں آئیں وہ خیریت سے ہیں؟'' شورش کاشمیری نے اعلان کر دیا کہ ''میں اور جالب گورنر ہاؤس کے سامنے ہڑتال کریں گے۔ ایس ایچ او کو معطل کیا جائے۔'' اب ساری حکومت ہل گئی۔ میں اس کے ساتھ ہی تھا۔ آئی جی پنجاب پولیس کی شورش کاشمیری سے ٹیلیفون پر بات ہوئی اور اس نے ہمارا مطالبہ پورا کر دیا۔ ایس ایچ او کو معطل کر دیا۔ یہ واقعہ بھٹو دور کا تھا۔ شورش کاشمیری اپنی ہی ادا کا آدمی تھا۔ وہ کسی کو ''خرید و فروخت'' سے مطلع نہیں کرتا تھا۔ شورش کی موت کے بعد بیگم شورش کاشمیری نے مجھ سے کہا کہ آپ چٹان میں لکھا کریں۔ ملک عبدالسلام چٹان میں بغیر معاوضے کے لکھا کرتا تھا۔

جگر مراد آبادی

لائل پور (فیصل آباد) میں ہر سال کاٹن مل کا مشاعرہ کرتا تھا جس کی صدارت میر عبدالقیوم کیا کرتے تھے۔ میر عبدالقیوم پرانے نیشنلسٹ تھے۔ بڑے ذہین، پڑھے لکھے اور روشن خیال آدمی تھے۔ ان کے ہاں جگر مراد آبادی آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ جگر مراد آبادی میر صاحب کے بیٹوں سے رات کو رمی کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن میر صاحب کے والد جن کی عمر نوے سال تھی، وہ جاگ پڑے۔ انہوں نے شور سنا تو وہاں آ گئے اور جگر صاحب کو ڈانٹنا شروع کر دیا کہ ''اوئے بدمعاش میرے بچوں کو خراب کر رہے ہو، کون ہو تم؟'' اتنے میں میر عبدالقیوم بھی جاگ پڑے وہ آئے اور کہا۔ ''ابا...... ابا...... ادھر آئیں۔'' اب ان کے والد کوئی بات نہیں سن رہے تھے وہ جگر صاحب کو ڈانٹتے کوستے اور برا بھلا کہتے ہوئے چلے گئے۔ میر عبدالقیوم نے جگر صاحب سے معذرت کی کہ ''میں آپ سے معافی چاہتا ہوں میرے والد صاحب نے یہ کہا وہ کہا۔'' جگر صاحب نے جواب دیا کہ ''آپ کے والد میرے بھی والد ہیں جو کام انہوں نے کرنا تھا کر دیا بزرگ تو ڈانٹ ڈپٹ کیا ہی کرتے ہیں اب ہم پھر کھیلیں گے۔'' اور انہوں نے دوبارہ رمی کھیلنا شروع کر دی۔ جگر صاحب آخری ایام میں ترک شراب کے بعد تاش میں دل لگایا کرتے تھے۔ وہ بہت ملنگ صفت انسان تھے اور وسیع القلب واقع ہوئے تھے، ان کے منہ سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی تھی۔ جوش ملیح آبادی ان کے ترک شراب پر طنز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ ''تو مولوی ہو گیا ہے تو نے شراب چھوڑ دی ہے۔'' جگر مراد آبادی نے جواب میں یہ شعر کہا تھا کہ

میرے حال پریشاں پہ بہت طنز نہ کر
اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے

حفیظ جالندھری

فیض احمد فیض روس گئے تو حفیظ جالندھری بھی ان کے ساتھ تھے۔ حفیظ صاحب اپنے منہ سے کہتے کہ

I am greater than Faiz (میں فیض سے بڑا شاعر ہوں)

حالانکہ فیض صاحب کا روس میں بہت مقام و مرتبہ ہے۔ وہاں ان کا بہت نام ہے۔ حفیظ کی یہ بات سننے والے ہنس کر رہ جاتے تھے۔ حفیظ جالندھری غزل' نظم اور گیت کا ایک بڑا شاعر ہے لیکن ان کی یہ ''خوبی'' ان میں نہ ہوتی تو وہ بہت بڑے شاعر تسلیم کیے جاتے۔ ان کا اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنا ایسا ہی تھا جیسے تاج محل گفتگو کرنے لگے اور لوگوں کو اس سے اختلاف بھی ہوگا۔ حفیظ جالندھری اگر خاموش رہتا تو وہ تاج محل کی طرح اپنی عزت کراتا لیکن اس میں یہی ایک خرابی تھی۔ ایک دفعہ حفیظ جالندھری مجھ سے کہنے لگے کہ ''او میں تیری بڑی عزت کرتا ہوں اور میں تجھے شاعر مانتا ہوں' دوسرے نہیں مانتے۔'' میں نے کہا کہ ''آپ ہی مجھے مانتے رہیں' دوسروں کو میں خود منا لوں گا۔'' حفیظ جالندھری سے ہماری پہلی ملاقات اوکاڑہ کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی۔ مشاعرے کے بعد ایک ہی کمرے میں ہمارا قیام تھا۔ میں اس وقت نوجوان تھا' مجھے نیند آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کمرے کی بتی بجھا دی۔ حفیظ صاحب کو دیر سے نیند آتی تھی۔ میں سونا چاہ رہا تھا کہ انہوں نے اندھیرے میں ہی سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اندھیرے میں ہی آواز آئی کہ ''جالب تجھے کیا تکلیف ہے تو شعر کیوں کہتا ہے۔'' اب سوال بڑا مشکل تھا' جواب اس کا بڑا طویل ہو جاتا۔ میں نے مختصراً اس کا جواب دیا کہ جناب آپ کو سنا' آپ کو پڑھا اور شعر کہنے کا شوق ہو گیا۔ اس جواب پر بڑے خوش ہوئے۔ اندھیرے میں ہنکارے کی آواز آئی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ''جواب درست ہے۔'' میں نے کہا' رات کافی جا چکی ہے اب آپ سو جائیں باقی گفتگو صبح ہوگی۔ وہ پھر بولے۔ ''ہم آج مشاعرے میں کیسے رہے؟'' میں نے کہا' آپ ہی آپ تھے اور کون تھا۔ مشاعرے میں اس سوال کا جواب بھی میں نے ''بہت درست'' دے دیا تھا اور وہ جواب کے مطابق بہت خوش ہوئے۔ میں بھی خوش ہوا کہ اب تیسرا سوال نہیں داغا جائے گا اور اس سے پہلے کہ تیسرا سوال ہو' میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ صبح اٹھا تو وہ مجھ سے بولے۔ ''جالب تو کہاں جائے گا؟'' میں نے کہا' میں لائلپور میں کوہ نور ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا ہوں' مجھے تو وہاں جانا ہے۔'' بولے ''وہ سیف سہگل' سعید سہگل کے پاس؟'' میں نے کہا۔ جی ہاں! ان کی یہ مل ہے۔ پھر بولے۔ ''اوئے میں ان سے کہہ دوں گا۔'' اب یہ پتہ نہیں کیا کہہ دوں گا۔ رکھ لینا یا نکال دینا۔ حفیظ صاحب شاعر اچھے تھے اس لیے ان کی یہ ضد کہ ''میرے ساتھ لاہور چل'' میں نے مان لی۔ اوکاڑہ بسوں کے اڈے پر کار رکوائی اور جا کر لسی کے دو گلاس بنوا کر لے آئے۔ میں نے کہا' حفیظ صاحب میں تو چائے پیتا ہوں۔ کہنے لگے۔ ''او مر گیا تو میرا ذمہ'' میں نے وہ لسی کا گلاس پی لیا۔ کار لاہور کی طرف چل پڑی۔ پندرہ منٹ بعد مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی تو انہوں نے

اپنی کہنی کا کچوکا میری کمر میں لگایا اور سلسلہ کلام شروع کر دیا۔ "حضور اس شعر کے معنی یہ تھے کہ اشارہ تاریخ کی طرف تھا۔"
"کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں"
انگوٹھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "بہلایا گیا ہوں۔" پھر گویا ہوئے۔ "حسرت موہانی نے مجھ سے کہا کہ حفیظ یہ شادی خانہ آبادی کا مسئلہ ہے۔"

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

"سن جالب سن!" میں نے کہا۔ "سنائیں ارشاد"

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ....

"وہیں" کہہ کر انہوں نے شعر کہنا بند کر دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو نیچے کر کے کہا۔ "وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں۔" (اشارہ شراب کی طرف تھا) پھر انہوں نے اشاروں کنایوں میں ہی باقی اشعار پڑھے۔ اگلا شعر انہوں نے بڑے زور سے اور خم ٹھونک کر پڑھا کہ

حفیظ اہل زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

یہ واحد سفر تھا جو میں نے ان کے ساتھ اوکاڑہ سے لاہور تک کار میں طے کیا تھا۔ لاہور آ کر میں ان کے ساتھ نہیں رہا اور ان کو غچہ دے کر کھسک گیا' واپس لائلپور چلا گیا۔ وہ اپنی گفتگو میں بڑی تھکا دینے والی شخصیت تھے۔ انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ آدمی ان کا نیاز مند ہے۔ اپنے مداحین پر انہیں شک رہتا کہ شاید اندر سے نہ ہوں۔ ان کو بار بار آزماتے رہتے تھے۔ "قومی ترانہ" انہوں نے جو لکھا ہے وہ واقعی ان کا معرکہ ہے۔ ان کو گیت لکھنے کی مہارت تھی۔ اس طرز پر ترانہ لکھنا دوسرے شاعروں کی بس کی بات نہیں تھی۔ علی پور روڈ دہلی پر سانگ پبلسٹی کا محکمہ تھا' وہاں بھی ان سے ملا تھا۔ مجھے میرے والد صاحب وہاں لے گئے تھے۔ وہاں حفیظ صاحب کے علاوہ اور لوگ بھی ہوتے تھے' سلطان کھوسٹ تھے۔ میوزیشن اور گائیک بھی تھے۔ حفیظ صاحب نے وہاں ان دنوں پنجاب سے جوانوں کو فوج میں بھرتی کرانے کے لیے یہ گیت لکھا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ "میں تو چھوہرے کو بھرتی کرا آئی۔"

میں ان کو تب سے ہی جانتا ہوں۔ اس وقت ابوالاثر حفیظ جالندھری کو "خان بہادر" کا خطاب مل چکا تھا۔ ان دنوں کرنل فیض احمد فیض، میجر حسن چراغ حسرت، کیپٹن ہلالی یہ سب اعزازی تھے۔ مجاز لکھنوی نے آل انڈیا ریڈیو کے ایک مشاعرے سے غالب کی زمین میں ایک مصرع پڑھا تھا کہ

"کرنل نہیں ہوں، خان بہادر نہیں ہوں میں"

اس مصرعے کے فوراً بعد مجاز کو مائیک سے ہٹا لیا گیا اور کسی دوسرے شاعر کو پڑھوایا گیا۔ ایسا ہی میرے ساتھ کراچی میں ہوا تھا۔ حفیظ ہوشیار پوری کے زیر اہتمام ریڈیو پر ایک مشاعرہ تھا۔ اب میرا نام پکارا گیا۔ میں اپنی یہ غزل پڑھنا چاہتا تھا۔

طواف کوئے ملامت کو پھر نہ جا اے دل
نہ اپنے ساتھ ہماری بھی خاک اڑا اے دل

اس غزل کا مزاج ان کو کھلا تو انہوں نے میرا نام پکارنے کے باوجود مجھے مائیک سے ہٹا دیا، کسی اور کو پڑھوا دیا۔ اس دوران یہ بحث چلتی رہی کہ پڑھنے دیا جائے یا نہیں۔ آخر میں انہوں نے ہمیں کہا کہ "آپ پڑھ سکتے ہیں" لیکن ہمارے طالب علم دوستوں حسین نقی اور دوسرے لوگوں نے کہا اب یہ نہیں پڑھیں گے۔ میں نے بھی ان سے کہہ دیا کہ اب تو ہمارے یاروں نے کہہ دیا ہے اس لیے ہم نہیں پڑھیں گے اور میں نے نہیں پڑھا۔ میرے والدین ریڈیو کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور وہ حیران ہو رہے تھے کہ "حبیب جالب" نام تو پکارا گیا تھا۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ اسٹیج سے ہی لڑھک گیا ہے اس کی آواز نہیں آئی۔ نعیم بخاری نے بھی میرا انٹرویو اپنے "بلا تکلف" میں کیا تھا، دو دن تک اس کی جھلکیاں آتی رہیں۔ پھر اس کے بعد معلوم ہوا کہ Ban کر دیا گیا ہے۔ پھر کانٹ چھانٹ کر کے انہوں نے دکھا دیا تھا۔ نعیم بخاری نے کہا تھا کہ "بلا تکلف" میں بلا تکلف ہی گفتگو ہو گی لیکن اس پروگرام سے پہلے آغا ناصر بھی وہاں موجود تھے جو مجھ سے سوال جواب کر رہے تھے۔

چوہدری کرم الٰہی

احمد ریاض کو میں اکثر رات کو روک لیا کرتا تھا۔ ہم اکٹھے کھاتے پیتے تھے۔ غلہ منڈی کی ایک چھت پر چار پائیاں اور بستر لگے ہوتے تھے، وہیں ہم آرام کر لیا کرتے تھے۔ صبح اٹھ کر ہم چلے جاتے تھے۔ وہاں ہمیں سب ہی جانتے تھے۔ غلہ منڈی میں ہمارا ایک دوست چوہدری کرم الٰہی ہوا کرتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں غالب کی بڑی سی تصویر لگا رکھی تھی۔ اس کے ساتھ اتنی ہی بڑی اپنی تصویر لگا رکھی تھی اور ایک دوست لئیق جمال کی تصویر بھی لگائی ہوئی تھی۔ لئیق جمال ہمارا بھی اچھا دوست ہے اور محکمہ ٹیلیفون میں

کام کرتا ہے۔ چوہدری کرم الٰہی گڑگاواں کے رہنے والے تھے۔ میں جب دلی میں رہتا تھا تو گڑگاواں جایا کرتا تھا تو ان سے گفتگو کے دوران گڑگاواں کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ دلی میں ایک فلم کا آدمی تھا نرن کمار وہ بھی گڑگاواں کا ہی تھا۔ ہمارے ایک دوست اصغر لودھراں تھے ان کو فلم ایکٹر بننے کا شوق تھا۔ وہ نرن کمار کے ہاں رہتے تھے۔ اصغر لودھراں اپنے گھر سے کچھ پیسے اور زیورات چرا کر لایا تھا جو اس نے نرن کمار کو دے دیئے۔ وہ کھا پی گیا۔ بعد میں وہ اس سے مانگنے آیا کرتا تھا لیکن وہ اسے پیسے کہاں سے دیتا۔ چوہدری کرم الٰہی بھی انہیں جانتا تھا۔ چوہدری اپنی تجوری میں ''آب مغرب'' رکھا کرتا تھا۔ رات کے آٹھ بجے کے بعد وہ یہ ''آتش سیال'' نکالتا اور پھر ہم مل کر پیتے تھے۔ وہ اس طرح ہماری عزت افزائی کیا کرتا تھا۔ چوہدری کرم الٰہی کے پاس دیوان غالب تھا۔ وہ غالب کی تصویر کی طرف دیکھتا اور اس کے اشعار پڑھنا شروع کر دیتا۔ وہ کبھی اس نے وزن میں نہیں پڑھے۔ ہر شعر خارج البحر پڑھنے میں خاصا پختہ ہو گیا تھا۔ اس کی واپسی ناممکن تھی اس لیے اصلاح بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر جب ایک مخیر اور خلیق آدمی ہو تو ہم غالب کی روح سے معذرت کر کے خود ہی شعر کی تصحیح کر لیتے تھے اور غالب کی روح سے معافی مانگ کر کہتے تھے کہ ''آپ کا کلام ذبح تو کرتا ہے لیکن آپ کا نام تو لیتا ہے۔ ہم آپ کا شعر سمجھ رہے ہیں۔ آپ اس کا برا نہ مانیں۔''

اصغر لودھراں

اصغر لودھراں کو میں ایک زمانے تک یہی سمجھتا رہا کہ وہ ہندو ہے کیونکہ وہ نرن کمار کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ایک دفعہ ہم فلم دیکھنے جا رہے تھے۔ راستے میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ ''اگر میں یہ بتا دوں کہ میں مسلمان ہوں؟'' میں نے جواب دیا ایسی کوئی بات نہیں۔ تم ہندو بھی ہوتے پھر بھی ہمارے دوست ہوتے۔ وہ بڑا شرمیلا آدمی تھا۔ خورشید اس زمانے کی بہت بڑی ایکٹرس تھی۔ فلموں کی ہیروئین تھی اور بڑی اچھی مغنیہ تھی۔ اصغر اس کو اکثر خطوط لکھا کرتا تھا لیکن ان کا جواب اسے کبھی نہیں آیا وہ اس کا ''پروانہ'' تھا۔ خورشید کو میں بھی بہت پسند کرتا تھا کیونکہ اس کی آواز بڑی خوبصورت تھی۔ سادہ' بے عیب اور دل میں اتر جانے والی آواز تھی۔ اصغر لودھراں کے ایکٹر بننے کی خواہش تو مرتے دم تک نہ پوری ہوئی مگر وہ خورشید پر مرتا رہا۔ خورشید پاکستان بننے کے بعد کراچی آ گئی تھی۔ وہ لالہ یعقوب کی بیوی تھی۔ لالہ یعقوب سے ہماری واقفیت ہو گئی تھی لیکن ہم نے اس کے سامنے یہ اظہار نہ کیا کہ ہمیں خورشید کی آواز بہت پسند ہے اور ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں اور نہ انہوں نے ہمارا تعارف کرایا تھا۔ آج تک ہماری ملاقات خورشید سے نہیں ہو سکی۔ ایک آدھ بار اسے ٹی وی پر دیکھا تھا۔ جی تو بہت چاہتا تھا کہ ہم اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی باتیں سنیں۔ جیسے اقبال بانو' فریدہ خانم' نور جہاں' ملکہ پکھراج' زبیدہ خانم اور دوسری خواتین کو سننے کا اتفاق ہوا۔ اکثر تو میرے گیت بھی گاتے ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ

سب نے ہی گائے ہیں۔

چوہدری کرم الٰہی کو کرکٹ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔تمام Players اس کے دوست تھے۔وہ بیماری کے عالم میں بھی لاہور کرکٹ کا میچ دیکھنے کے لیے آجایا کرتے تھے۔مولانا غلام رسول ڈنڈیالوی نے ہمیں سنا اور انہوں نے اپنے کارخانے کی چھت پر چارپائی دے دی تھی اور کہا تھا کہ ''آپ یہاں سوجایا کریں۔'' اکثر یہ ہوتا تھا کہ مجھے رات کے بارہ بجے کے بعد ہی سونے کا انتظام کرنا پڑتا تھا کیونکہ میرا اپنا گھر تو نہیں تھا۔پھر جب میں ملازم ہوگیا تو لائلپور پریس کلب میں ہی سوجایا کرتا تھا۔اعجاز چشتی ہمارے دوست تھے ان کے بزرگوں کا وہاں مزار تھا' کبھی کبھی میں اور م حسن لطیفی وہاں جاکر سوجایا کرتے تھے۔

م حسن لطیفی

م حسن لطیفی بہت اچھے شاعر تھے۔ذہین آدمی تھے۔لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔وہ شہر کے میئر رہ چکے تھے۔ان دنوں ان کے عجیب وغریب حالات تھے۔ان کی بارعب شخصیت تھی۔باہر سے پڑھ کر آئے تھے۔انکا بچہ مرنے سے ان کی دماغی حالت تھوڑی خراب ہوگئی تھی۔لدھیانہ میں بھی ان کی دماغی کیفیت درست نہیں تھی۔بہرکیف وہ ایک بڑے شاعر تھے۔ان کی آمد پر لدھیانہ میں اختر شیرانی نے بھی قصیدہ لکھا تھا۔جس کا ایک شعر ہے۔

آسماں جیسا لطیفی تیرا مستقبل ہو
تو وطن کے واسطے ہو اور وطن تیرے لیے

م حسن لطیفی کا یہ شعر تو مشہور زمانہ ہے کہ

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
تو وطن کے واسطے ہو اور وطن تیرے لیے

م حسن لطیفی کا یہ شعر تو مشہور زمانہ ہے کہ

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ تم نے فراموش کر دیا

یہ شعر بہت مشہور ہوا تھا۔لائلپور میں ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔وہ مجھے اختر شیرانی سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔خود بہت طویل نظمیں کہتے تھے۔ایک دفعہ مجھ سے ناراض ہوگئے کہ میں نے تاج محمد خیال کو مشاعرے کی صدارت دے دی تھی۔خیال صاحب

گورنمنٹ کالج لائلپور کے پرنسپل تھے' وہ بڑے شریف آدمی تھے اور شاعر بھی تھے۔ م حسن لطیفی ان کو صدارت دینے پر مجھ سے ناراض ہو گئے تھے اور انہوں نے مشاعرے میں ایک ہی شعر پر اکتفا کیا تھا۔ ایک نظم میں میرے خلاف کچھ شعر کہہ ڈالے۔ میں نے وہ نظم مشاعرے کے بعد بھی ان سے سنی اور دس روپے ان کی نظر کئے اور کہا کہ یہ بہت اچھی نظم ہے۔ میرے خلاف آپ نے اچھے شعر کہے ہیں' اب آپ گھر جائیں دیر ہو رہی ہے۔ میں فلم دیکھنے چلا گیا۔ جب رات کے بارہ بجے واپس آیا تو وہ وہیں بیٹھے ہوئے اور انہوں نے ایک بار پھر وہ نظم سنائی۔ میں نے کہا' حضور آپ تھکے نہیں۔ آپ تھک جائیں گے۔ وہ سو گئے۔ ہم ان کی سخت سست باتیں سنتے تھے اور انجوائے کرتے تھے۔ وہ بزرگ آدمی تھے اور وہ شاعر بڑے اچھے تھے۔ عالم تھے۔ ایک دفعہ میں نے ''تلاش گمشدہ'' کے زیر عنوان ایک قطعہ ''غریب'' اخبار میں چھپوا دیا تھا۔

ابھی دوستوں کو یہ کہتے سنا ہے
لطیفی کئی روز سے لاپتہ ہے
ذرا دیکھنا نکہت گل چمن میں
کہ شاعر نہ جانے کہاں کھو گیا ہے

گرمی بہت شدید تھی۔ م حسن لطیفی کسی برف خانے میں پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہ قطعہ پڑھا اور مجھے ڈھونڈتے ہوئے آ گئے اور کہا کہ ''ارے بھئی جالب میں آ گیا ہوں' میں نے تمہارا قطعہ پڑھا ہے۔'' میں نے کہا' بس اسی طرح آپ سے ملاقات ہو سکتی تھی اس لیے میں نے وہ ''اشتہار'' دے دیا تھا۔ لائلپور میں لطیفی صاحب سے ہماری یادگار ملاقاتیں رہیں ان سے ہم نے بہت اثر لیا۔ ان کی شخصیت میں بڑا درد تھا۔ وہ فقراء کو دو دو میل دور کھانا دینے جاتے تھے' اگر انہوں نے کسی فقیر' فقیرنی یا کسی غریب عورت سے کہیں وعدہ کر لیا کہ میں کھانا لاؤں گا تو پھر سارے شہر سے کھانا جمع کر کے اس کو پہنچاتے تھے۔ اکثر وہ خود کم کھاتے تھے دوسروں کو زیادہ کھلا دیتے تھے۔

فتح محمد

فتح محمد کی لائلپور میں ''شاہی مرغ پلاؤ'' کی بڑی مشہور دکان تھی۔ فٹ پاتھ پر ہی یہ دکان بنی ہوئی تھی۔ سب ہی انہیں فتح بھائی کہتے تھے اور وہ بھی لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ احمد ریاض اور میرے بڑے اچھے دوست تھے۔ ساحر لدھیانوی سے بھی ان کا یارانہ رہا۔ ان کو کوئی غیبی علم تھا کہ وہ بڑی عجیب و غریب باتیں کیا کرتے تھے۔ مارکسزم کے بارے میں جانتے تھے۔ یہ علم انہیں ساحر

اور دوسرے لوگوں کے ساتھ نشستوں سے حاصل ہوا تھا۔ وہ بھی ہمارے بڑے سرپرست قسم کے دوست تھے۔ شاید بھی ان کی غیر موجودگی میں اس کے کسی عزیز نے ہی ہم سے پیسے لیے ہوں ورنہ بھائی فتح تو ہمیں مفت پلاؤ کھلاتے تھے۔ شاعروں ادیبوں کی بہت تواضع کرتے تھے۔ شاہی کھانے پکانے میں انہیں مہارت حاصل تھی اور وہ پروگریسو خیالات کے آدمی تھے ان کی یاد کا عکس میرے ذہن میں آج تک موجود ہے۔

میر صادق

میر صادق لائلپور کے ایڈووکیٹ تھے بعد میں وہ وزیر ہو گئے تھے۔ بڑے بذلہ سنج آدمی تھے۔ کلام غالب کی شرح بھی انہوں نے لکھی تھی لیکن وہ چھپ نہ سکی' لیکن ان کی یہ بھرپور اور عظیم Attempt تھی۔ کتنا نکھرا ہوا اور خوبصورت ذوق ہوگا کہ غالب کی شرح انہوں نے لکھی۔ وہ ایک بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ عالم' قانون دان اور سخن شناس انسان تھے۔

حافظ صمد

ایک دفعہ حافظ صمد نے ایک ہوٹل میں میری بھی دعوت کی تھی۔ وہاں بڑے بڑے بولنے والے تھے لیکن حافظ صمد نے آغاز ہی میں کہہ دیا تھا کہ "آج صرف حبیب جالب بات کریں گے کیونکہ یہ دعوت ان کے ہی اعزاز ہی میں کہہ دیا تھا کہ "آج صرف حبیب جالب بات کریں گے کیونکہ یہ دعوت ان کے ہی اعزاز میں ہے۔" استاد دامن کے بعد وہ میری عزت کرتے ہیں۔ ایک دفعہ رات کو جب حافظ صمد مجھے گھر چھوڑنے کے لیے آ رہا تھا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ "علامہ اقبال کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟" میں اسکی ذہنی فضا کو جانتا تھا۔ ایک دفعہ اس کی انور چوہدری سے ان بن ہوئی تھی لیکن میں نے تو کسی خوف کے باعث علامہ کے بارے میں یہ رائے نہیں دی تھی بلکہ واقعتاً یہ میرے رائے ہے' میں نے حافظ صمد سے کہا کہ علامہ اقبال ایک قطب مینار ہیں' انہیں دیکھتے ہوئے ٹوپی گرتی ہے۔ میں اقبال کو اپنی طرز کا بہت بڑا شاعر مانتا ہوں۔ غالب اور میر کا مقام اپنی جگہ ہے لیکن شاعری کو اقبال نے ہی جدید علوم اور فسلفے سے آراستہ کیا ہے۔ حافظ صمد نے گاڑی روک کر مجھ سے سوال کیا تھا۔ میں نے جواب دے دیا تو اس نے گاڑ چلانا شروع کی۔ اگر میں اس جواب کے برعکس جواب دیتا تو کیا وہ مجھے گھر چھوڑنے کے لیے نہیں آتا؟ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ ہے۔ حافظ صمد بہت اچھے دوست ہیں اور بڑوں کا احترام ان کے دل میں موجود رہتا ہے۔

اسلم ڈوگر

انٹرنیشنل ہوٹل کے منیجر اسلم ڈوگر کے ساتھ بھی ہمارا اچھا وقت گزرا اوران کی محبتیں ہمارے شامل حال رہیں جہاں بڑے بڑے وکلاء میرا ساتھ نہ دے سکے وہاں یہ دوست کام آجاتے تھے۔ میرے زیادہ دوست تو ہائیکورٹ کے وکیل ہیں۔ ڈسٹرکٹ کورٹ کے وکلا سے ایک عرصے سے رابطہ نہیں رہا ہے۔ وکیل لوگ تھانوں میں کہاں جاتے ہیں اور پھر وہ ہائیکورٹ کے وکیل ہیں۔ اسلم ڈوگر نے دوبار میری مدد کی ہے۔ ان کے دوستوں میں رانا شمیم احمد خان ایم پی اے ہیں جو بہت ہی مخلص آدمی ہیں اور سخن فہم بھی ہیں۔ میرے بھی وہ غائبانہ دوست تھے۔ حاضرانہ ملاقات ان سے اسلم ڈوگر کے توسط سے ہوئی تھی۔ ایک دفعہ بچوں کی لڑائی پر تھانے والے میرے بچوں کو تھانے لے گئے۔ میں نے اسلم ڈوگر کو فون کیا۔ ان کے اور رانا شمیم احمد خان کے مشترکہ دوست ایس پی کینٹ تھے۔ ان دونوں دوستوں نے ایس پی سے کہا اور اس نے تھانے ٹیلیفون کیا تو میرے بچوں کو چھوڑ دیا گیا۔ تھانیدار نے ایس پی کا ٹیلیفون آنے کے بعد کہا کہ پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم حبیب جالب کے بیٹے ہو۔ میرے بیٹے نے جواب دیا۔ ''میں تو بتا تا رہا لیکن آپ نے میری بات کب سنی ہے۔'' جس کا اثر ورسوخ ہوتا ہے وہ جب چاہے کسی کو تھانے پہنچا سکتا ہے اور یہ کھیل ہے پیسے کا۔ ہمارا اثر تو دلوں پر ہی تھا۔ اس لیے کچھ لوگ عزت بھی کرتے ہیں اور ہمارا خیال رکھتے ہیں۔

ایک دفعہ پھر ہم پر ایک ایسا کیس بنا دیا گیا کہ کسی مغویہ نے رکشے میں جاتے ہوئے ہمارا ٹیلیفون نمبر پھینک دیا تھا۔ وہ پولیس کے ہاتھ لگ گیا۔ پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لیے آ گئی۔ پولیس والوں کا یہ عام رویہ ہے کہ وہ فوراً ہی پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے۔ بد لحاظ ہو جاتی ہے اور بد کلام بھی ہو جاتی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں دوا لے لوں بیمار ہوں۔ لیکن انہوں نے مجھے اس کی اجازت نہ دی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ دوا کے بہانے میں کسی کو کچہری میں فون کرتا ہوں۔ جب پولیس والے مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے تو میرا بڑا لڑکا آ گیا۔ اس نے پوچھا' کیوں لے جا رہے ہو؟ تو انہوں نے کہا' تم کون ہو؟ اس نے کہا۔ ''میں ان کا بیٹا ہوں۔'' پولیس نے مجھے اتار دیا اور میرے بیٹے کو گاڑی میں بٹھا لیا اور اس کو تھانے لے گئے۔ میں دو گھنٹے تک بیٹے کی واپسی کا انتظار کرتا رہا وہ جب نہ آیا تو میں خود تھانے چلا گیا اور بمشکل تمام تفتیشی افسر سے مجھے بات کرنے کا موقع ملا۔ میں نے پوچھا' جناب معاملہ کیا ہے؟ ہمیں بتائیں تو سہی۔ اس نے کہا ''تمہارا نام؟'' میں نے کہا' میرا نام حبیب جالب ہے۔ وہ بولا ''حبیب جالب بھی کئی ہیں' آپ کون سے حبیب جالب ہیں؟'' میں نے کہا۔ آپ مجھے عام آدمی ہی سمجھیں اور ہم تو آپ سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ آپ نے ہمیں یہ عزت کیوں بخشی ہے؟ میرے بیٹے نے پوچھ لیا کہ ''آپ نے پرچہ درج کیا ہے یا ایسے ہی بٹھا رکھا ہے؟'' وہ تھانیدار پھنکارا۔ ''اوئے

لڑکے اگر تم ان کے ساتھ نہ آئے ہوتے تو ہم تمہارا پاجامہ اتار دیتے۔'' میں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تم چپ رہو میں افسر سے بات کر رہا ہوں تمہیں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھانیدار نے مجھ سے کہا کہ ''آپ جائیں ہم تفتیش کے بعد لڑکے کو بھی بھیج دیں گے۔'' اس وقت کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ رات بھر رکھتے اور اسے مارتے پیٹتے۔ میں نے سوچا کہ اپنا انتظام خود ہی کروں۔ قانونی قواعد وضوابط کے تحت کوئی فوری بندوبست کروں۔ میں نے اپنے ایک وکیل دوست کو فون کیا تو اس نے کہا کہ ''میں تو اس کیس کے لیے صبح ہائیکورٹ میں ہی پیش ہو سکتا ہوں۔ تھانے کا آدمی نہیں ہوں۔'' انہوں نے بھی ٹھیک ہی کہا۔ تھانے سے ان کا رابطہ نہیں ہوتا ہے۔

اب میں گھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میری بیوی نے کہا کہ ''اسلم ڈوگر کو فون کرو۔'' رات کے بارہ بج گئے تھے۔ میں نے کہا کہ اس وقت سو گئے ہوں گے اور ان کے ماتحت ان کو جگانے کی جرات نہیں کریں گے۔ اس وقت تم اللہ کا نام لے کر سو جاؤ۔ کہنے لگی۔ ''تم ٹیلیفون تو کرو۔'' میں نے ٹیلیفون کیا تو ریسپشنسٹ بولا کہ ''وہ تو سو رہے ہیں۔'' میں نے کہا کہ بھئی ان سے کہو کہ حبیب جالب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے میری بات مان لی اور ڈوگر صاحب سے ملوا دیا۔ انہوں نے پوچھا کہ ''کیا بات ہے؟'' میں نے ان سے کہا کہ میرے لڑکے کو پولیس والے لے گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ اسے آرام تو نہیں پہنچائیں گے۔ اس نے کہا کہ ''میں وہاں ایس ایچ او لگا ہوں۔'' میں نے کہا کہ آپ مذاق کر رہے ہیں؟ کہنے لگے ''نہیں' گوشی سے بات کرو۔ وہ وہاں کوئی ایس ایچ او لگا ہوا ہے۔'' گوشی کو فون کیا تو اس نے کہا کہ ''انکل میں وہاں ایس ایچ او لگا ہوا ہوں آپ رانا شمیم احمد خان سے بات کریں۔'' میں نے انہیں فون کیا اور کہا۔ رانا صاحب! میرے دوست میرے ساتھ بہت ہی محبت کا مظاہرہ کر رہے ہیں یہ شاید معاملے کی سنگینی کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ میرا بیٹا اگر رات تھانے میں رہے گا تو پولیس والے اس کی حالت خراب کر دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ''میں ابھی ٹیلیفون کرتا ہوں اور اسے تھانے سے گھر پہنچاتا ہوں' آپ فکر نہ کریں۔'' رانا شمیم احمد خان نے تھانے ٹیلیفون کیا اور پھر مجھے بتایا کہ ''آپ کا لڑکا تھانے سے چل پڑا ہے ابھی گھر پہنچ جائے گا۔'' اس دور میں اس طرح کے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں جو مشکل وقت میں کام آئیں۔ ان کی ضمانت بہت بڑی ضمانت تھی۔ دوسرے دن تھانے کے انچارج آئے اور نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ یہ نواز شریف دور کا واقعہ ہے۔ اسلم ڈوگر نے جو یہ کہا تھا کہ ''میں ایس ایچ او لگا ہوں۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنا ہی بندہ ایس ایچ او لگا ہوا ہے۔

رانا شمیم احمد خان نے مجھے متاثر کیا۔ پہلے وہ پی پی میں تھے۔ ان کو پی پی نے ٹکٹ نہیں دیا تھا حالانکہ انہوں نے بتایا تھا کہ

''میرا اثر زیادہ ہے' میں جیت جاؤں گا اور آپ کا Candidate نہیں جیت سکتا۔'' پھر بھی ان کو ٹکٹ نہیں دیا۔ پیپلز پارٹی والوں سے تو ایسی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر غلام حسین کو بھی ٹکٹ نہ دے کر نقصان اٹھایا تھا۔ رانا شمیم احمد خان بطور آزاد امیدوار جیتے تھے۔ اسلم ڈوگر کوئی سیاسی شخصیت تو نہیں ہیں بس یاروں کے یار ہیں۔ مرنجان مرنج آدمی ہیں۔ ان پر کوئی سیاسی ذمہ داری تو نہیں ڈالی جا سکتی اور نہ وہ اس کے لیے زور دیتے ہیں کہ میں سیاسی شخصیت ہوں۔ دنیا میں لوگ اپنی Limitations کے اندر رہ کر اچھے ہوتے ہیں۔

طارق محمود

میاں عبدالخالق کے صاحبزادے طارق محمود بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے Anti Imperialist ہو گئے ہیں۔ روشن خیال اور جمہوریت پسند شخص ہیں۔ پیپلز پارٹی کے سینئر نائب صدر شیخ رشید کے حلقہ بگوش ہیں۔ انہیں بھی اپنے والد کی طرح سیاسی ورکرز کے ساتھ تعلق رکھنے کا ذوق وشوق ہے۔ ظاہر ہے ان کی یہ خواہش بھی ہوگی کہ انہیں اسمبلی میں بھیجا جائے تو وہ ایک پڑھے لکھے آدمی کی حیثیت سے بہت اچھا رول ادا کر سکتے ہیں۔ ان کو سچ بولنے کا ''مرض'' ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی قربت سے پارٹیاں مضبوط ہوتی ہیں۔

چوہدری محمود شیخ

چوہدری محمود شیخ زید ہسپتال کے چیئرمین تھے ان سے بھی میرا تعارف اسلم ڈوگر کے ذریعے ہی ہوا تھا۔ بہت ذمہ دار ڈاکٹر بہت اعلیٰ درجے کے سرجن اور شریف النفس انسان ہیں۔ وہ ہمارے ضلع ہوشیار پور کے ہیں۔ اس لیے مجھے ان کا لہجہ بھی بہت پیارا لگتا ہے۔ ہوشیار پور کا لہجہ تو درختوں کی چھاؤں کی طرح ہے۔ وہاں جو آموں کے اور شیشم کے درخت تھے ان کی چھاؤں میں ہم نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے ہمارے دلوں کو چھو کر گزرتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں وہ درخت ہمارا بڑا سہارا تھے۔ چوہدری محمود کو دیکھ کر مجھے اپنے ضلع کے درخت 'سبزہ زار اور ''ٹھنڈیاں چھاواں'' یاد آتی ہیں۔ وہ میرے ساتھ بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ جب تک زید ہسپتال میں رہے انہوں نے مجھ سے بل نہیں لیا اور وہ کہا کرتے تھے کہ ''جب تم جانا چاہو اپنا بستر اٹھاؤ اور چلے جاؤ' باقی ہم دیکھ لیں گے۔'' ان کے بعد پھیپھڑوں کے معالج ڈاکٹر اقبال آئے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ دل پر بھی شاعر کہتے ہیں پھیپھڑوں پر کسی شاعر نے شعر نہیں کہا ہے تو میں نے انہیں پھیپھڑوں کے حوالے سے ایک قطعہ لکھ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر اقبال کی خوبی یہ ہے

کہ انہیں حافظ وخیام حفظ ہیں۔ فارسی کے نئے شعراء بھی انہیں یاد ہیں۔ وہ جب بھی مجھے دیکھنے کے لیے آتے تھے تو مجھے خیام کی کوئی نہ کوئی رباعی سناتے تھے۔ کبھی حافظ کا کلام سناتے تھے اور کبھی ایران کے کسی نئے شاعر کا کلام سناتے۔ انہیں دیکھ کر میں خوش ہو جاتا ہوں۔ ایک آدھ بار تو میں بے ہوشی کے عالم میں شیخ زید ہسپتال گیا تو انہوں نے مجھے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رکھا اور میری بڑی دیکھ بھال کی تھی۔ اب زید ہسپتال میں ڈاکٹر اقبال اور چوہدری محمود نہیں ہوتے۔ اب میں وہاں لیٹ نہیں سکتا۔ ہزار ڈیڑھ ہزار روپے روزانہ کا خرچ ہے جو کہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے تو ہم ٹیلیفون پر ہی پوچھ لیتے ہیں یا ان کے کلینک چلے جاتے ہیں۔

خورشید محمود قصوری

میاں محمود علی قصوری کے صاحبزادے میاں خورشید محمود قصوری جو کہ پی ڈی اے کے جنرل سیکرٹری بھی ہیں۔ عملی سیاست میں سرگرم عمل ہیں۔ بڑے باہوش آدمی ہیں۔ نئے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ میاں صاحب کے دونوں صاحبزادگان خورشید محمود قصوری اور عمر قصوری ہمیں پیار کرتے ہیں اور ہمارا خیال کرتے ہیں اور میاں صاحب کا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ باپ کی طرح ہونا بڑا مشکل ہوتا ہے مگر میاں صاحب کے یہ دونوں صاحبزادے اچھے کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ میاں محمود علی قصوری جیسے لوگ تو شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا'' والی بات ہے۔ ان کے نام میں اتنی طاقت ہے اور ان کا اتنا بڑا Contribution ہے کہ ان کا نام کبھی نہیں مٹے گا۔ میاں صاحب کے صحیح معنوں میں جانشین ان کے صاحبزادگان ہیں۔

جسٹس جاوید اقبال

علامہ اقبال کو مصور پاکستان کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ وہ پاکستان کے مصور ہیں۔ پاکستان کے وہ مفکر تھے، محقق بھی تھے اور انہوں نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر پاکستان ہے۔ ان کا خواب یہ تھا کہ ایک روشن خیال اور خود مختار پاکستان بنے کیونکہ ملائیت کے خلاف ان کے اشعار میں جگہ جگہ جہاد ملتا ہے۔ ان کے نزدیک ملائیت کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی ترقی سے بے بہرہ لوگ، جو مذہب کے حوالے سے انسانی ترقی کو نہیں مانتے ہیں۔ علامہ اقبال کے بقول ان لوگوں کی نظر قرآن حکیم پر بھی نہیں ہے کہ جہاں وہ بھی تجدید اور تحقیق کی تلقین کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے نقطہ نظر کے مطابق یہ اس تحقیق کو سمجھ نہیں سکتے ہیں وہ انہی لوگوں کو ''کٹھ ملا'' کہتے ہیں۔ اکثریت بھی ایسے ہی لوگوں کی ہے۔ علامہ اقبال کا ہمیشہ ان سے اختلاف رہا ہے اور محاذ آرائی ہوئی ہے۔ انہوں نے ''شکوہ'' لکھا اور پھر ''جواب

شکوہ'' بھی لکھا تھا۔ ان ہی لوگوں نے ان پر اعتراضات کئے جن کی اکثریت تخلیق پاکستان کے وقت اس کے حق میں نہیں تھی۔ کچھ عالم تھے ان کے پاس دلائل بھی تھے لیکن کچھ بغیر دلائل کے ناخوش و بیزار تھے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اب پاکستان کے ''خالق'' بنے پھرتے ہیں۔ جاوید اقبال کی تقاریر میں علامہ اقبال کے خیالات کی ہی شکل ملتی ہے۔ وہ پاکستان کی ایک ماڈرن شکل فتی ہے جس میں انصاف اور خود کفالت کا ذکر زیادہ ہے اور جہاں بنوک شمشیر انصاف نہ لکھا جائے۔

میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

زہر ہلاہل کو علامہ اقبال نے کبھی قند نہیں کہا۔ جاوید اقبال کے بیانات اور تقریروں میں بھی ان کے والد محترم کے خیالات کی چمک آ رہی ہے۔ یہاں تو انصاف بندوقوں کے سائے تلے دم توڑ رہا ہے اور نظریہ ضرورت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ نظریہ ضرورت' حکومت کے تحت اور تابع ہے۔ جاوید اقبال نے دیکھا کہ میرے والد کے خیالات کی نفی ہو رہی ہے اور ان کا نظریہ یہاں ذبح ہو رہا ہے تو وہ چیخ پڑے۔ اس طرح انہوں نے یہاں ایسے نظام عدل کی دھجیاں بکھیر دیں۔ بڑے بڑے تقدس ماب چہرے گنہگار لگنے لگے۔ ان کے جرائم جو انہوں نے یہاں انصاف کے نام پر کئے تھے وہ سامنے آ گئے۔ انہیں بے نقاب کرنے کی جسارت علامہ اقبال کے فرزند نے ہی کی ہے اور مجھے یہ خوشی ہوئی ہے کہ جاوید اقبال اپنے ان خیالات کا برملا اظہار کر رہے ہیں۔ چلیں ''دیر آید درست آید'' ہی سہی۔

طارق وحید بٹ

طارق وحید بٹ کو بھٹو دور سے ہی جانتے ہیں کیونکہ وہ ان دنوں پیپلز پارٹی کے ''جیالے'' ہوا کرتے تھے اور ہم NAP میں تھے۔ یوں سمجھئے ہم ان کے ''زیر عتاب'' تھے۔ یوں بھی ہماری ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی تھی۔ طارق وحید بٹ کا نام سنتے رہے تھے۔ وہ ایک پہلوان کی صورت ہمارے ذہن میں اترے تھے۔ پیپلز پارٹی کی گورنمنٹ ختم ہو گئی تھی۔ طارق وحید بٹ کا بھی پیپلز پارٹی سے تعلق نہ رہا اور ان کی ہمارے ساتھ ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ ایک دن وہ اپنی کتاب ''میری آواز'' لے کر آئے تھے۔ اس میں انہوں نے کسی کو نہیں بخشا ہے۔ اپنے انداز میں انہوں نے بہت بہتر لکھا ہے۔ ہم نے حکومت کے کسی فرد کی کبھی تعریف نہیں کی اور نہ ہی اس کے خود کو بریکٹ کیا ہے۔

طارق وحید بٹ لائلپور کے منیر ڈار کے رشتے دار بھی ہیں جو ہمارے بھی دوست ہیں۔ ہم لندن میں ان کے ہاں بھی گئے تھے۔ منیر ڈار کی وجہ سے بھی طارق وحید بٹ سے تھوڑا سا تعلق پیدا ہوا تھا۔ ہمارے جو لیڈر ہیں یہ ہماری کب پروا کرتے ہیں جہاں جی

چاہے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں پوچھتے بھی نہیں اراتے آزاد ہیں کہ کسی نہ کسی کی غلامی میں ہی لگے رہتے ہیں۔ ہم نے طارق وحید بٹ کو دیکھا' ان سے ملے تو انہیں بہت سارے لیڈروں سے بہتر پایا۔ ان سے ہماری دوستی ہوگئی۔ وہ اپنی محنت اور لگن سے اس مقام تک پہنچے ہیں۔

طارق وحید بٹ ایک معصوم آدمی ہے۔ وہ سیاست میں سرگرم عمل رہنا ہی اپنے لیے بہتر محسوس کرتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے ان کو سیاسی آدمی نہیں بنایا۔ اب بھٹو صاحب میں یہ خوبی تھی یا خامی بلکہ میں تو اسے خامی کہوں گا کہ وہ طارق وحید بٹ کو ایک پہلوان کو اسی مقام پر رکھنا چاہتے تھے جہاں کہ وہ تھا۔ اب بھٹو صاحب کا طرز تخاطب اس طرح تھا کہ "تم اتنا جسم لیے پھرتے ہو' فلاں آدمی کو ابھی تک فکس اپ نہیں کیا۔" وہ چاہتے تھے کہ کوئی بھی ورکر یا ساتھی ان سے ذرا دیر بعد آزاد ہو۔ وہ ایک ہی کام پر اسے لگائے رکھتے تھے۔ وہ ٹھیک ہونا چاہ رہا ہے۔ سیاسی ورکر بننا چاہ رہا ہے۔ ایجوکیشن حاصل کرنا چاہ رہا ہے لیکن بھٹو صاحب سیاسی تعلیم نہیں دے سکے۔ کسی بھی سیاسی لیڈر کا یہ بڑا کارنامہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ورکرز کو سیاسی تعلیم سے بہرہ ور کردے۔ باچا خان نے اپنے لوگوں کو عدم تشدد کی تعلیم دی اور وہ اس پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔ ولی خان کو لوگ کہتے تھے کہ "تم نے قیوم خان کو کیا ہوا بنا رکھا ہے۔ ہمیں کہو ہم ابھی جا کر اسے گولی مار آتے ہیں۔" ولی خان کہتے کہ "نہیں ہم اسے سیاسی طور پر ماریں گے۔ ہم تشدد کے پرچارک نہیں ہیں۔ ہم ایسا نہیں کریں گے۔" طارق وحید بٹ کی کتاب کا ماحصل یہ ہے کہ اس نے اپنے لیڈر کو بہت پیار دیا ہے اور ان سے کیا حاصل کیا؟ یہی کوشش رہی کہ بھٹو صاحب اسے سیاسی آدمی بناتے۔

طارق وحید بٹ اپنی بساط کے مطابق سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں وہ غلام مصطفیٰ جتوئی کے ساتھ ہیں۔ جتوئی صاحب میں بہت ساری خوبیاں ہیں۔ بہت مہذب آدمی ہیں۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اور بھٹو صاحب میں یہ فرق ہے کہ جتوئی صاحب کسی کی بے عزتی نہیں کرتے نہ ہی صیغہ واحد میں گفتگو کرتے ہیں۔ حالانکہ میں نے ایک بار طارق وحید بٹ کے مطالبے پر غلام مصطفیٰ جتوئی کو ڈانٹ دیا تھا اور وہ ہنس کے رہ گئے تھے۔

نور خان

نور خان ایک اچھے منتظم ہیں' وہ گورنر بھی رہے ہیں۔ انہوں نے ہاکی ٹیم کی بہتر بنیادوں پر تشکیل کی تھی اور بڑے اچھے کھلاڑی متعارف کرائے تھے۔ نور خان نیک دل سا آدمی ہے۔ ہمارا وہ دوست ہے' ایک اکیلا آدمی سارے نظام کو درست تو نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر وہ اپنی دھن میں لگا رہے تو یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ اب ہر آدمی ہماری طرح نہیں سوچ سکتا' ہم نے جب بھی سوچا اسی

سیاست کے بارے میں سوچا جس سے ہم اقتدار میں نہیں آ سکتے تھے کیونکہ ہم ہندوستان سے لڑائی جھگڑے کی بات کرتے ہیں نہ شوکت اسلام منانا چاہتے ہیں اور نہ ہم ''نماز شکرانہ'' ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم تو ہر ملک کے استحکام اور قیام کی بات کرتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی سرحدوں میں اپنے اپنے طریقے سے رہے اور امن سے رہے۔ لڑائی جھگڑے پوری انسانیت کے خلاف ہیں' امن پوری انسانیت کے حق میں ہے' نور خان بھی ہماری سوچ اور ہمارے خیالات سے متفق تھے اس لیے ہمارے ذہن میں رہ گئے۔

◆◆◆

کئی مہتاب کئی آفتاب

احمد ریاض

لائلپور (فیصل آباد) میں بہت اچھے اچھے لوگ رہتے تھے۔ خلیق قریشی مدیر ''عوام'' ایک اچھا انسان تھا اور اسے خلیق کے نام سے مطابقت تھی۔ وہ عملاً بھی خلیق ہی تھا۔ میرا ان کے ہاں بھی آنا جانا تھا۔ وہ میرا دوست تھا اور میری سرپرستی کیا کرتا تھا۔ ان کے اہل خانہ بھی جانتے تھے۔ وہ میرے دکھ سکھ کا ساتھی تھا۔ اپنے شہر میں بھی وہ بہت مقبول شخصیت تھا۔ خود کو مذاق کروا کے بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ اس کی ہنس مکھ طبیعت تھی۔ اس کو دو کاندار ٹائپ دوست بھی مذاق کرلیا کرتے تھے اور وہ ہنستا رہتا تھا۔ مشاعروں میں اکثر اس کا مکالمہ لوگوں کے ساتھ ہوا کرتا اور ایک ہوٹنگ کی شکل بن جاتی تھی اور وہ خوش ہو جاتا تھا۔ خلیق قریشی کی شخصیت کا یہ لازمہ بن چکا تھا کہ ہنسی مذاق ہوٹنگ اور مشاعرے میں سوال و جواب میں مبتلا کرنا۔ وہ پرانا مسلم لیگی تھا۔ اس کا ''غریب'' اخبار تھا۔ حسب عادت وہ اپنے دروازے پر شام کو حقہ لے کر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے حلقہ بگوش بیٹھے ہوتے' وہیں احمد ریاض بھی کام کرتے تھے۔ وہ بڑے اچھے شاعر تھے۔ لدھیانہ کے رہنے والے تھے اور ساحر لدھیانوی کے دوستوں میں سے تھے۔ میں احمد ریاض کو اشارے سے بلا لیا کرتا تھا اور اسے گرینڈ ہوٹل میں چائے پلایا کرتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ''جالب کے پاس جب پیسے ہوتے ہیں تو وہ مجھے گرینڈ ہوٹل میں چائے پلواتا ہے اور تم سب لوگ مال چھپائے پھرتے ہو۔'' احمد ریاض کے نام میں نے اپنی پہلی کتاب ''برگ آوارہ'' معنون کی تھی۔ وہ ان دنوں بیمار تھا۔ جس طرح میں آج پھیپھڑوں کے عارضہ میں مبتلا ہوں وہ بھی بیمار تھا اور افلاس بھی ایک بیماری ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھوں وہ تنگ تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور ''غریب'' اخبار میں کام کرتا تھا۔ وہ خود بیچارہ غریب تھا۔ اخبار بھی غریب ہی تھا' اسے کیا تنخواہ دیتا۔ اس کا گزارہ بمشکل تمام ہوتا تھا۔

جوش ملیح آبادی

ایک دفعہ جوش صاحب کے والد نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ ''ریاست لوٹ'' شاعر ہے۔ ہندوستان کی ریاستیں ختم ہو

گئیں تو جوش صاحب پاکستان چلے آئے۔ وہ اے بی نقوی کے بلوانے پر یہاں آئے تھے۔ سکندر مرزا صدر تھے' جوش کو ان سے ملوایا گیا اور کہا گیا کہ "یہ بہت بڑے شاعر ہیں۔" سکندر مرزا نے پوچھا۔ "کیا یہ غالب ہیں؟" ان سے کہا گیا کہ "یہ جوش ملیح آبادی ہیں۔" اس وقت جوش کے کئی دیوان چھپ چکے تھے۔ یہاں آ کر ان کا بہت برا حشر ہوا۔ اس ضمن میں مولانا کوثر نیازی کو داد دی جا سکتی ہے کہ انہوں نے جوش صاحب کی سرپرستی کی تھی۔ وہ ان کے دکھ درد میں شریک رہے اور انہوں نے جوش کی بہت پذیرائی کی تھی۔ یہ کوثر نیازی کا تاریخی عمل ہے۔ جب تاریخ لکھی جائے گی تو اس حوالے سے بھی کوثر نیازی کا نام زندہ رہے گا ان کے اس عمل کی وجہ سے بھی ان کی عزت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ کوثر نیازی "مولانا" بھی ہیں لیکن جوش صاحب کے لیے انہوں نے جو کچھ بھی کیا اس کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں ان کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ جوش ملیح آبادی کو ملحد کہا جاتا تھا۔ حالانکہ ان کا ایک شعر ہے کہ

ہم اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی تھی

ان کے بہت سارے مرثیے بھی مشہور ہوئے ہیں۔ جوش ملیح آبادی ایک روشن خیال اور سیکولر ذہن کے آدمی تھے۔ وہ پاکستان آ گئے تھے لیکن یہاں تو کسی کو آزادی نہیں ملتی ہے' بس وہ اشاروں کنایوں میں ہی کہتے تھے کہ "میں شراب پیتا ہوں۔"

دادا امیر حیدر

دادا امیر حیدر جو بہت بڑے کمیونسٹ لیڈر تھے' انہوں نے کچھ دن امریکہ میں بھی کام کیا تھا۔ دلی اور بمبئی میں بھی رہے۔ بمبئی میں تو ایک جگہ "امیر حیدر ہال" ان کے نام سے موسوم ہے وہ میرے بڑے سرپرست تھے۔ مجھے بہت پیار کرتے تھے انہوں نے اپنی زمین ایک سکول کے لیے وقف کر دی تھی اور خود تمام زندگی اپنے نظریات کے ساتھ گزاری تھی۔ انہوں نے کبھی کوئی وظیفہ گورنمنٹ سے نہیں لیا۔ فیض صاحب اور ایوب مرزا نے ان کو وظیفہ دلانے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

مولانا غلام یٰسین

مولوی غلام یٰسین ہمارا دوست تھا اور امام مسجد بھی تھا۔ ایک مسجد میں اس نے چارپائی بچھا دی اور ہمیں کہا کہ "یہاں لیٹ جاؤ' آرام کرو۔" میں نے کہا کہ ایک دفعہ مجھے مسجد سے نکال دیا تھا۔ کہنے لگا۔ "میں خود مسجد کا امام ہوں کون تمہیں نکال سکتا ہے۔" مولوی

غلام یٰسین بڑی دلچسپ چیز تھی۔ وہ پنجابی کے بڑے شاعر تھے اور پرانے احراری تھے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کے جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ وہ "مولوی" تھا مگر آخری دم تک ترقی پسندوں کے ہی ساتھ رہا۔ وہ ایک "پروگریسو مولوی" تھا۔ اس کی پنجابی کی نظم کے سامنے ہماری اردو کی نظم نہیں چلتی تھی۔ اس کی ایک نظم تھی "ربا کو جھیا کر" بڑی مشہور نظم تھی۔ ہم نے ایسا باعلم امام مسجد اور ترقی پسند مولوی نہیں دیکھا۔

استاد دامن

فیض صاحب نے ایک دفعہ کہا تھا کہ میں نے بھی اردو میں ایسا موثر شعر نہیں کہا اور نہ کہہ سکتا ہوں جتنا موثر شعر استاد دامن پنجابی میں آسانی سے کہہ جاتا ہے۔ پنجابی زبان کا اپنا ایک طنطنہ ہے، اپنی تاثیر ہے، اپنا Colour ہے جو لوگ اس زبان کو جانتے اور سمجھتے ہیں ان پر پنجابی شعر کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ استاد دامن اچھے شاعر تو تھے ہی اور سامع بھی بہت اچھے تھے۔ میں جب پندرہ بیس منٹ تک ان کے سامنے بولتا رہتا تھا تو وہ چپ چاپ سنتے رہتے تھے۔ پھر میں ان سے کہتا کہ استاد آپ اکتا نہیں گئے ہیں تو وہ کہتے کہ "میں سن رہا ہوں تمہاری باتیں، تم ٹھیک بات کہہ رہے ہو۔" حالانکہ ایک شاعر دوسرے شاعر سے حسد کرتا ہے لیکن ان میں ایسا مادہ نہیں تھا۔ وہ یاروں کے یار اور بہت مہمان نواز تھے۔ استاد دامن نے علاؤ الدین کو اپنا بیٹا بنا رکھا تھا۔ بہت سارے لوگوں کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات تھے، سبھی کا یہ دعویٰ تھا کہ استاد دامن ہمارے زیادہ قریب ہیں۔ یہ ان کی شخصیت کا اعجاز تھا۔ فیض صاحب نے جب وفات پائی تو استاد دامن اور میں ان کے جنازے میں شریک تھا۔ استاد دامن کی موت پر بھی میں گیا تھا اور ان پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔

اک کٹیا وچ پیا رہیا اک شاہ سخن
دنیا جیہوں کہندی سی دامن دامن
ہوراں وانگوں اوہ درباری بنیا نہیں
بھل کے وی شاعر سرکاری بنیا نہیں
لوکاں اتے وار گیا اپنا جیون
.... اک شاہ سخن
اوہدے شعر ستم گاراں نوں کھلدے رہے

طوفاناں وچ دیوے اوہدے بلدے رہے
کردا روے گا اوہدے اتے ناز وطن
.... اک شاہ سخن

ساڈے دیس نوں چوراں تے ڈاکوآں توں نہیں ملی نجات استاد دامن
اجے دھون ہوئی ہور امریکہ دی بدلے نہیں حالات استاد دامن
چھین کھون نہیں دینا لٹیریاں توں' خون چین نہیں دینا وڈیریاں توں
تیرے ذہن دی سوں تیری سوچ دی سوں رہنی ظلم نوں مات استاد دامن

استاد دامن کا اپنا ایک منفرد اسٹائل تھا۔ وہ جلسہ لوٹ لیا کرتے تھے۔ لوگوں کی تقاریر سے زیادہ موثر ان کی نظم ہوتی تھی۔ ان کی چھوٹی سی کوٹھری میں بڑے بڑے لوگ بیٹھا کرتے تھے اور باہر کاریں کھڑی رہتی تھیں۔ حافظ صمد بھی ان کا خاص مرید ہے ان کا بڑا ماننے والا ہے اور انہوں نے حافظ کی تربیت کی تھی اس کے اندر جو غم وغصے کی فضا تھی اس کو کلچرڈ کرنے میں استاد دامن کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے کہ کوئی آدمی کسی شاعر سے محبت کرے اور اس کی پذیرائی کرے اس کا خیال رکھے' اس کی تواضع کرے۔ اس کے ناز اٹھائے۔ حافظ صمد استاد دامن کے بہت قریبی اور ناز اٹھانے والے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔

عمران خان

اکرام اللہ خان نیازی سے ہماری ملاقات چائنیز لنچ ہوم میں ہوا کرتی تھی۔ ان کا آفس بینک اسکوائر لاہور میں تھا۔ چائنیز لنچ ہوم میں وہ دوپہر کا کھانا کھانے آیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی شام کو بھی ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اکرام اللہ خان نیازی بڑے باذوق اور مرنجان مرنج آدمی اور ہمارے ہم مشرب ہیں۔ خدا ان کو صحت عطا کرے۔ وہ بھی بیمار تھے اور زیدہ ہسپتال میں میرے ساتھ والے کمرے میں تھے۔ ان سے ملاقات کی اجازت کسی کو نہیں تھی۔ میں نے ایک دعائیہ شعر ان کو لکھ کے بھیجا تھا۔ اکرام اللہ خان نیازی نے میری ملاقات اپنے صاحبزادے عمران خان سے اپنے گھر پر ہی کرائی تھی۔ ان دنوں اس میں "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" والی بات تھی۔ بس دو تین منٹ عمران خان سے بات چیت ہوئی تھی۔ وہ گلوں کو پھلانگتا دوڑتا ہوا چلا گیا۔ اکرام اللہ خان نیازی نے مجھے بتایا کہ "اب یہ دس میل دوڑے گا۔" اس مقام تک پہنچنے کے لیے جہاں آج عمران خان پہنچا ہوا ہے' بڑی محنت اور ریاضت کی

ضرورت ہوتی ہے جو اس نے کی اور اسے اس کی محنت و ریاضت کا صلہ بھی ملا ہے۔ کوئی بھی آدمی کسی بھی کام کو اگر تندہی دل سوزی اور دل جمعی سے کرے تو کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ عمران خان نے خلیج کی جنگ کے حوالے سے کی گئی شاعری میں بیان کئے تھے۔ اسی وجہ سے ان دنوں مال روڈ پر نکلنے والے ایک جلوس کے نعرے لگا دیے کہ ''وزیر اعظم عمران خان زندہ باد' حبیب جالب زندہ باد'' یہ روزنامہ ''جنگ'' لاہور میں بھی چھپا تھا۔ عمران خان اپنی والدہ کے نام سے کینسر کے علاج کے لیے شوکت خانم میموریل ہسپتال بنا رہے ہیں' (بنا چکے ہیں) یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ کسی انٹرنیشنل ٹیم کے مسلمان میں یہ خیال پیدا ہوا ہے اور یہ جذبہ بہت ہی قابل تحسین ہے۔ میں نے ان کے بارے میں ایک نظم بھی لکھی جو ''جنگ'' لاہور میں ہی چھپی تھی۔

یہ کار نیک ہے عمران ہسپتال بنا
نہ حاسدوں کا برا مان ہسپتال بنا
معاملات نہ رکھ صرف اہل ایماں سے
تو کافروں سے بھی وان ہسپتال بنا
مثال مہر درخشاں ہے گنگا رام کا نام
نہ ہندو بن نہ مسلمان ہسپتال بنا
تو والدہ کی دعاؤں سے سعی پیہم سے
بنا ہے دیس کی پہچان ہسپتال بنا
ترے خیال کی پاکیزگی پہ اہل جہاں
ہزار جاں سے ہیں قربان ہسپتال بنا
جو چل پڑے کوئی ہمت سے جانب منزل
ہے کوہ کاہ مری جان ہسپتال بنا
دلوں پہ تیری حکومت رہے گی تا بہ ابد
تو بن گیا ہے وہ انسان ہسپتال بنا

شاعروں' ادیبوں' موسیقاروں اور کھلاڑیوں کو اس کام میں عمران خان کا ہاتھ بٹانا چاہیے اور یہ روایت قائم ہونی چاہیے کہ دکھی

انسانیت کے لیے سوچنا ایک قابل تحسین جذبہ ہے اس جذبے کو پروان چڑھنا چاہیے۔ اپنی سہولتوں کے لیے اور بہت سے غلط کاموں اور عیش وعشرت پر لوگ خرچ کرتے ہیں۔ کم ازکم ان سے پس انداز کر کے ان کاموں میں بھی حصہ لینا چاہیے۔ یہ عمران خان کا بہت بڑا قدم ہے۔ اس کے ذہن میں جو بات آئی ہے اس سے پہلے بڑے بڑے لوگوں کے ذہن میں یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ بڑے بڑے صنعت کار سرمایہ دار اور جاگیردار بھی وہ بات نہ سوچ سکے جو نوجوان عمران خان نے سوچ لی اور اس کے لیے دن رات ایک کر دیئے۔ مجھے امید ہے کہ اس کا یہ خواب ضرور شرمندۂ تعبیر ہوگا۔

بھٹو محمد حنیف

بھٹو محمد حنیف بڑے Devoted آدمی تھے ان کے اندر امن اور محبت کا جذبہ تھا۔ وہ خوشحال معاشرے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ یہ سسٹم جس میں انسان کا استحصال مٹھی بھر طبقے کے ہاتھوں سے ہوتا ہے اس سسٹم کے خلاف ان کے دل میں ایک آگ تھی۔ بھٹو محمد حنیف اکثر فکری محاذوں میں ادبی نشستوں اور انقلابی اجتماعات میں جہاں سامراج دشمن خیالات وجذبات کا اظہار ہوتا تھا شریک ہوتے تھے۔ بھٹو محمد حنیف جیسے لوگوں سے ہی محبت اور جذبہ محبت قائم ہے اور سچ کی پہچان باقی ہے۔ ان کی موت کیسے اور کن حالات میں ہوئی اب تک یہ ایک معمہ بنا ہوا ہے لیکن ان کے جلدی بچھڑنے کا بہت ہی دکھ ہوا تھا۔ اس معاشرے میں زندگی کیا ہے؟ ایک بہتان ہے۔ خوف وہراس میں زندگی گزارنے کو زندگی نہیں کہتے ہیں۔ بھٹو محمد حنیف اس حسرت میں مر گیا کہ یہاں آزاد اور خوشحال معاشرہ پیدا ہو۔ پاکستان امریکی سامراج کا دست نگر نہ رہے۔ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

قمر یورش

قمر یورش مزدور ادیب انتھک انسان امن وخوشحالی کے خواب دیکھنے والا دوسروں کے لیے کوشاں رہنے والا شخص ہے۔ اس نے مزدوروں اور محنت کشوں کے لیے لکھا ان کے لیے قید وبند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ اکثر ادبی محفلوں مزدوروں کے اجتماعات اور سامراج دشمن محاذوں پر اسے میں نے سرگرم عمل دیکھا ہے۔ اس کے اندر میں نے محبت محسوس کی ہے۔ نفرت کا جذبہ اس کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ قمر یورش کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ کسی نہ کسی کا بھلا ہو جائے یا کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ ہمارے جیسا ہی وہ ہمارا دوست ہے۔ ہم تو شاعر تھے کچھ لوگوں نے ہمیں سن لیا۔ کتابیں چھپ گئیں فلموں کے گیت بھی لکھ لیے اور تھوڑے سے مشہور بھی ہو گئے۔ ہم نے بہت سہولت میں زندگی تو نہیں گزاری لیکن اپنے بچوں کی ذمہ داری کے ساتھ زندگی گزاری اور گزار رہے ہیں۔ ہم مراعات یافتہ

لوگوں میں سے نہیں ہیں اور نہ ہی قمر یورش ہے۔ مراعات یافتہ لوگوں کو یہ فن خوب آتا ہے کہ وہ ہر دور میں ایسا ڈھلتے ہیں کہ انہیں حکمران طبقہ قبول کر لیتا ہے اور وہ ان کی پچھلی کارگزاریاں بھول جاتا ہے۔ ویسے بھی حکمرانوں کو "محکمہ اطلاعات" چلانے کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرانے دور میں انفارمیشن کا کام درباری شاعر کیا کرتے تھے۔ بادشاہ کی خوشنودی کے لیے قصیدہ لکھ لیا اور مثنوی لکھ دی۔ اس کو پھیلا کر اب "محکمہ اطلاعات و نشریات" بن گیا ہے جو بدرجہ اتم یہ کام انجام دیتا ہے۔ حکمرانوں کے کام ہو جاتے ہیں، ان کی زندگی اچھی ہو جاتی ہے، یہ مراعات یافتہ شاعروں اور ادیبوں کا ہی کام ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اکیلا آدمی ان کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے۔

بغاوت لکھنے والے

لوگوں کی بے پناہ اکثریت حکمرانوں کی کاسہ لیس ہو جاتی ہے۔ یہ ان کا معمول ہے۔ اب یہاں ایک آواز کسی حد تک موثر ہو سکتی ہے۔ اس پر بھی غور کیا جا سکتا ہے لیکن دیوانے تو چند ہی ہوتے ہیں اور وہ ہر دور میں ہی ہوتے ہیں جنہیں لوگ پاگل بھی کہتے ہیں۔ بیوقوف بھی کہتے ہیں لیکن وہ اپنی دھن میں ہی رہتے ہیں اور ظلم کے خلاف اپنی بھرپور آواز کے ساتھ احتجاج کرتے ہیں جس راہ پر ان کا سفر ہوتا ہے اس سے پیچھے مڑنا انہیں ذلت دکھائی دیتا ہے اور آگے انہیں موت بھی نظر آئے تو وہ موت کو بھی بخوشی گلے سے لگا لیتے ہیں اور وہ اپنا نام چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کے لواحقین اور معاصرین اسے احمقانہ طرزِ عمل سمجھیں گے کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ ایک پہاڑ سے ٹکر لے رہا ہے۔ میرے کچھ اشعار ہیں کہ

ڈرے ہی کسی کوہ سے ٹکرا تو گئے ہم
دل لے کے سر عرصہ غم آ تو گئے ہم
اب نام رہے یا نہ رہے عشق میں اپنا
روداد وفادار پہ دہرا تو گئے ہم
کہتے تھے جو اب کوئی نہیں جاں سے گزرتا
لو جاں سے گزر کر انہیں جھٹلا تو گئے ہم
جاں اپنی گنوا کر کبھی گھر اپنا جلا کر
دل ان کا ہر اک طور سے بہلا تو گئے ہم

کچھ اور ہی عالم تھا پس چہرہ یاراں
رہتا جو یونہی راز اسے پا تو گئے ہم
اب سوچ رہے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے
پھر ان سے نہ ملنے کی قسم کھا تو گئے ہم
اٹھیں کہ نہ اٹھیں یہ رضا ان کی ہے جالب
لوگوں کو سردار نظر آ تو گئے ہم

اسی قبیل کے اور دوست بھی تھے۔ ایک ہمارا دوست نیاز حیدر تھا۔ اس کا رویہ بھی اسی طرح کا تھا۔ وہ مراعات اور عیش وعشرت کی زندگی سے ہمیشہ دور ہی رہا۔ مزدوروں کی کوٹھڑیوں اور جھونپڑیوں میں اس نے زندگی گزار دی تھی۔ تعلیق قسم کے Aristocratic ادیب وشاعر ایسے لوگوں کو اپنی محفلوں میں نہیں بلاتے ہیں کہ یہ محفل کا رنگ خراب کر دے گا کیونکہ ایسے ادیب کا انداز گفتگو Direct بلا تکلف اور استحصال کرنے والوں کے خلاف مسلسل نعرۂ حق بن جاتا ہے۔ نیاز حیدر بھی جدوجہد کرتے کرتے مر گیا۔

اپنے کاز سے عشق کرتے ہوئے سسٹم کو بدلنے اور عوامی جدوجہد کرتے جنہوں نے زندگی گزار دی۔ ان میں مولانا حسرت موہانی ہمارے سرخیل ہیں اور مخدوم محی الدین اس کی بے پناہ خوبصورت مثال ہیں کہ زندگی بھر ان کے کردار و گفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جو کچھ انہوں نے کہا ویسی زندگی ہی گزاری تھی۔ ان کے اندر کوئی تضاد نہیں تھا۔ ایسے دیوانوں کا وجود بہت ضروری ہوتا ہے۔ مخدوم محی الدین بھی بمبئی کی رنگینیوں میں کھو سکتا تھا۔ فلمی دنیا میں ڈوب سکتا تھا جیسے دوسرے ادیب وشاعر ڈوب گئے۔ ان کے صاحبزادے نے مجھ سے شکایت کی تھی کہ ''ساحر لدھیانوی فلمی دنیا میں ایسے کھو گئے ہیں کہ انہیں ہماری طرف دیکھنے کی فرصت نہیں۔'' شاعروں یا ادیبوں کے لیے اپنا بینک بیلنس ہونا اور بہتر زندگی گزارنے کے لیے فلم وغیرہ میں کام کرنا بڑا ضروری ہوتا ہے لیکن انہیں اپنے کاز سے اور مفلوک الحال لوگوں سے ناطہ نہیں توڑنا چاہیے۔ جب ترقی پسند شاعر وادیب فلموں میں چلے گئے یا اپنے روزگار میں کھو گئے تو پھر بنیاد پرسوں کی بن آئی۔ ہمیں اس روش پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور اپنے آپ پر تنقید بھی کرنی چاہیے کہ آخر ہندوستان اور پاکستان میں ترقی پسندوں کی حکومت کیوں نہیں آئی۔ لوگوں کے ساتھ زندگی کرنے کا رویہ اور ان کے غموں کو جاننے اور محسوس کرتے رہنا بھی ضروری تھا اس کے لیے ان کے ساتھ ناطہ نہیں توڑا جاتا۔ جو ترقی پسند ادھر ادھر ہو گئے ان کا بہر کیف Contribution تو ہے اس

سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے چراغ تو جلائے تھے لیکن ابھی بہت کام کرنے کی ضرورت تھی جو نہیں ہوا۔

میجر اسحاق

ہمارے بزرگ دوست میجر اسحاق بھی تھے۔ وہ فیض صاحب کے ساتھ جیل میں بھی رہے۔ ان کی کتاب ''زنداں نامہ'' کا دیباچہ بھی انہوں نے لکھا تھا۔ میری ایک کتاب کے لیے بھی انہوں نے دیباچہ لکھا تھا لیکن وہ چوہدری عبدالحمید مالک مکتبہ کارواں کی نذر ہو گیا کیونکہ وہی کتاب کے ناشر تھے۔ وہ مالک تھے ان کو کیا کہا جا سکتا تھا۔ میجر اسحاق نے وہ دیباچہ حلقہ ارباب ذوق میں بھی پڑھ دیا تھا۔ وہ مالک تھے ان کو کیا کہا جا سکتا تھا۔ میجر اسحاق نے وہ دیباچہ حلقہ ارباب ذوق میں بھی پڑھ دیا تھا۔ میں یہاں کوئی مقابلہ و موازنہ نہیں کرتا لیکن انہوں نے مجھے اپنے خیالات کے مطابق بہت بڑا شاعر قرار دے دیا تھا۔ بہر حال یہ ان کے اپنے خیالات تھے۔ وہ خود بھی پنجابی کے ڈرامہ نگار تھے۔ ان کا ڈرامہ ''مصلی'' بہت پاپولر ہوا تھا۔ ضیاء الحق کے عہد میں وہ بحالی جمہوریت کی تحریک کی پاداش میں جیل میں تھے۔ وہیں انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ وفات پا گئے تھے۔ میجر اسحاق نے ساری زندگی مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ گزار دی تھی۔ پروگریسو پارٹیاں بناتے رہے۔ وہ نیپ میں تھے۔ بہت ہی قابل احترام شخصیت تھی۔ انہوں نے حسن ناصر شہید کا کیس بھی لڑا تھا۔ جسے انہوں نے ایک ڈائری کی صورت میں شائع کیا تھا۔ میجر اسحاق نے بڑی جرات مندی کے ساتھ حسن ناصر شہید کا کیس اٹھایا تھا۔ وہ جلسوں میں تنہا مخالفوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ وہ طویل قامت اور تگڑے جسم کے آدمی تھے۔ دس بیس آدمیوں پر بھاری ہوتے تھے۔ وہ ڈٹ جاتے تھے۔ میجر اسحاق ہمارے دوست تھے میری بے حد عزت کرتے تھے اور مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ میں ان کی برسی پر ان کے گاؤں جاتا رہتا ہوں۔

انور علی چودھری

میجر اسحاق کے بھائی انور چوہدری ایڈووکیٹ ہمارے بہت زیادہ ہم خیال ہیں۔ ان کو نیشنل عوامی پارٹی میں ایک اہم رہنما کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنی کاوش کے ساتھ وکالت کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ درویش صفت آدمی ہیں۔ انور چوہدری سیکولر ذہن رکھتے ہیں اور امن کے حامی ہیں۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کرنے سے احتراز ہی کیا جائے۔ انور چوہدری نے پاک بھارت دوستی کے لیے بہت کام کیا ہے۔ ان کی سوچ یہ ہے کہ ''یہ ملک پاکستان بن گیا ہے تو اب اس کے مسائل کو حل کیا جائے اور خوشحال معاشرہ قائم کیا جائے۔''

کچھ اور دوست

مادرملت کے جلسوں میں بہت سارے دوستوں سے ملاقات رہتی تھی۔ ان میں علی احمد طارق بھی تھے۔ وہ بڑے ادب دوست تھے۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ پڑھتے لکھتے رہتے تھے۔ وہ بڑی ہی نستعلیق اردو بولا کرتے تھے اور اکثر تقریر بھول بھی جایا کرتے تھے۔ مثلاً وہ یوں کہتے کہ ''مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات اور جب سیاہی آنکھ کی لے کر میں تم کو نامہ لکھتا ہوں کہ جب تک تم اسے دیکھو میری آنکھیں تمہیں دیکھیں۔ ہم کو کالا باغ سے ڈراتے ہو۔ ہم تو خود بڑے سبز باغ دکھاتے ہیں۔'' اس طرح سے وہ تقریر سندھی لب ولہجے میں کیا کرتے تھے اور مجھے ان کی تقریریں ازبر ہوگئی تھیں۔ ایک اور صاحب محمد علی ہوتے تھے وہ جب تقریر کرتے تو Percentage نکالا کرتے تھے۔ مثلاً ''ساڑھے اٹھانوے فیصد لوگ سیاست سے نابلد ہیں' ۹۹ فیصد بیوقوف ہیں۔'' یہ ان کا انداز گفتگو تھا۔ راؤ خورشید علی خان ہوتے تھے' وہ یہ بھول جاتے تھے کہ مادرملت نے خطاب کرنا ہے اور وہ ایک خاتون ہیں' انہوں نے مادرملت کو عائلی قوانین کے خلاف یہ تقریر لکھ کر دے دی کہ چودہ پندرہ سال کی باکرہ جواں ہوجاتی ہے۔ ہم اس جواں لڑکی کو شادی کا حق دلائیں گے اور چار شادیاں کرنے کی اسلام میں اجازت ہے ہم آئیں گے اور ہر مسلمان کو چار شادیاں کرنے کا حق دلائیں گے۔'' ان لوگوں کے دل ودماغ پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ آمریت کا خاتمہ ہو اس لیے اس طرح کی عجیب باتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ سردار شوکت حیات ہمارے دوست تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ ''جلسے میں تازہ شعر پڑھنا۔'' میں نے جواب دیا کہ ''میں تو کچھ تازہ ہی پڑھوں گا' آپ بھی کچھ تازہ تقریر کریں۔'' وہ کہنے لگے۔ ''کیا مطلب؟'' میں نے کہا۔ ''مجھے تمہاری تقریریں حفظ ہیں' تم بھی مجھے کوئی میرا شعر سنا دو۔'' کہنے لگے ''اچھا میری کوئی تقریر سناؤ۔'' میں نے کہا کہ آپ نے ۲۴ برس پہلے قائداعظم کی قیادت میں اسی چوک میں جو تقریر کی تھی' وہی آج دوبارہ کی ہے۔ وہ یوں تھی۔

''الحمدللہ میں نے آزادی کی جنگ لڑی اور پاکستان بن گیا۔ پاکستان بننے کے بعد میں دامن وزارت سے وابستہ ہوگیا۔ اس کے بعد میں بستر علالت پر پڑ گیا اور بستر علالت پر پڑا سوچتا رہا کہ قوم سونے کا بت بنا کر اس کی پوجا میں مبتلا ہوگئی ہے اور میں قوم کی اس بے حسی اور سنگدلی پر روتا رہتا کہ ایک گونج دار آواز میرے کانوں میں آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ بوڑھے قائد کی بوڑھی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح قوم کو پکار رہی ہے کہ جاگو جاگو' آمریت کو دوڑاؤ میں نے پاکستان بنایا ہے۔ اب میں تنہا جمہوریت کی جنگ لڑوں گا۔ جمہوریت کو بحال کر کے رہوں گا۔''

میں نے اس سے کہا کہ تم قائداعظم کو بھی بیچ میں سے نکال دیتے ہو۔ مادرملت کو بھی بھول جاتے ہو اور پھر تنہا ہی لڑتے ہو اور ہم

نعرہ لگا دیتے ہیں۔ ''نعرہ تکبیر'' یہ ہے تمہاری تقریر جو بار بار تم کرتے ہو۔ سردار شوکت حیات نے اپنی بیگم کی موجودگی میں یہی تقریر میری آواز میں ریکارڈ کر لی تھی۔ میں اسے کہتا رہا کہ اس میں تھوڑی سی زیب داستان بھی کی گئی ہے لیکن وہ نہیں مانتے۔ پرانے لوگوں میں یہی خوبصورتی ہے کہ ان میں تنقید کو برداشت کرنے کا حوصلہ اور برداشت ہوتی ہے۔

ہمارے ایک دوست رؤف طاہر تھے۔ ان پر ہر وقت دھن سوار رہتی کہ وہ جلدی سے جیل چلے جائیں۔ وہ ہم سے کہتے تھے کہ ''تم ابلیس ہو میں تمہاری موجودگی میں ایک پل بھی جیل سے باہر نہیں رہنا چاہتا' تمہارا رویہ رئیسانہ اور سفاکانہ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ جیل چلے جاتے تھے۔ ہم ان سے ملنے جیل جایا کرتے تھے کیونکہ ہماری ڈیوٹی لگ گئی تھی۔ شیخ رفیق احمد ہمیں پانچ روپے دیا کرتے تھے۔ تین روپے آنے جانے کا کرایہ ہوتا تھا اور دو روپے کا کھانا کھا لیتے تھے۔ شیخ رفیق احمد' میاں محمود علی قصوری کے اسسٹنٹ تھے۔ بہت باشعور آدمی ہیں۔ ان کا یہ عالم ہے کہ وہ جب تقریر کرتے ہیں تو یہ نہیں دیکھتے کہ کیا ہو رہا ہے۔ بس تقریر کر دیتے ہیں۔

سی آر اسلم ہمارے بزرگ دوست ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی سوشلزم کے نام پر صرف کر دی اور آج بھی چٹان کی طرح کھڑے ہیں۔ ان لوگوں کی بہر طور عزت کرنی چاہیے۔ سی آر اسلم بڑے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ وہ چاہتے تو بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے اپنا راستہ نہیں بدلا کہ ''ظلم دیکھ کے رستے نہیں بدلتے۔''

بہت سارے لوگ ہیں جنہوں نے زندگی اپنی ہی دھن میں گزار دی۔ میاں محمود لاکھپو روالے وہ بھی سوشلسٹ پارٹی کے بڑے سرگرم رکن ہیں۔ ایک پنجابی کے شاعر سلیم جاتگی تھے۔ بڑے پختہ کار شاعر تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ انہیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت تھی۔ بہت ذہین تھے۔ گفتگو ایسی کرتے تھے کہ بہت کم لوگ ان کی کسی بات کا جواب دے پاتے تھے۔ وہ جلدی انتقال کر گئے۔ ان کی موت کا مجھے بہت صدمہ ہوا تھا۔

باری علیگ

عبداللہ بٹ کے آخری ایام میں ہمارے باری علیگ کے صاحبزادے مسعود باری نے بڑا وقت ان کے ساتھ گزارا اور اپنے ابا کے دوست کی بڑی تیمارداری کی تھی۔ باری علیگ بلند پایہ ادیب' صحافی اور ترقی پسندوں کے رہنما تھے۔ سعادت حسن منٹو بھی ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ ترقی پسند تحریک میں باری صاحب کا بہت بڑا مقام تھا۔ ''کمپنی کی حکومت'' ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے اور انہوں نے بے شمار پمفلٹ بھی لکھے تھے۔ مسعود باری ان کے صاحبزادے ہیں اور ہمارے دوست ہیں۔ انہیں بجا طور پر باری صاحب کے دوستوں سے شکایتیں ہیں کہ باری صاحب کو جو پذیرائی ملنی چاہیے تھی وہ نہیں ملی۔ مسعود باری قدرے خفگی کے ساتھ ان

باتوں کا اظہار اپنے ابا کے دوستوں کے سامنے کرتے ہیں۔ان باتوں کا برا نہیں منانا چاہیے۔ مسعود بھائی کا رویہ کسی حد تک درست ہے کہ ہم مر جاتے ہیں اور اپنے بچوں کے لیے غم' عسرتیں اور مفلوک الحالی چھوڑ جاتے ہیں ہمیں تو اپنی سیاسی ونظریاتی زندگی عزیز ہوتی ہے۔ہم اس میں کچھ لذت بھی محسوس کرتے ہیں اور وہی زندگی گزار کر جہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ہمارے بعد ہماری اولاد ہی کو سب کچھ بھگتنا ہوتا ہے کیونکہ ہم ان کے لیے خوشحالی چھوڑ کر نہیں جاتے۔ باری علیگ کے پیچھے تو چوبیں گھنٹے سی آئی ڈی والے لگے رہتے تھے۔اس لیے ان کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ وہ گونگوں کی زبان اشاروں میں ہی گفتگو کرتے تھے۔کوئی بھی ان سے سوال کرتا تو وہ اوپر اشارہ کرتے اور کہتے کہ" اللہ جانتا ہے۔" باری علیگ بڑے مرنجان مرنج اور دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔عبداللہ بٹ کے بقول ایک دفعہ وہ وائی ایم سی اے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے وہاں سے جو لوگ گزر رہے تھے انہوں نے انہیں گدا گر سمجھ لیا اور پیسے دینا شروع کر دیئے۔جب کچھ پیسے اکٹھے ہوئے تو عبداللہ بٹ جو دور کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا اس کو اشارہ کیا کہ" آ جاؤ اب چل کر دودھ پیتے ہیں۔" ایک دفعہ باری صاحب نے گرجا گھر کے اوپر جا کر اذان دے دی تھی۔وہ ایک عظیم مفکر تھے۔بہت بڑے صحافی تھے۔مسعود باری کے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا۔میں بھی باری علیگ کے نقش قدم پر چلنے والا آدمی ہوں۔احمد سعید کرمانی نے ایک تختی باری صاحب کے گھر لگائی تھی۔یہ عبداللہ بٹ کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔مجھے علم نہیں ہے کہ کسی حکومت نے ان کی سرپرستی کی ہے یا نہیں۔والدہ مسعود باری بہت ذہین اور ادیبوں شاعروں کی عزت کرنے والی خاتون ہیں۔ان کا رویہ بہت مشفقانہ ہوتا ہے۔میں کبھی کبھی جا کر ان کو سلام کیا کرتا ہوں۔باری علیگ کی صاحبزادی کی شادی مسکین حجازی سے ہوئی ہے۔خدا ان سب کو خوش رکھے۔

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو سے ہماری دوستی تو نہیں تھی۔ہم تو ان کے مداحین میں سے تھے۔کافی ہاؤس سے باہر ان سے ملاقات ہوتی رہتی یا کبھی چوہدری عبدالحمید کے مکتبہ کارواں میں وہ ملتے تھے۔ایک دفعہ منٹو مولانا چراغ حسن حسرت سے پوچھ رہے تھے کہ "تمہاری جیب میں کتنے پیسے ہیں؟" حسرت صاحب نے کہا کہ "میری جیب میں پندرہ روپے ہیں۔" منٹو نے کہا۔"دس روپے مجھے دے دو اور پانچ روپے تم رکھ لو۔" یہ پیسے ظاہر ہے انہوں نے پینے کے واسطے لیے تھے۔ان کے گھر بھی ایک دفعہ ان سے ملاقات ہوئی تھی۔سعادت حسن منٹو بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔افسانہ نگاری میں وہ اس قدر ماہر اور مشاق تھے کہ حیرت ہوتی تھی کہ وہ چلتے چلتے افسانہ بنا لیتے تھے۔ان کے افسانوں میں جزئیات نگاری کم اور مکالمہ زیادہ ہوتا تھا۔حلقہ ارباب ذوق میں جب انہوں نے اپنا مشہور افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" پڑھا تھا' اس دن حلقے کے اجلاس میں خلاف معمول حاضری بہت زیادہ تھی اور ان کو اس افسانے پر یوں

داد ملی تھی جیسے کسی مشاعرے میں شاعر کو داد ملتی ہے۔ سعادت حسن منٹو سے آخری ملاقات ایف سی کالج میں ہوئی تھی۔ ایف سی کالج میں ایک ادبی فنکشن تھا جس میں منٹو صاحب کو افسانہ پڑھنا تھا۔ احمد ندیم قاسمی' شوکت تھانوی اور میں ان کے ہمراہ تھے۔ مال روڈ پر ہم اکٹھے کار میں جا رہے تھے۔ ''نوائے وقت'' کے دفتر کے قریب ہی انہوں نے گاڑی رکوا دی وہاں ایک بار تھی۔ جہاں مجھے منٹو صاحب نے شراب لانے کے لیے بھیجا میں نے کہا' منٹو صاحب! پرمٹ؟ کہنے لگے۔ ''منٹو' پرمٹ منٹو.......'' میں بار میں گیا اور شراب مانگی' انہوں نے پرمٹ مانگا۔ میں نے کہا ''منٹو'' تو انہوں نے مجھے ایک بوتل دے دی۔ میں نے لمبا سا کوٹ پہنا ہوا تھا' وہ بوتل میں نے کوٹ کے اندر چھپالی اور واپس آ گیا۔ منٹو نے پوچھا۔ ''کہاں ہے؟'' میں بتایا' میری جیب میں ہے اور اس پر میرا ابھی حق بنتا ہے۔

پروفیسر اصغر گورنمنٹ کالج والے' منٹو صاحب اور میں' ہم تینوں ایف سی کالج کے ایک ہال کے ڈائس کے پیچھے بیٹھ گئے۔ منٹو صاحب اور میں نے دو دو پیگ لیے۔ دو انہوں نے اپنے لیے بچا لیے۔ ہم دو ہی میں ''نہال'' ہو گئے تھے۔ ہم خوش تھے کہ ہم نے منٹو صاحب کے ساتھ پی ہے۔ منٹو صاحب پر کیفیت طاری ہونا شروع ہو گئی اور انہوں نے اپنا افسانہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم انہیں داد دے رہے تھے اور وہ ہمیں ڈانٹ رہے تھے کہ آہستہ داد دو۔ دوسرے دن شہزاد احمد نے مجھے بتایا کہ ''منٹو صاحب وفات پا گئے ہیں۔'' میں نے یہی سمجھا کہ انہوں نے دو پیگ شراب پی لی تھی اسی لیے مر گئے۔ میں نے کہا۔ ''نہ پیتا تو اچھا تھا۔'' ہم منٹو صاحب سے جونیئر تھے' ان کے مداح اور پرستار تھے۔ ان کے تھوڑے دن حلقہ بگوش رہے ہیں۔ میں نے منٹو صاحب کی وفات پر ایک نظم ان پر لکھی جو ماہنامہ ''فانوس'' کراچی میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے وہ نظم منٹو صاحب کی صاحبزادی کو بھی دی تھی۔ پتہ نہیں انہوں نے کہیں کھو دی ہے۔

عبدالحمید عدم

عبدالحمید عدم کے ساتھ ہم نے کئی مشاعرے پڑھے ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز شاعر تھے۔ ان کا شعر بھی فوراً دل میں اتر جاتا تھا۔ زبان بڑی سادہ اور شفاف' انکا اپنا ایک خاص اسلوب تھا۔ مشاعرے میں اکثر ترنم سے پڑھنے والوں کو بہت داد ملتی ہے لیکن عدم صاحب تحت اللفظ پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔ سیف الدین سیف اپنی فلم ''رات کی بات'' کے ساتھ کراچی آئے تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''آپ کی غزل لاہور میں مجھے سمجھ نہیں آئی تھی یہاں آ کر سمجھ آئی ہے۔'' وہ غزل یہ تھی۔

جاگ اٹھے سوئے ہوئے درد تمناؤں کے

راستے ذہن میں لہرا گئے اس گاؤں کے
اک تری یاد سے اک ترے تصور سے ہمیں
آ گئے یاد کئی نام حسیناؤں کے
صبح سے شام تلک گرم ہوا چلتی ہے
دن بہت سخت ہیں تپتے ہوئے صحراؤں کے
اس کڑی دھوپ میں یاد آتے ہیں تڑپاتے ہیں
ہم کو احسان درختوں کی گھنی چھاؤں کے
وہ حسیں پھول وہ سبزہ وہ فسوں ساز ہوا
وہ مدھر گیت محبت بھرے دریاؤں کے
جانے کس حال میں ہیں کون بتائے جالب
ارض پنجاب میں پودے مری آشاؤں کے

سیف صاحب کہنے لگے۔ ''کاش یہ غزل میں نے یہاں کہی ہوتی۔'' میں نے کہا کہ جا یہ غزل میں نے کراچی میں ہی کہی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ عدم صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ سیف نے کہا کہ ''انہیں بھی لے آنا۔'' میں عدم صاحب کو رات آٹھ بجے کے بعد ساتھ لے کر سیف صاحب کے ہاں چلا گیا۔ سیف صاحب نے ''آب مغرب'' کا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ ان دنوں ''امتناعی دور'' نہیں تھا۔ کھلے بندوں ملتی تھی۔ دو پیگ پینے کے بعد عدم صاحب ''فلیٹ'' ہو گئے۔ اب میں اور سیف بیٹھے ہیں کہ عدم صاحب اٹھیں تو انہیں ان کے گھر چھوڑ آئیں۔ لیکن وہ اٹھ ہی نہیں رہے تھے۔ ہم نے چار بیرے بلائے۔ انہیں اٹھایا اور گھر چھوڑا۔ ان کے گھر سے جو گالیاں مجھے ملیں وہ بھی سنیں کہ جیسے میں ہی انہیں خراب کر رہا ہوں۔ حالانکہ ان کی ایک کتاب کا نام ہی ''خرابات'' ہے۔ دوسرے دن پھر اکٹھے ہوئے۔ سیف نے کہا کہ ''عدم صاحب کل آپ بے ہوش ہو گئے تھے۔'' کہنے لگے ''حضور احتراماً بے ہوش ہو گیا تھا۔'' عدم صاحب کے جملے بے ساختہ ہوتے تھے۔ ہم ہنس پڑے اور کہا کہ یہ احتراماً بے ہوش ہونے والا شاعر پہلی بار دیکھا ہے۔ ایک دفعہ شام کو ملے اور کہا کہ ''حضور انتظام ہونا چاہیے۔'' وہ حضور کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔ میں نے ان سے کہا' ہو جاتا ہے۔ آج آپ کو رئیس امروہوی سے صرف یہ کہنا ہے کہ ''آپ کا آج کا قطعہ بہت اچھا تھا۔'' انہوں نے کہا کہ ''حضور کہہ دیں

گے۔'' رئیس امروہوی کا دفتر بولٹن مارکیٹ کے پاس ہی تھا۔ میں نے عدم صاحب کو نیچے کھڑا کیا اور خود جا کر رئیس صاحب کو مطلع کیا کہ نیچے عدم صاحب کھڑے ہیں اور آج آپ نے جو قطعہ لکھا ہے اس کی بہت تعریف کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں رئیس صاحب کو خود جا کر داد دینا چاہتا ہوں۔ رئیس صاحب کہنے لگے۔ ''نہیں نہیں ان کو اوپر لاتے ہیں اور کوئی اہتمام بھی کرتے ہیں۔'' میں نے کہا' آپ دیکھ لیں آپ کی مرضی۔ فوراً انہوں نے بوتل لانے کے لیے ایک بندہ بھیج دیا اور عدم صاحب کو اوپر لے آئے۔ عدم صاحب تیسرے پیگ پر ہی رئیس صاحب کا قطعہ بھول گئے اور ان سے کہا کہ ''تم کون ہو اور کیا ہو؟'' میں نے کہا۔ ''ارے حضور' وہ قطعہ رئیس صاحب کا...... آپ صبح سے پاگل ہوئے پھر رہے ہیں کہ جا کر رئیس صاحب کو داد دوں گا۔'' عدم صاحب نے مجھے بھی کہا کہ ''تم کون ہو؟'' وہاں میری بڑی سبکی ہوئی۔ میں عدم صاحب کو ایک بار پھر ان کے گھر چھوڑنے گیا اور پھر وہی انکے گھر والوں کے اسی رویے کا سامنا ہوا۔ دوسرے دن میں نے ان سے کہا کہ یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ رئیس صاحب کے سامنے آپ نے میری توہین کر دی۔ اب تو وہ ہم سے نہیں ملیں گے۔ عدم صاحب نے رئیس امروہوی کے پاس جا کر اپنے رویے کی تردید کی اور کہا کہ ''میں تو آپ کا مداح ہوں۔''

نثار عثمانی

نثار عثمانی صاحب تحریک بحالی جمہوریت کے بڑے ہی اہم مجاہد ہیں۔ جمہوریت پسندوں کی وہ محبوب ترین شخصیت ہیں۔ انہوں نے بڑے بڑے آمروں سے ٹکر لی اور لاجواب کردار ادا کیا ہے۔ آمریت کے دور میں بھی جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا ان میں نثار عثمانی بھی شامل ہیں۔ ایک صحافی کا اصل کردار انہوں نے ادا کیا ہے۔ میری ان سے بہت پرانی شناسائی ہے۔ میں ان کے ہاں ہر صبح حاضری دیتا تھا جو ان کے تجزیات ہوتے تھے' وہ میرے تجزیات ہوتے تھے جو میں ان کا نام لیے بغیر اپنے نام سے ہی چلا دیا کرتا تھا۔ نثار عثمانی بڑی معصوم اور پیاری شخصیت کا نام ہے۔ میں نے ایک دن ان سے کہا کہ اس شہر میں جتنی روحانی شخصیات شاہ حسین اور دوسرے صوفیا ہیں انکے بعد میں آپ کا احترام کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ میرا کوئی بھی فنکشن ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ وہ میرے ہر فنکشن میں آتے ہیں۔ اگر وہ بھی دوسرے صحافیوں کی طرح ہوتے تو کروڑپتی نہ سہی لکھ پتی ضرور ہوتے۔ کیونکہ آج کے دور میں صحافی تو لکھنا ہی بھول گئے ہیں۔ ان کے قلم پر خوف کا سایہ رہتا ہے۔ منسٹری آف انفارمیشن کی طرف سے انہیں لکھا لکھایا مل جاتا ہے۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ اخبار کو آزادی کا حق حاصل نہیں ہے تو ہم کیا کریں لیکن نثار عثمانی نے جھوٹ کے دور میں بھی ہمیشہ سچ کے پرچم کو بلند رکھا۔

آئی اے رحمن

آئی اے رحمن ہمارے دوست ہیں اور ذہنی طور پر بڑے خوبصورت آدمی ہیں۔ ان کی گفتگو نپی تلی ہوتی ہے اور بڑی فکر انگیز ہوتی ہے۔ ان کی سیاست عالم پر گہری نظر ہے۔ ان کا ادب کا بھی گہرا مطالعہ ہے۔ آئی اے رحمن فیض صاحب کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ ہمارے بھی بڑے خیر خواہ دوست ہیں۔ ان میں سچ کہنے کے ساتھ سننے کا حوصلہ بھی بہت ہے۔ اپنے مزاج کے خلاف بات سن کر مسکرا دینا ان کی فراخدلی ہے۔ ان کا یہ انداز استہزائیہ نہیں ہوتا ہے۔ اپنے علم پر بھی وہ ہرگز متکبر نہیں ہوتے ہیں۔

عبداللہ ملک

عبداللہ ملک ہمارے پرانے دوست ہیں۔ ہم سے سینئر بھی ہیں۔ ان کو ہم بہت زمانوں سے جانتے ہیں۔ ترقی پسند مصنفین کی محفلوں میں ان کو سرگرم دیکھا ہے۔ ایک ادیب' صحافی اور محقق کی حیثیت سے بھی وہ ایک مقام رکھتے ہیں۔ کافی ہاؤس سے ایک دفعہ پولیس مجھے پکڑ کے لے گئی تھی۔ انہوں نے میرے حق میں جا کر گواہی دی تھی۔ عبداللہ ملک اس زمانے میں امروز کے چیف رپورٹر تھے۔ وہ ایک بہادر انسان ہیں۔ انہوں نے بڑی بہادری اور جرات کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ ضیاء الحق کے دور میں بھی وہ پابند سلاسل ہوئے اور انہوں نے معافی نامے پر دستخط نہیں کئے تھے۔ عبداللہ ملک ایک کھلا آدمی ہیں۔ نیشنلسٹوں کے ساتھ ان کے گہرے روابط رہے ہیں ان کی کہانیاں اور روایات عبداللہ ملک کے سامنے تھیں۔ میرے وہ بزرگ دوست ہیں۔ انہوں نے مجھ پر چالیس صفحے کا مضمون بھی لکھا ہے۔ جس میں مجھے عوام کے قریب رہنے والا شاعر لکھا ہے۔ ان کا سوچنے اور لکھنے کا خاص انداز و اسلوب ہے۔

قتیل شفائی

زمانہ جاہلیت میں اس طرح کی انائیں ہوتی تھیں کہ میں بڑا شاعر ہوں یا وہ بڑا شاعر ہے۔ اسطرح کی معاصرانہ چشمکیں جہالت کے ہی انداز میں ہوتی ہیں۔ جب یہ تسلیم کیا جائے کہ فلاں بندے میں کتنی خوبیاں ہیں اور خامیاں کتنی ہیں اور خوبیاں اگر پچاس سے اوپر چلی جائیں تو وہ ایک اچھی شخصیت ہوتا ہے۔ قتیل شفائی بھی ایک اعلیٰ شخصیت کا مالک ہے۔ اس نے بہت محنت سے اپنا یہ مقام بنایا ہے۔ غزل' نظم اور فلم کے گیت اور شعر لکھنا یہ بہت بڑا کام ہے۔ ایک فلمی میگزین ''اداکار'' کو وہ ایڈٹ کرتے رہے' یہ اس کی محنت اور مشقت کا دور تھا۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ وہ دوستوں کا دوست ہے اور دشمنوں کا دشمن۔ مصری شاہ لاہور میں ان کا مکان ہوا کرتا تھا۔

میں نے اکثر دوستوں کو ان کے ہاں دیکھا اور وہ ان کی خدمت کر رہا ہے' ان کے لیے خود کھانا پکا رہا ہے۔ بہت سارے لوگوں کے چہرے میرے ذہن میں ہیں ان کے مہمان رہے ہیں' میں ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ کچھ وقت میں نے بھی ان کے ساتھ گزارا' میں تو اس کا اعتراف کر لیتا ہوں' دوسرے لوگ اس کے معترف نہیں ہیں۔ سچ بولنا قتیل شفائی کی شخصیت کا حسن ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے شاعر ادیب کراچی میں اکٹھے ہوئے تھے' وہاں کمال سچائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قتیل شفائی نے کہا تھا کہ ''جو کام ہم نہیں کر سکے ہیں وہ کام حبیب جالب نے کر کے ہماری لاج رکھ لی ہے۔ حبیب جالب ہماری آبرو ہے۔'' قتیل شفائی نے فلم کے لیے بڑے اچھے گیت لکھے ہیں۔ ہندوستانی فلموں کے لیے بھی اس نے گیت لکھے ہیں۔ وہ جو کام کرتا ہے' اس کو صلہ ملتا ہے۔ آپ کہیں بیٹھے جل رہے ہیں کہ وہ کیوں وہاں گانے لکھ کر آیا ہے۔ کون کس سے گانے لکھواتا ہے۔ کسی پر کوئی احسان تو نہیں کرتا۔ کوئی فلم پروڈیوسر یا ڈائریکٹر کسی شاعر سے گیت لکھواتا ہے تو یہ اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

قتیل شفائی ایک نامور شاعر ہے' اس کا فلم پہ بہت احسان ہے۔ اس نے میوزک ڈائریکٹروں کو یہ درس دیا کہ شاعری جو ہوتی ہے اس میں نغمگی اور اپنا ایک حسن ہے۔ اس حسن کو محسوس کیا جائے اور اس کے مطابق طرز بنائی جائے۔ قتیل شفائی نے طرزوں پر بھی گیت لکھے ہیں لیکن بے معنی نہیں لکھے' باوزن گیت لکھے ہیں۔ اس کے گیت فن کے تقاضوں پر پورے اترتے ہیں۔ قتیل شفائی ہمارا یار ہے۔ قتیل شفائی کا ایک شعر میری سوچ کا نمائندہ شعر ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔

دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

احمد راہی

احمد راہی پنجابی کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات رہے ہیں۔ ان کا شعر بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ اردو کے بھی بہت اچھے شاعر ہیں۔ پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں بہت اعلیٰ شاعری کرتے ہیں۔ ''سویرا'' کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ وہ اپنے فن میں استاد آدمی ہیں۔ مجھ سے سینئر ہیں ہم ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ہم نے ان کا کلام بھی بہت سنا ہے اور گفتگو سے بھی مستفید ہوتے رہے ہیں۔ وہ پنجابی کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے خوبصورت پنجابی گیت تخلیق کئے ہیں اور ان کا اپنا خاص اسلوب ہے۔ پنجابی شعر و ادب کا وہ بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

منو بھائی

منو بھائی ہمارا یار ہے۔ ایک پر درد آدمی ہے۔ اس کی پنجابی شاعری بہت اچھی ہے۔ ہم کئی بار مشاعروں میں بھی اکٹھے ہوئے ہیں۔ لوگوں سے وہ بھرپور داد سمیٹتا ہے۔ اس کا مطلب ہے لوگوں کو اس کا کلام پسند ہے۔ وہ روزانہ ایک اچھا کالم لکھتا ہے' اس میں بڑی جان ہوتی ہے۔ ہم جو باتیں سوچتے ہیں اور لکھ نہیں سکتے وہ اپنے کالم میں لکھتا ہے۔ اس کا انداز مقبول ہو گیا ہے۔ منو بھائی کو خدا نظر بد سے بچائے۔ جب آپ مکروہ چہروں کو بے نقاب کریں گے تو وہ یقینی طور پر آپ کے دشمن ہو جائیں گے اور آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ منو بھائی ایسے حالات میں اپنے دشمن بناتا آیا ہے۔ اس کا ایک خاص اسٹائل ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ پھانسی پر چڑھا ہوا ہے اور وہ سچ بولنا نہیں چھوڑ سکتا۔ ایک بڑے اخبار کا وہ کالمسٹ ہے۔ پولیس والوں کے "محاسن" جس طرح وہ بیان کرتا ہے یہ جرات وہی کر سکتا ہے۔ میں نے پولیس کو اس کے قلم کی نوک کے نیچے کانپتے ہوئے دیکھا ہے۔ صحافت میں یہی چند لوگ رہ گئے ہیں جو خود سوچ کر لکھتے ہیں ورنہ صحافت تو گورنمنٹ کا خبر نامہ' اطلاعات کی سفارشات یا "خصوصی ایڈوائزر" ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ اجازت لکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ آزاد اخبارات کا زمانہ ختم ہو گیا ہے جو مولانا حسرت موہانی سے شروع ہوا تھا۔ مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر تو نہیں رہے لیکن کہیں نہ کہیں ان کی جھلک ضرور دکھائی دے جاتی ہے۔ منو بھائی کا کالم پڑھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ آزادی صحافت کے دور کا بے باک صحافی ہے۔ ہم منو بھائی کے مداح ہیں' وہ ہمارا یار ہے۔ ہمیں اس سے پیار ہے۔ وہ ہمیں ٹیلیفون نہیں کرتا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ بل بڑھ جائے گا۔ جب بھی میں اسے ٹیلیفون کرتا ہوں تو وہ مجھ سے کہتا ہے کہ "میں آپ کو بہت یاد کرتا ہوں۔" اس ضمن میں وہ جھوٹ بولتا ہے لیکن یہ جھوٹ بھی وہ اس طرح بولتا ہے کہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ چلو بولتا تو ہے مجھ سے' جھوٹ ہی سہی۔ کچھ لوگ تو کچھ بھی نہیں بولتے۔

عزیز صاحب

گڑھی شاہو لاہور کا رہنے والا عزیز ہماری نیشنل پارٹی کا سالار تھا۔ عزیز بہت بڑے بزرگوں کا چشم و چراغ ہے۔ ان کی جائیداد لاہور ریلوے اسٹیشن تک پھیلی ہوئی ہے۔ سہارنپور میں کمبوہ پل بھی ان کے دادا نے بنایا تھا۔ یہ کنٹریکٹر تھے۔ میں نے لاہور سے پیپلز پارٹی کے میاں محمد رفیع کے مقابل جو الیکشن لڑا تھا' عزیز نے ہی درحقیقت لڑایا تھا۔ برادری بازی کے چکر میں نہیں ہے۔ عزیز صاحب جواں دماغ اور ترقی پسند ذہن کے مالک ہیں۔ ہمارے پرانے یار ہیں کئی بار جب مجھے انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا تو میں ان کے گھر ہی رہتا

رہا ہوں۔ پولیس مجھے تلاش کرتی رہتی اور میں ان کے گھر میں کئی کئی دن پناہ لیے رہتا ہوں۔ اداکارہ شبنم امپیسیڈر ہوٹل میں آ کر ٹھہری تھی زوبن گھوش مجھے جانتا تھا۔ عزیز کو شبنم سے ملنے کی خواہش ہوئی تو میں اسے لے گیا۔ میں اسے جب کسی سے ملواتا تو یہی کہتا تھا کہ یہ میرے "صدر" ہیں۔ ملنے والے کے دل میں ان کا احترام پیدا ہو جاتا تھا۔ عزیز صاحب گڑھی شاہو کے پرانے باشندے ہیں۔ یہاں ان کی دو تین دکانیں ہیں۔ ایک ناشتے کی دکان ہے۔ جب تک شبنم یہاں ٹھہری رہی' ناشتہ عزیز صاحب کی دکان سے ہی جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہم عزیز کے ساتھ کراچی گئے۔ وہاں پارٹی کا اجلاس تھا۔ چاروں صوبوں سے وہاں لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ ہم صبح اٹھ کر وہاں گئے۔ ٹینٹ وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ جی ایم سید ولی خان کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ پارٹی کے چاروں صدور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جاتے ہی عزیز صاحب کا تعارف کرایا کہ یہ ہمارے "صدر" ہیں۔ خان صاحب نے حیران ہو کر عزیز صاحب کی طرف دیکھا کہ صدر تو میں ہوں' یہ کون سا صدر ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ وہاں کے صدر ہیں جہاں سے میں الیکشن ہارا تھا اور آٹھ سو ووٹ لیے تھے۔ ولی خان نے عزیز کو شاباش دی اور کہا کہ "آپ اپنا کام جاری رکھیں۔" جی ایم سید ایک سادہ آدمی ہے' اس نے پگڑی سر پہ باندھی ہوئی تھی اور زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

وارث میر

ہماری یہ پرانی روایت ہے کہ جب بھی ہم میں سے کوئی شخص جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے عوام دشمنوں کو لکارتا ہے تو ہم اس شخص کو داد تو بہت دیتے ہیں لیکن عملی طور پر اسکا ساتھ دینے سے ہچکچاتے ہیں۔ چنانچہ زبان و قلم سے عوام دشمنوں کے خلاف جنگ لڑنے والے بہت سے مجاہد حوصلہ ہار دیتے ہیں اور حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ لیکن کچھ "سر پھرے" مجاہد ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی جنگ مسلسل جاری رکھتے ہیں اور آخر کار جب لڑتے لڑتے شہید ہو جاتے ہیں تو پھر ہمارے لوگوں کو سمجھ آتی ہے کہ شہید ہونے والے کی جنگ کس کے خلاف تھی اور کیوں تھی؟ اور وہ کتنا عظیم انسان تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں جن سر پھرے مجاہدوں نے آخری دم تک عوام دشمن قوتوں کے خلاف زبان قلم سے اپنی جنگ جاری رکھی ان میں سے ایک پروفیسر وارث میر تھے۔ وارث میر کی آخری تحریر ان کی موت سے چند دن بعد روزنامہ "جنگ" میں شائع ہوئی تھی اور اپنی اس آخری تحریر میں وارث میر نے فوجی جنرل ضیاء الحق کو گرجدار انداز میں للکارتے ہوئے کہا تھا کہ تم ترقی پسند قلم کاروں کو غدار اور ترقی پسند فکر کو سیم و تھور قرار دینے کا حق نہیں رکھتے بلکہ اس ملک کے عوام کا فیصلہ ہے کہ عوام کی امنگوں کے خلاف آئین کو پامال کرنے والا ہر فوجی آمر غدار ہے۔ پروفیسر وارث میر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے نظریات کی ڈوری نہ تو ماسکو اور نہ ہی واشنگٹن سے چلتی تھی بلکہ ان کے نظریات نے اسی دھرتی کی کوکھ سے جنم

لیا تھا۔

ایوب خان کے دور میں جب وارث میر نے پاکستانی معیشت وسیاست پر چند گھرانوں کی بالادستی کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کے ساتھ اپنی آواز ملائی تو ان پر بائیں بازو کا لیبل لگا دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں جب انہوں نے حکومت وقت کی کچھ پالیسیوں سے اختلاف کیا تو ان پر دائیں بازو کا لیبل لگا دیا گیا اور جب ضیاء الحق کی طویل آمریت کے دور میں وارث میر کا قلم حکمرانوں کے خلاف تیر ونشتر بن گیا تو اس مرد درویش پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا لیکن آمروں کی طرف سے کافر قرار دیا جانے والا وارث میر عوام دوست اور جمہوریت پسند حلقوں کی نظروں میں مرد مجاہد تھا کیونکہ اس کی جنگ جاری تھی۔ ۱۹۸۳ء میں جب لاہور کے مال روڈ پر خواتین کے جلوس پر پولیس نے وحشیانہ لاٹھی چارج کیا تو مجھے بھی چوٹیں آئیں کیونکہ عورت کو آدھا قرار دینے کے قانون کے مخالف بہت سے مرد بھی اس جلوس میں شامل تھے۔ وارث میر نے بھی خواتین کے جلوس پر اس تاریخی لاٹھی چارج کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ منظر دیکھنے کے بعد وارث میر نے عورت کو آدھا ثابت کرنے والوں کے خلاف اپنے قلم کے ذریعہ باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا۔ وارث میر کی انفرادیت یہ تھی عورت کی گواہی اور دیت کو آدھا قرار دینے والے مولویوں کا مقابلہ قرآن وحدیث کے حوالوں سے کیا اور ان کو لاجواب کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ پروفیسر وارث میر کی تحریریں پڑھی لکھی خواتین میں بہت زیادہ مقبول تھیں اور آج بھی وارث میر کی کتاب ''کیا عورت آدھی ہے؟'' خواتین میں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہے۔

دسمبر ۱۹۸۴ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے ریفرنڈم کا اعلان کیا تو وارث میر پہلے لکھاری تھے جنہوں نے اس ریفرنڈم کو غیر اسلامی اور غیر آئینی قرار دیا۔ انہی دنوں گورنر ہاؤس لاہور میں جنرل ضیاء الحق نے پروفیسر وارث میر کو ملاقات کے لیے بلایا۔ ضیاء الحق نے وارث کو اپنی چکنی چپڑی باتوں کے ذریعے رام کرنے کی کوشش کی لیکن وارث میر رام نہ ہو سکے۔ اس پر ضیاء الحق نے بڑے سخت لہجے میں وارث میر سے کہا کہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ سرکار سے تنخواہ لینے والے سرکار پر تنقید بھی کریں۔ وارث میر ان دنوں شعبہ ابلاغیات جامعہ پنجاب میں استاد تھے اور سرکاری ملازم ہونے کے باوجود ان کا قلم سرکار کی مخالفت میں چل رہا تھا لیکن ضیاء الحق کی دھمکی کے بعد وہ باز نہ آئے۔ ریفرنڈم سے کچھ روز قبل ایک اعلیٰ سرکاری شخصیات نے وارث میر کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور پیش کش کی کہ اگر وہ ٹیلیویژن پر آ کر ریفرنڈم کے نتائج پر حکومت کے حق میں تبصرہ کر دیں تو انہیں ترقی مل سکتی ہے لیکن وارث میر نے سرکار کے حق میں تبصرے سے انکار کر دیا۔ پھر جب ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی انتخابات کا اعلان ہوا تو وارث میر ہی وہ شخص تھے جنہوں نے ان غیر جماعتی انتخابات کو پاکستان میں جمہوریت کے مستقبل اور قومی سلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ قرار دیا۔ وارث میر نے اپنی

تحریروں کے ذریعہ چیخ چیخ کر کہا کہ غیر جماعتی انتخابات سے پاکستان میں برادری' ذات اور نسل پرستی کی سیاست فروغ پائے گی جو پاکستان کی سلامتی ختم کرنے کا باعث بنے گی۔ لیکن فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق اپنی دھن کا پکا تھا۔ اس نے غیر جماعتی انتخابات کروائے اور پھر وقت نے ثابت کیا کہ پاکستان کی سیاست میں برادری ازم اور نسل پرستی جیسے منفی رجحانات نے غیر جماعتی انتخابات کے ذریعہ فروغ پایا۔

وارث میر کی جنگ کا سب سے کٹھن دور وہ تھا جب انہوں نے شریعت بل کو بھی اسلام اور پاکستان کے تقاضوں کے منافی قرار دیا۔ اس جنگ کے دوران وارث میر نے دن رات جاگ کر گزارے۔ روشن خیال علماء کی محفلوں اور لائبریریوں میں کئی کئی گھنٹے گزارے۔ شریعت بل اور شریعت محمدی میں فرق کو سمجھا اور شریعت بل کو خلاف شریعت قرار دینے کے لیے بڑی باریک بینی سے کام لیا۔ پروفیسر وارث میر کی جنگ کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے علماء جو خاموش تھے' شریعت بل کے خلاف بول پڑے اور حکومت وقت کو جرات نہ ہوئی کہ وہ شریعت بل اسمبلی میں پیش کرے لیکن دوسری طرف بے چارہ وارث میر خطرات اور مشکلات کے بھنور میں چلا گیا۔ شروع شروع میں تو وہ چپ سادھ کر تکلیفیں اٹھاتا رہا لیکن پھر جب تکلیفیں بڑھ گئیں تو اس کی سسکیاں دوسروں نے بھی سن لیں۔ وارث میر کی سسکیاں اس وقت نکلیں جب شریعت بل کے خلاف لکھنے کی پاداش میں اس کے ایک معصوم اور بے گناہ بیٹے کو قتل کے ایک جھوٹے مقدمے میں ملوث کر دیا گیا۔ وہ وارث میر جو تمام خطرات سے کھیلتا رہا' بیٹے کے دکھ نے اس کی سسکیاں نکلوا دیں۔ وارث میر کی زندگی کا یہ اہم ترین موڑ تھا' لیکن پھر سارے زمانے نے دیکھا کہ وارث میر کچھ عرصہ مغموم اور پریشان رہنے کے بعد اپنی جنگ میں پھر مصروف ہو گیا اور اس کے قلم کی کاٹ اتنی بڑھ گئی کہ دشمن بوکھلا اٹھے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء سے لے کر جولائی ۱۹۸۷ء تک زندگی کے آخری آٹھ ماہ کے دوران وارث میر ہم سب سے بہت آگے نکل گیا۔ اس نے اپنے مورچے سے نکل کر دشمنوں پر دیوانہ وار حملہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کرار حسین نے وارث میر کی کتاب ''حریت فکر کے مجاہد'' کے دیباچے میں وارث میر کے متعلق لکھا ہے کہ ''یہ وہ آخری منزل ہے جہاں حریت فکر کا یہ مسافر چیخ چیخ کر بحث کرتا ہوا' لڑتا جھگڑتا' دوسروں کو اپنے اوپر ہنساتا ہوا' طنز کے نشتر برداشت کرتا ہوا' بہت سے دوست دشمن بناتا ہوا' دشمنوں کے کمینے حملوں سے زخمی ہوتا ہوا' رو رو کر ہنستا ہوا' آخری دم تک لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس سے پہلے اس کے جگر کو نوچا جا چکا تھا' مگر افسوس کہ اس کے جگر کو نوچنے والے عقاب نہیں بلکہ کوے اور چیلیں تھیں۔

وارث میر کی موت کے بعد منو بھائی نے اپنے ایک کالم میں سوال کیا تھا کہ ''کیا کوئی اور وارث میر بننے کی جرات کرے گا؟'' آج منو بھائی کا سوال میں دوبارہ دہرا رہا ہوں کیونکہ اردو صحافت کو وارث میر کی صورت ایک ایسے مجاہد کی پھر سے ضرورت آن پڑی

ہے جو قوم کو درپیش خطرات سے آگاہ کرے اور عوام دشمن قوتوں کے خلاف وارث میر کی طرح جنگ جاری رکھے۔ وارث میر کے موت پر میں نے اشعار کہے تھے انہیں پھر دہراتا ہوں۔

حق پرستو صاحب کردار وارث میر تھا
آمروں سے بر سر پیکار وارث میر تھا
اس کی تحریروں کے رہتے تھے ہم منتظر
سچ تو یہ ہے کہ حاصل اخبار وارث میر تھا
وقف تھا اس کا قلم انسانیت کے واسطے
اہل غم کا مونس و غمخوار وارث میر تھا
فکر اس کی اصل میں ملائیت کی تھی شکست
ذی نگاہ واقف اسرار وارث میر تھا
لفظ اس کا تیر تھا باطل کے سینے کے لیے
اہل حق کا قافلہ سالار وارث میر تھا
ظلم سہتا تھا نہیں کہتا تھا ظلمت کو ضیاء
آنسوؤں کو پی کے نغمہ بار وارث میر تھا
دوست تھا وہ بے مثال اور آدمی تھا بے نظیر
سر بسر جالب محبت پیار وارث میر تھا

وارث میر مجھ جیسے غریبوں کی بڑی عزت اور احترام کیا کرتے تھے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ حبیب جالب کبھی ختم نہیں ہو سکتا کیونکہ حبیب جالب جیسا مزاحمتی کردار ہر دور میں پیدا ہوتا رہے گا۔ مجھے وارث میر کے یہ الفاظ دہرانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کیونکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وارث میر کی جنگ ختم نہیں ہوئی۔ وارث میر پیدا ہوتے رہیں گے اور ان کی جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک مظلوم طبقوں کا استحصال ختم نہیں ہوتا۔

◆◆◆

حسن کی ذات عشق کی بات

بچپن ہی سے میری طبیعت میں ایک حسن پسندی تھی بچپن ہی میں اگر کہیں خوبصورت عورت نظر آتی تھی تو میرا دل فوراً اس کی طرف مائل ہو جاتا تھا۔ گاؤں سے ہی حسن پسندی میرے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔ دلی میں جب میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس وقت میری عمر چودہ سال کی ہو گی۔ مجھے کچھ یاد آتا ہے کہ وہاں چپڑاسی کوارٹرز تھے۔ میرے چچا بھی چپڑاسی تھے ان کو وہیں کوارٹر الاٹ ہوا تھا' جس میں ہم سب تھے۔ میرے بڑے بھائی مشتاق مبارک کو ابھی مکان نہیں ملا تھا۔ ہمارے ابا بھی وہیں جوتے کا کام کرتے تھے۔ ان کا سامان ایک سل ایک کوبہ (لکڑی کا ہوتا ہے) اور جوتا بنانے کے دوسرے اوزار لے کر ابا وہاں بیٹھے رہتے کلا بتو نکالتے رہتے تھے۔ کبھی کلا بتو نکلوانے کے لیے مجھے وہ چماروں کی خواتین کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں ایک پہاڑی خواتین رہتی تھیں۔ لانبا قد' سفید ساڑھی نیلی دھاری' کھڑاؤں پہنتی تھیں۔ ان کا سرخ رنگ تھا اور بے پناہ اچھی آواز تھی' وہ پہاڑی لوک گیت گایا کرتی تھیں۔ اس کی آواز میرے دل کو ایسا چھوتی تھی کہ میں اس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ میری والدہ مجھے آواز دیتی۔ "کیا تو وہاں بیٹھا رہتا ہے۔" وہ مجھے ڈانٹتی تھیں اور کہتی تھیں کہ میں وہاں مت بیٹھا کروں' لیکن میں والدہ سے نظر بچا کر پھر وہاں چلا جاتا تھا۔ وہ خاتون مجھے کہا کرتی۔ "چلے جاؤ' چلے جاؤ...... پھر آ جانا۔" اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ مجھ سے اچھا سننے والا اسے کوئی اور نہیں ملا۔ اسی لیے وہ مجھے سنا کر بہت خوش ہوتی اور میں بھی مسرور ہو جایا کرتا تھا۔ اب اسے آپ عشق کہہ لیں' فن کے ساتھ لگاؤ کہہ لیں۔ ایک شعر میں نے کہا تھا کہ

برسوں پہلے کوئی ملا تھا جس کی صورت یاد نہیں
لیکن اس کے سر اب تک کانوں میں رس ٹپکاتے ہیں

پھر میرے بھائی کو کوارٹر مل گیا۔ وہاں بنگالی لوگ زیادہ رہتے تھے۔ لانبے لانبے بال' مانگوں میں سیندور بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں' سیاہ چشم دوشیزائیں' رقص بھی کرتی تھیں' گاتی بھی تھیں۔ ان کو میں دیکھتا رہتا تھا۔ ان کے پاس بیٹھتا بھی تھا۔ ان کے ساتھ کسی فنکشن میں بھی چلا جاتا تھا۔ بیزجی کی ایک لڑکی تھی اس کا بھائی ہارمونیم بجاتا تھا۔ وہ رقص کرتی تھی۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں۔ ان کی شکلیں بھی میرے ذہن میں واضح نہیں ہیں۔ لیکن میرے مزاج میں حسن پرستی شامل تھی۔ اب تو

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

غالب نے بوالہوسوں کے خلاف بات کی ہے۔ ہمارا بوالہوسی شعار نہیں تھا۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں مافوق الفطرت بشر بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ طبیعت یہی تھی کہ اگر ہم نے کسی سے "عرض مدعا" کر دیا تو پتہ نہیں اس کا جواب کیا مل جائے؟ کوئی ناراض نہ ہو جائے۔ کوئی خفا نہ ہو جائے۔

شوق آوارگی میں کیا نہ ہوا
ایک تیرا ہی سامنا نہ ہوا
حرف مطلب نہ آ سکا لب پہ
مطمئن ہیں کوئی خفا نہ ہوا
اس کے آنچل کو چھو رہی ہے صبا
وائے قسمت کہ میں صبا نہ ہوا

وصل کی لذت

ہم سگئے زیادہ ہیں۔ وصل کی لذت سے آشنا نہیں ہوئے۔ چیک بک جس میں ہندسے لکھے ہوتے ہیں وہی ہماری رقیب رہی۔ اب وہ زمانہ نہیں کہ

تیرے کوچے ہر بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

یہ اس نظام کا جبر ہے کہ بازار میں رقص و سرود کی محفلیں جو نوابوں کی تسکین طبع کے لیے ہوتی تھیں۔ اسے "شاہی محلہ" کہہ دیا جائے یا کوئی بھی نام دیں جہاں یہ محفلیں جم سکتی تھیں اور کوچے میں کھڑے ہونے والی بات بھی ممکن نہ تھی۔ میرا تو خیال ہے کہ اس زمانے میں بھی کسی گلی میں کسی کے مکان کے سامنے کوئی کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ البتہ شاہی محلے میں کسی پنواڑی کی دکان پہ کھڑے "جلووں" کے نظارے لوٹ لینا اور بات ہے۔ ہم نے جب ہوش سنبھالا تو ایسی فضا میسر نہیں تھی کیونکہ چند پل گزرتے ہی لوگ پوچھنے لگتے کہ "میاں کس سے ملنا ہے؟" پھر جب آدمی ہجرت کر کے آیا ہو زخم نقل مکانی اس کے دل نے کھایا ہو تو روایتی عشق اسے

کہاں سوجھتا ہے۔ ہمیں تو ایک ایک دن کھانا نہیں ملتا تھا۔ چائے نہیں ملتی تھی۔ ہماری جوانی جاگتے ہوئے اور بھوک کاٹتے ہوئے اسی طرح گزر گئی۔ ایک عرصے تک خود کو کہیں ایڈجسٹ نہیں کر سکے۔ جوانی تقسیم کی نذر ہو گئی۔ تقسیم کے اثرات ہی ہم پر مرتب ہوئے۔ ہمارے ہاں عشق کا دور یک طرفہ ہو تو ہو ورنہ کوئی افسانہ نہیں بن سکا کہ میں ایسی کوئی کہانی یا داستان ہی بیان کر دوں' ہو سکتا ہے میں نے چاہا بھی ہو کہ میری ''وہاں'' شادی ہو جائے۔ یہی مفلوک الحال' غربت اور افلاس کی وجہ سے نہیں ہو پائی لیکن اس کو میں نے مسئلہ نہیں بنا لیا۔ میرا وہ مسئلہ نہیں ہے۔ ٹھیک ہے نہیں ہوا نہ سہی۔ جب میں نے حقوق انسانی سے عشق کیا۔ اس عشق سے بڑا عشق کوئی نہیں لگا۔ آزادی انساں اور آزادی بشر کے لیے جو میرے دل میں سوز و گداز اور تڑپ بیدار ہوئی اسی کی وجہ سے میں نے یہ تمام صعوبتیں جھیلی ہیں۔ یہ عشق مجھے تمام ''عشقوں'' سے عظیم تر لگا۔

سر سے ناطہ

گانے والوں اور گانے والیوں کا اپنا ایک الگ سحر ہوتا ہے۔ آواز کا ایسا جادو ہوتا ہے جو دل و دماغ پر طاری ہو جاتا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ نغمہ نگاروں اور گائیکوں کے لوگ مداح ہوتے ہیں کیونکہ یہ آواز کا Impression دلوں کو مسحور کر دیتا ہے۔ چاہے لاکھ زمانہ رستے میں دیواریں کھڑی کرے۔ اچھی آواز کی طرف لوگ خود بخود کھنچتے چلے جائیں گے۔ ملائیت اور بنیاد پرستوں کی مخالفت کے باوجود آواز کا جادو قائم ہے اور لوگوں کے دلوں پر چل رہا ہے۔ قرآن حکیم کو بھی جب قرات سے پڑھا جاتا ہے تو لوگ جھوم اٹھتے ہیں کیونکہ اچھی آواز میں قرات بھی متاثر کرتی ہے۔ مصر کے مشہور قاری باسط کا ایک زمانہ مداح ہے۔ ان کی آواز میں قرات کے ریکارڈ لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ عربی مغنیہ ام کلثوم کی آواز کا سکہ بھی دلوں پر رواں ہے۔ عرب دنیا میں گانے والوں کا بھی بڑا مقام ہے۔ اچھی آواز کی شاعری معاونت کرتی ہے۔ جب اور شعر مل جاتے ہیں تو پھر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے یہ دو آتشہ بات ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں آرٹسٹ خورشید کا ایک زمانہ مداح تھا۔ اس نے بڑے بڑے ہٹ گانے گائے تھے۔ اس کا اپنا ایک الگ رنگ اور آواز میں حسن تھا۔ ہم بھی اس کے مداحین میں سے تھے اس کا ایک گیت ''پنچھی باورا چاند سے پریت لگائے'' مجھے بہت پسند تھا اور اسے اسی طرح گنگنا لیا کرتا تھا اور بنگالی خواتین مجھ سے سنا کرتی تھیں کیونکہ ان کے ہاں تو گانا کلچر کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ باپ طبلہ بجا رہا ہے اور بیٹا باجا بجا رہا ہے۔ میں بنگالی کوارٹر میں اکثر جایا کرتا تھا۔ ان کوارٹرز کے ساتھ ہی ایک فوجی ڈپو تھا۔ بنگالیوں کے ہاں کبھی کبھار کوئی فوجی افسر بھی گانا سننے یا رقص دیکھنے آ جایا کرتا تھا۔ کسی افسر کو کوئی لڑکی پسند آ جاتی تو ان کی شادی بھی ہو جاتی تھی۔ ایسی ایک

دوشادیاں میں نے وہاں دیکھی ہیں۔ میں نے وہاں تیواڑپور میں دو جماعتیں ساتویں اور آٹھویں پاس کی تھیں۔ وہ مڈل تک ہی سکول تھا۔ جب سکول سے گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو میں فوجی ڈپو میں چالیس روپے ماہوار پہ کام کرلیا کرتا تھا۔ وہاں کریٹس بنتے تھے۔ جس میں بسکٹ بیف اور خشک راشن بھر کر ٹرکوں میں لادا جاتا اور وہ وار فرنٹ پر بھیجا جاتا تھا۔ فوجیوں کی عجیب حالت ہوتی کہ ان کے سامنے موت کھڑی ہوتی اور وہ جانے سے انکار بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے وہ کچھ Enjoyment بھی کرتے تھے۔ ان کے لیے ورائٹی شو بھی ہوتے تھے۔ وہاں صبح کے وقت اذانوں کی آوازیں کم آتیں اور گانے کی آوازیں زیادہ آتی تھیں۔

سا...... رے...... گا...... ما...... پا...... دھا...... نی...... ہر طرف سے سنائی دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرا سر سے ناطہ ہوا۔ بنگالی چاہے مسلمان ہو یا ہندو گانا ان کے کلچر کا لازمی جزو ہے۔ میرے کچھ شعر ہیں۔

اگر ہے تو بس حسن کی ذات برحق
اگر ہے تو بس عشق کی بات اچھی
در مے کدہ پر ملے شیخ صاحب
رہی آج ان سے ملاقات اچھی
سبھی بادہ خوار اٹھ گئے ہیں وہ جالب
کہ جن سے تھی شام خرابات اچھی

خورشید بیگم

میں خورشید کا بہت مداح تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ایک جگہ سیٹلمنٹ کا سلسلہ نہیں ہو رہا تھا۔ لوگ تتر بتر تھے۔ کوئی کہیں پڑا ہے تو کوئی کہیں ہے۔ خورشید بھی کراچی میں ہی منتقل ہوگئی تھی۔ ان کے شوہر لالہ یعقوب مذہبی سکالر غلام احمد پرویز سے متاثر تھے۔ ہماری ان کے ساتھ یاری ہوگئی تھی۔ ہم شام کو ان کے ساتھ ان کی کوٹھی کے لان میں بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔

مجھے یہ خواہش ہوئی کہ وہ میرا یار اصغر لودھرا جو خورشید کو خط لکھا کرتا تھا مجھے کہیں سے مل جائے تو ہم دونوں خورشید کے سامنے بیٹھ کر اس کا گانا سنیں یہ حسرت ہی رہی۔ ہم لالہ یعقوب سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اپنی بیوی سے ملوائیں ان کا گانا سنوائیں۔ یہ بات خلاف تہذیب تھی نہ ہی انہوں نے ہمیں ملوایا۔ میں نے حیدرآباد جیل سے بھی ریڈیو والوں کو لکھا تھا کہ خورشید کے گانے سنوائیں۔ ہم تو بچپن سے ہی جب ہماری عمر چودہ پندرہ سال ہوگی ان کے مداح تھے۔ اس وقت وہ نامور گلوکارہ اور ہیروئین تھیں۔ ظاہر ہے کہ ہم

خورشید کو اصغر لودھراں کی طرح خط نہیں لکھ سکتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اس کے گھر جاتے تھے اس کے شوہر کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل کر آ جاتے۔ شاید وہ کہیں اندر کمرے میں بیٹھی ہوں گی۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

کے ایل سہگل

کانن بالا کا بھی ایک منفرد رنگ تھا۔ اس کی آواز کے جادو کو بھی لوگ مانتے تھے۔ وہ بنگالن تھی اور اس کی آنکھیں بے حد حسین تھیں۔ ہمارا ایک یار فضل الرحمن ٹیپو تھا' وہ مسلم لیگی تھا اور پرانا نیشنلسٹ تھا۔ اس نے تحریک آزادی ہندوستان میں بھی حصہ لیا تھا۔ وہ سنایا کرتا تھا کہ ''میں کسی جیل سے فرار ہو کر بمبئی جا پہنچا اور سہگل سے ملنے چلا گیا۔ سہگل کے چوکیدار سے کہا کہ میں سہگل کا عزیز ہوں اور اس سے ملنا ہے۔ سہگل کو پتہ چلا تو اس نے کہا۔ ''ایہہ کہڑا میرا عزیز اے۔'' سہگل پنجابی میں بات کیا کرتا تھا۔ کے ایل سہگل اپنے زمانے کا بہت بڑا گائیک تھا۔ اداکار بھی تھا۔ اس نے چوکیدار سے کہا کہ کمرے میں ٹھہرا دو۔ دو تین دن بعد چوکیدار سے کہا کہ میرے رشتے دار کو بلاؤ۔ میں گیا۔ سہگل نے مجھ سے پوچھا کہ تم کہاں سے میرے رشتے دار ہو؟ میں نے کہا کہ میں ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہوں' ظاہر ہے آپ بھی آزادی کے خلاف نہیں ہوں گے۔ اس لحاظ سے میں آپ کا عزیز ہوں۔ سہگل نے کہا' بات تو صحیح کر رہا ہے اور اس نے نوکر کو آواز دی۔ ''اوئے اس کے لیے گلاس لاؤ' شراب لاؤ' ان کو پلاؤ' میرا عزیز ہے اور آزادی پسند ہے۔'' میں نے کہا' حضور میں تو پیتا ہی نہیں۔ کہنے لگے۔ ''جا دفع ہو جا' تو میرا کہاں کا رشتہ دار ہے جا دوڑ جا...... چلا جا'' اور مجھے نکال دیا۔ دو تین بعد بلایا اور پھر میرے لیے گلاس منگوایا۔ میں اس ڈر سے پی گیا کہ کہیں پھر مجھے نہ نکال دیں۔ میں تو انڈر گراؤنڈ تھا۔ سہگل کا ہی ایک ہم عصر تلوک کپور تھا۔ دونوں کی آپس میں دشمنی تھی۔ فضل الرحمن ٹیپو مضبوط آدمی تھا' سہگل کا باڈی گارڈ بن گیا تھا۔ فلم ''دیوداس'' سہگل کی بڑی ہٹ فلم تھی اس میں سہگل ہیرو تھا۔ اس نے ''دکھ کے دن بیتے نا ہیں'' بھی اس فلم میں گایا تھا۔ فلم میں جو بیل گاڑی چلا رہا ہوتا ہے وہ یہی فضل الرحمن ٹیپو تھا اس نے مونچھیں لگائی ہوئی تھیں اور بیل گاڑی میں پیچھے بیٹھا سہگل گا رہا ہے۔ ٹیپو نے بتایا کہ میں سہگل کے ساتھ یہ فلم دیکھنے سینما گیا اور جب وہ گیت شروع ہوا تو سہگل نے وہیں گانا شروع کر دیا۔ لوگوں کی توجہ فلم کی طرف کم اور پیچھے بیٹھے ہوئے سہگل کی طرف ہو گئی جو اپنے موڈ میں گائے جا رہا تھا۔ سینما کے باہر بھی ڈیڑھ لاکھ آدمی اکٹھے ہو گئے' انہیں پتہ چل گیا تھا کہ سہگل آیا ہوا ہے۔ آج کل تو فلم اسٹارز کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ ان کو دیکھنے کے لیے دو سو آدمی بھی اکٹھے نہیں

ہوتے ہیں۔ ہمارے ''ستارے'' کرکٹ کھیلنے چلے جاتے ہیں۔ ستاروں کو ''ستارہ'' ہی رہنا چاہیے' ہاتھ میں نہیں آنا چاہیے۔ جب بار بار نظر آؤ گے تو کون پوچھے گا۔ یہ فلم آرٹسٹ کی شان تھی کہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اتنے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ سہگل کو بڑی مشکل سے پولیس نے اس جم غفیر سے باہر نکالا تھا۔

فضل الرحمن ٹیپو نے بتایا کہ ''کانن بالا کو میں دور ہی دور سے دیکھا کرتا تھا' میری یہ تمنا تھی کہ میں اس کے پاس بیٹھوں۔ چنانچہ میں نے ایک دن سہگل سے کہا کہ بھا پاجی مجھے کانن بالا سے ملوا دیں۔ وہ مجھے لے گئے اور کانن بالا سے بنگالی زبان میں کہا کہ ''یہ بڑا آزادی پسند ہے جیل سے بھاگ کر آیا ہے' تمہارا مداح ہے۔ اسے کچھ سنا دو۔'' جب کانن بالا نے گانا شروع کیا تو فضل الرحمن ٹیپو اس سے لپٹ گیا کہ ہائے کیا گا رہی ہے۔ اسے چھوڑ ہی نہیں رہا تھا۔ سہگل نے جب یہ صورت حال دیکھی تو پنجابی میں اسے کہا۔ ''اوئے چھوڑ دے....... اوئے الو کے پٹھے....... حرام زادے....... اوئے چاند کو گرہن لگ گیا....... چھوڑ دے....... جان دے.......'' وہ گانے سے اس قدر مسحور ہو گیا تھا کہ اس نے لپٹ کر داد دی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ آواز اچھی ہے اور صورت بھی اچھی تو پھر کلام دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ اس نے فیروز پور روڈ پر ربڑ کا کارخانہ لگایا ہے۔ اس کا بیٹا اس کو چلا رہا ہے۔ ٹیپو ایک انڈی پنڈنٹ آدمی ہے جو اپنی محنت سے بنا ہے۔ نور خان کا ایک جلسہ بھی اس نے کرایا تھا۔ ہم بھی وہاں گئے تھے۔ اس جلسے میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لڑائی جھگڑا ہو گیا تھا۔

کشور ناہید

فریدہ خانم کے فن کا بھی میں مداح ہوں۔ جب میری پچاسویں سالگرہ کا اہتمام کشور ناہید نے کیا تو اس میں بہت سارے لوگوں نے شرکت کی۔ اس تقریب میں صادقین نے میرے بارے میں ایک رباعی پڑھی۔ ''ابھی دس برس ہیں سٹھیانے میں''

بڑے اہم لوگ شریک ہوئے تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جب میں ہال میں داخل ہوا تو سب لوگ میرے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ ''یہ کمالات'' کشور ناہید کے ہی تھے۔ اس نے لوگوں کو ''حکم'' دیا کہ سب لوگ حبیب جالب کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ کشور ناہید کی یوسف کامران سے شادی میں نے ہی طے کرائی تھی۔ یوسف کامران کے بہنوئی نے مجھ سے پوچھا کہ ''کشور ناہید کیسی لڑکی ہے؟ ہمارا لڑکا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے'' تو میں نے کہا تھا کہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے اور بہت پڑھی لکھی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ یہ شادی بہت اچھی رہے گی۔ باقی باتیں آپ نظر انداز کر دیں کیونکہ ''میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی'' والی بات ہے۔ ان کے بہنوئی میرے کہنے سے مان گئے اور ان کی شادی ہو گئی۔ کشور ناہید سے ہمارے تعلقات

بڑے پرانے ہیں۔ جب وہ کالج کی طالبہ تھیں۔ تب سے ان دونوں سے ہی ہمارے تعلقات تھے۔ وہ ایک اچھی شاعرہ ہے۔ ریڈیو پر گیتوں کے نشر ہونے سے پہلے تعارف کے سلسلے کی کشور ناہید نے جو طرح ڈالی وہ آج تک مقبول ہے۔ وہ اچھی منتظمہ بھی ہے۔

فریدہ خانم

میری پچاسویں سالگرہ کی تقریب بھی کشور ناہید کے زیر انتظام تھی۔ وہاں بہت سے لوگوں نے تقاریر کیں اور مضامین پڑھے۔ شاعروں نے نظمیں پڑھیں۔ سلیم شاہد مظفر وارثی اور دوسرے شاعروں نے نظمیں پڑھی تھیں۔ جب تمام لوگ کھڑے ہو گئے تو میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو پچھلی قطار میں بیٹھی تھی وہ بے حد خوش تھی۔ کیونکہ ہم پر خوشی کے لمحات بہت کم آئے ہیں۔ ہم بھی خوش ہوئے کہ چلو کوئی لمحہ خوشی کا ہمیں بھی ملا۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی تو اس میں ڈھائی یا تین آدمی شامل تھے۔ ایک دری سی بچھی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی سوئم پر لوگ آئے ہوئے ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ اتنے لوگ آ گئے ہیں تو میں نے سوچا کہ میری بیوی آج ''جشن شادی'' ہی سمجھ لے لیکن برا ہو فریدہ خانم کا اس نے غزل گائی اور گانے کے بعد وہ مجھ سے بغل گیر ہو گئیں۔ اس بغل گیری کو میری بیوی نے دیکھ لیا اور جب میں تمام لوگوں سے مل چکا تو میں نے دیکھا کہ میری بیوی اپنی سیٹ پر نہیں تھی۔ میں حیران ہوا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ میں گھر پہنچا تو وہ بہت غصے میں تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے آج تو تمہیں خوش ہونا چاہیے تھا۔ میں نے تمہارے چہرے پر خوشی کے آثار بھی دیکھے تھے۔ کہنے لگی وہ کون عورت تھی جو تم سے بغل گیر ہوئی تھی۔ میں نے کہا وہ فریدہ خانم تھی جس نے میری غزل گائی تھی اور اس سے بغلگیر ہونے کے لیے پچاس سال کا ہونا پڑتا ہے۔ میری بیوی میری طرح سادہ سی ہے۔ مجھ سے بھی کم پڑھی لکھی ہے اس لیے مشرقی خاتون ہونے کی حیثیت سے وہ ایسی باتوں کو محسوس کرتی تھی۔ پھر میں نے فریدہ خانم سے جا کر کہا کہ ایک ''جپھی'' میری بیوی سے بھی ڈال لینا تا کہ بیلنس ہو جائے۔ اس نے حامی بھر لی۔ دوحہ میں بھی میرے اعزاز میں ایک تقریب تھی۔ اس میں بھی فریدہ خانم کو بلایا گیا تھا۔ وہاں وہ ڈھائی تین گھنٹے تک بیٹھ کر میرا کلام سنتی رہیں۔ جب میرا فنکشن ختم ہوا تو فریدہ خانم نے مجھے داد دی کہ آج آپ نے بہت اچھا کلام پڑھا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے اگر پتہ ہوتا آپ بیٹھی ہیں تو میں اتنی دیر ترنم سے پڑھ نہ پاتا۔ کیونکہ آپ ملکہ غزل ہیں۔ ایک صاحب وہاں دوحہ میں فوٹو گرافر ہیں ان کا نام راشد ہے۔ وہ وہاں آنے والے فنکاروں کو سونے کا تمغہ یا دوسری ایسی کوئی چیز ضرور دیا کرتا تھا۔ لتا منگیشکر کو بھی دیا۔ میرے گلے میں بھی اس نے سونے کا ایک میڈل ڈالا اور فریدہ خانم کے گلے میں مجھ سے میڈل ڈلوایا۔ یہ بڑی خوبصورت یادیں ہیں اور بدستور میرے دل و دماغ میں تابندہ ہیں۔

استاد اللہ رکھا کا داماد ایوب اولیا بھی موسیقی کا بڑا قدر دان اور موسیقی کا علم رکھنے والا تھا۔ بڑا اچھا ''ستویا'' تھا۔ ایک دفعہ وہ

میرے پاس فریدہ خانم کا پیغام لے کر آیا کہ "کبھی ہمارے گھر آئیں۔" لیکن میں اس لیے ان کے ہاں نہ گیا کہ آخر کار وہ ایک بہت بڑے صنعت کار کی بیوی تھیں اور میرا مزاج کچھ ایسا ہے کہ میں سرمایہ داروں سے مکس اپ ہونا اچھا نہیں سمجھتا اس لیے میں نہیں گیا۔ تعلقات کی نوعیتیں یہ ہوتی ہیں کہ میرے تعلقات ایک خوبصورت انداز میں لوگوں کے ساتھ رہے۔ میں نے حد فاصل بھی رکھی ہمیشہ احترام پیش نظر رہا۔

ملکہ ترنم

شوکت حسین رضوی کے صاحبزادے اکبر حسین رضوی بڑے ذہین آدمی ہیں۔ انہوں نے ایک فلم "ماں بہو اور بیٹا" بنائی تھی۔ اس فلم کے لیے میں نے گیت لکھے تھے۔ حسن لطیف اس کا موسیقار تھا۔ حسن لطیف ایک صاحب طرز موسیقار تھا۔ اسے دھن بنانا آتا تھا اور وہ شعر کو خوب سمجھتا تھا اور شاعری کو نغمے میں ڈھالنے کے فن سے واقف تھا۔ وہ شاعروں کے بہت نزدیک رہتا تھا۔ میں نے بہت سی فلموں میں حسن لطیف کے ساتھ گانے لکھے ہیں۔ فلم "ماں بہو اور بیٹا" کے لیے یہ گیت لکھے تھے۔

نندیا روٹھ گئی انکھین سے ترس گیا میرا پیار
پھر پردیس نہ جانے دوں گی آ جا اک بار

لوگ دیکھیں نہ تماشا مری تنہائی کا
نغمہ فریاد میں ڈھل جائے نہ شہنائی کا
رات کٹتی نہیں اے چاند یہ ان سے کہنا
دن گزرتا ہے تڑپ کر تیرے سودائی کا
سب کہیں گے کہ مجھے چھوڑ گئے ہو تنہا
کیسے دیکھوں گی یہ عالم تری رسوائی کا
ساجنا پیار کیا ہے تو نبھاتے رہنا
دے نہ طعنہ یہ زمانہ تجھے ہرجائی کا

ایک اور گیت یہ تھا۔

اب اور پریشاں دل ناشاد نہ کرنا
وہ یاد بھی آئیں تو انہیں یاد نہ کرنا
بے درد زمانے کو ہے ہنس دینے کی عادت
ہر اک سے بیاں درد کی روداد نہ کرنا
پھر اشک بہانے کی اجازت بھی نہ ہو گی
دل خون بھی ہو جائے تو فریاد نہ کرنا
چاہت پہ ہماری کہیں الزام نہ آئے
بھولے سے کبھی شکوۂ صیاد نہ کرنا

حسن لطیف ایک روشن خیال آدمی تھا وہ ہمیشہ ترقی پسندوں کے ساتھ رہا۔ اکبر حسین رضوی کے توسط سے میڈم نور جہاں نے میری دعوت کی تھی اور میرے مزاج کے مطابق دعوت تھی۔ ملکہ ترنم نے میرا کلام مجھ سے سنا اور ٹیپ بھی کیا تھا۔ آتے ہوئے نور جہاں نے میری جیکٹ کی جیب میں ایک ہزار روپے ڈال دیئے۔ میں نے کہا' یہ کیوں دے رہی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ میں آپ کو نہیں دے رہی آپ کے بچوں کے لیے دے رہی ہوں۔'' اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نور جہاں کا دل درد سے معمور ہے۔ یہ پیسے مجھے نور جہاں نے دیئے تھے اس لیے میں نے فخر کے ساتھ قبول کر لیے۔ میں جب چلنے لگا تو میری جیب سے وہ نوٹ باہر نظر آ رہے تھے۔ نور جہاں نے پھر کہا کہ ''سنبھال کے رکھئے کہیں گر نہ جائیں۔'' بہر کیف نور جہاں کے حسن کا جواب ہی نہیں اور اس کا حسن اس کی آواز ہے کسی مغنیہ نے اس جیسا نہیں گایا۔ اس کا اپنا جداگانہ انداز ہے۔ ہماری فلم انڈسٹری میں نور جہاں کا کوئی بدل پیدا نہیں ہوا ہے۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ہم اس کے مداح چلے آ رہے ہیں۔ نور جہاں کی آواز ہر دل کی آواز بن گئی ہے جیسے دل کی دھڑکن ہوتی ہے۔ کوئی بھی اس کے اس حسن سے انکار نہیں کر سکتا۔ سب ہی اس کے پرستار ہیں اور نور جہاں کی تحسین کرتے ہیں۔ میں نے ملکہ ترنم کے بارے میں یہ نظم کہی تھی۔

ہجوم یاس میں جوت آس کی تری آواز

ہم اہل درد کی ہے زندگی تری آواز
لبوں پہ کھلتے رہیں پھول شعر و نغمہ کے
فضا میں رنگ بکھیرے یونہی تری آواز
دیار دیدہ و دل میں ہے روشنی تجھ سے
ہے چہرہ چاند مدھر چاندنی تری آواز
ہو ناز کیوں نہ مقدر پہ اپنے نورجہاں
تجھے قریب سے دیکھا سنی تری آواز
نہ مٹ سکے گا ترا نام رہتی دنیا تک
رہے گی یوں ہی سدا گونجتی تری آواز

ہمارے ایک دوست ہیں ڈاکٹر صلاح الدین اکبر بڑے اچھے ادیب ہیں۔ علامہ غلام احمد پرویز سے متاثر ہیں۔ جو ہمارے بھی دوست تھے وہ ہم سے غزل سنا کرتے تھے۔ اس میں ساز و آواز بھی شامل ہونا چاہیے ڈاکٹر صلاح الدین اکبر ہمارا اور ہماری فیملی کا علاج مفت کیا کرتے تھے۔ اس نے مجھ سے فرمائش کی کہ "آپ ہمیں میڈم نورجہاں کا گانا سنوائیں۔" میں نے وہیں سے میڈم کو فون کیا۔ اس نے کہا "فوراً آ جاؤ۔ میں نے اسے بتایا کہ اس وقت ایک ڈاکٹر میرے پاس بیٹھا ہے جو آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ کہنے لگی۔ "میں بیمار نہیں ہوں۔" جب میں نے اسے بتایا کہ وہ صرف آپ سے ملنا چاہتا ہے تو اس نے کہا "اسے بھی لے آؤ۔ میں اور صلاح الدین اکبر میڈم کے ہاں چلے گئے وہ اپنا ناول "انسان" بھی لے گئے۔ اسی پر انہوں نے "ایشیا کی عظیم مغنیہ نورجہاں کے لیے" لکھ کر نورجہاں کو وہ کتاب دی۔ جب میں نے نورجہاں سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کے بڑے مداح ہیں انہیں کچھ سنائیں تو وہ بولیں کہ "میرا گلا بیٹھا ہوا ہے پہلے اسے کھڑا کریں تو کچھ سناؤں۔" اس کے باوجود نورجہاں نے کچھ سنایا۔ جسے سن کر ڈاکٹر ممنون ہوا خوش بھی ہوا۔ نورجہاں نے میرے بے شمار گیت گائے ہیں۔ مجھے اس دن بہت خوشی ہوئی جس دن انہوں نے میرا یہ نغمہ گایا۔

ظلم رہے اور امن بھی ہو
کیا ممکن ہے تم ہی کہو

ہنستی گاتی روشن وادی
تاریکی میں ڈوب گئی
بیتے دن کی لاش پہ اے دل
میں روتا ہوں تو بھی رو
ظلم رہے اور امن بھی ہو

ہر دھڑکن پر خوف کے پہرے
ہر آنسو پر پابندی
یہ جیون بھی کیا جیون ہے
آگ لگے اس جیون کو
ظلم رہے اور امن بھی ہو

اپنے ہونٹ سیئے ہیں تم نے
میری زباں کو مت روکو
تم کو اگر توفیق نہیں تو
مجھ کو ہی سچ کہنے دو
ظلم رہے اور امن بھی ہو

میں نے ان سے کہا کہ میڈم اب تک آپ نے جتنے نغمے گائے ہیں وہ بہت اچھے ہیں۔لیکن اس گیت کی فضا کچھ اور ہے یہ ان سے الگ ہے، یہ ایک انٹرنیشنل تھاٹ کا گانا ہے۔ میں نے یہ لکھا بھی تھا کہ اس کا تھاٹ روس اور چین کے تناظر میں ہے۔ جب نور جہاں بیمار ہوئیں۔ امریکہ میں ان کا آپریشن تھا۔ یہاں ایک جلسہ ہوا تھا۔ میں نے میڈم کے لیے لکھی ہوئی وہی نظم اس جلسے میں پڑھی تھی۔ وہ اب تک بہت اچھا گا رہی ہیں۔ ہمارے پاکستان میں تو ان سے اچھا گانے والی کوئی نہیں ہے۔ ہندوستان میں لتا

منگیشکر کے بعد بھی کچھ خواتین شرف قبولیت حاصل کر رہی ہیں۔ بہرکیف اس کا بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ جواب ان کا بھی نہیں۔

بڑے غلام علی خان

بڑے بڑے عظیم المرتبت گائیکوں سے بھی ہماری ملاقات رہی ہے ان میں بڑے غلام علی خان' بڑے مبارک علی خاں' برکت علی خاں' نزاکت علی' سلامت علی اور فتح علی خاں تھے۔ ایک بار لائلپور میں نے دیکھا بڑے غلام علی خاں' مبارک علی اور فتح علی خاں کے گھر کے سامنے بڑے پلنگ پر سردیوں کے موسم میں لیٹے ہوئے تھے۔ میں انہیں قریب جا کر دیکھتا رہا کہ اتنا عظیم گائیک لیٹا ہوا ہے۔ تان سین کا بھی نام سنا تھا کہ وہ بہت بڑا گائیک تھا۔ ان کے گانے سے بارش ہو جاتی تھی اور چراغ جل جاتے تھے۔ یہ روایت ہم نے سن رکھی تھی۔ ان کو تو نہیں دیکھا سنا تھا۔ بڑے غلام علی خاں سو رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ خراٹے لیتے ہوئے بھی ان کے ایک تان نکل گئی۔ وہ "فنا فی الفن" تھے۔ انہیں سوتے میں بھی فن کا خیال رہتا اور جاگتے میں بھی فن کا ہی پاس تھا۔ نور جہاں بھی ان کی شاگرد ہوئی تھی۔ ماسٹر عنایت حسین نے جب دو راستے کا گانا ریکارڈ کیا تو اس کے افتتاح کے لیے بھی بڑے غلام علی خاں آئے تھے۔ یہ گانا سلیم رضا نے گایا تھا۔

"بنا کے میرا نشیمن جلا دیا تو نے"

ماسٹر عنایت حسین جو بہت بڑا موسیقار ہے جس کے فن کا سب لوہا مانتے ہیں۔ وہ بھی بڑے غلام علی خان کے ہی شاگرد ہیں۔ ان کو بڑے غلام علی خان کہتے تھے۔ "اوئے عنایتے! یہ گانا تو نے بنایا ہے۔" وہ اس گیت کی طرز سن کر بڑے خوش تھے۔ ہماری ان سے دوستی ہو گئی تھی' حالانکہ وہ بزرگ تھے مگر آدمی بڑے باذوق اور سخن فہم تھے۔ جب بمبئی میں ہم گئے تو ہم مجروح سلطانپوری کے مہمان تھے۔ میں نے مجروح سے کہا کہ میں نے بڑے غلام علی خان سے ملاقات کو جانا ہے تو وہ کہنے لگے۔ "یار ان سے میرا تعارف کرا دو۔" ہم ان کے پاس چلے گئے۔ میں نے ان سے کہا "خان صاحب یہ مجروح سلطانپوری ہیں۔" خان صاحب مسکرائے۔ اور ایسا ہی تاثر دیا جیسے انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی ہو۔ میں نے پھر کہا۔ "خاں صاحب! یہ بھی آپ کو زحمت دیں تو ان سے بڑی رعایت برتی ہے۔" پھر وہی مسکراہٹ۔ انہوں نے اپنے ایک پرانے ساتھی عنایت علی خان کو جو ان کے پاس ہی بیٹھے تھے اشارہ کیا کہ ہارمونیم کھولو اور پھر ہمیں ایک گھنٹے تک گانا سنایا۔ میرا خیال ہے کہ وہ گانا ایک لاکھ روپے سے بھی زیادہ قیمت تھا۔ دوسرے دن مشاعرہ تھا۔ میں نے ان سے کہا۔ "خان صاحب کل آپ مشاعرے میں ضرور تشریف لائیں۔ شاعر کے ترنم سے تو آپ متاثر نہ ہوں گے لیکن اس کے شعر سے ضرور محظوظ ہوں گے۔" دوسرے دن ہم ان کو خود مشاعرے میں لے کر گئے۔ وہ

مشاعرے سنتے رہے اور داد دیتے رہے۔

دوسری دفعہ جب میں ان کے ہاں گیا تو خان صاحب بیمار تھے۔ میں نے دیکھا ان کے پاس پارلیمنٹ کے ممبر آ رہے ہیں اور حال احوال پوچھتے ہیں کہ کوئی پریشانی ہو تو ہمیں حکم دیں۔ میں نے ان ممبرز سے کہا کہ "ان کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے کیوں خان صاحب؟" میں نے خاں صاحب سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا۔ "نہیں نہیں ٹھیک ہو رہا ہے۔ خیال رکھ رہے ہیں۔" اور جب وہ پارلیمنٹ کے ممبرز گئے تو میں نے ان سے کہا یہ جگہ جہاں آپ رہتے ہیں۔ ٹھیک ہے لیکن آپ ان ممبرز سے کم از کم یہ تو کہیں کہ آپ کے ساتھ کچھ زیادہ سلوک نہیں ہو رہا ہے لیکن وہ یہی کہے جا رہے تھے کہ "اچھا ہو رہا ہے۔" وہ ایک مرنجان مرنج شخصیت تھے۔ کلکتہ کی بات ہے کہ ایک فنکشن میں خواتین نے بڑے غلام علی خان کے پاؤں میں بال بچھا دیے تھے۔ وہ ان کے اوپر سے گزر کر اسٹیج تک پہنچے تھے۔ انہیں انڈیا میں سب سے بڑا سول اعزاز "پدم بھوشن" ملا تھا۔ پاکستان سے وہ دلبرداشتہ ہو کر چلے گئے تھے۔ زیڈ اے بخاری نے انہیں ناراض و نالاں کر دیا تھا۔

زیڈ اے بخاری

بخاری صاحب کو زعم تھا کہ وہ بھی گائیک ہیں اور راگ بنا لیتے ہیں۔ جو ان کی خوشامد کرنے والے لوگ تھے وہ ان کو بہت سراہتے۔ بخاری صاحب اچھے براڈ کاسٹر تھے۔ اچھے شاعر بھی تھے۔ بہت سی ان میں خوبیاں اور محاسن تھے لیکن ایک خامی یہ تھی وہ سمجھتے تھے کہ وہ گائیک اور لے کار بھی ہیں۔ سر تال بھی جانتے ہیں راگ بھی بنا لیتے ہیں۔ یہ ان کے اندر بہت بڑی خامی تھی۔ ایک دفعہ رمضان خان سے کہنے لگے۔ "میرا سر لگاؤ۔" رمضان خان اس وقت باجا بجا رہے تھے۔ وہ دلی والوں میں سے تھے۔ بڑے گائیک تھے۔ وہ بولے "حضور میں آپ کا سر لگا رہا ہوں۔" بخاری صاحب پھر چلائے۔ "رمضان خان میرا سر لگاؤ۔" رمضان خان نے باجے میں سے سر نکالا اور ان کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔ "حضور یہ اپنے پاس رکھ لیں۔ جب جی چاہے لگاتے رہیں۔" بخاری صاحب بہت ناراض ہوئے اور ان کو معطل کر دیا۔ رمضان خان انہیں ڈیڑھ دو مہینے تک مناتے رہے پھر ان کی کار کے سامنے لیٹ گئے تب انہیں بخشا گیا۔ اب بڑے غلام علی خان یہ تو نہیں کر سکتے تھے ناں...... وہ اس قدر یہاں سے دلبرداشتہ ہوئے تھے کہ پاکستان چھوڑ کر بھارت چلے گئے۔

ملکہ موسیقی

ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم بہت بڑی گائیکہ تھیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ امرتسر میں ایک کلب میں بیٹھے تھے۔ وہاں مجھے ایک لالے نے کہا تھا۔ ''حضور کشمیر لے لو ہمیں روشن آراء دے دو۔'' ملکہ الزبتھ کا یہاں دورہ تھا۔ وہ مال روڈ سے گزر رہی تھیں۔ روشن آراء بیگم کافی ہاؤس کے قریب کھڑی تھیں۔ انہیں کہیں جانا تھا۔ ہم ان کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ ہم ملکہ الزبتھ کو نہیں دیکھ رہے۔ ہم ملکہ موسیقی کے حضور کھڑے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ وہ بھی یہاں ناراض و نالاں تھیں۔ کیونکہ یہاں وہ پذیرائی ہی نہیں ملتی ہے۔ ایک صاحب ہیں میں ان کا نام نہیں لیتا۔ بہت امیر آدمی ہیں اور اپنے آپ کو ماہر موسیقی کہتے ہیں گلبرگ میں رہتے ہیں۔ ایک دفعہ گاتے ہوئے روشن آراء نے سمجھا کہ وہ ان کے سرتال کو بہت اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ جب ملکہ موسیقی نے ایک جگہ پر اپنا فن دکھایا تو ان کو اسی صاحب نے داد نہ دی بلکہ دوسری جگہ پر داد دی۔ روشن آراء اس پر بہت دلبرداشتہ ہوئیں۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر گا رہی تھیں پھر اس کی طرف دیکھ کر گانا بند کر دیا۔

مبارک علی خاں، برکت علی خاں

آزاد ویکٹر جو قائداعظم کے ڈرائیور تھے وہ ہمارے بھی دوست تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ کراچی کے مشاعرے میں ہمیں سنا تھا۔ وہ بڑے خوش ہوئے۔ میں ۱۹۵۶ء سے پہلے جب لاہور آیا تو ان کے ساتھ ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ مرتضیٰ جیلانی ''دو آنسو'' فلم کے ڈائریکٹر تھے ان کے ساتھ انور کمال پاشا ہوا کرتے تھے جو حکیم احمد شجاع کے بیٹے تھے۔ حکیم صاحب خود ایک بلند پایہ ادیب تھے اور فلم کی کہانی پر ان کا نام ہی لکھا جاتا تھا۔ مرتضیٰ جیلانی علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے ایم اے تھے۔ بڑے سخن شناس اور سخن فہم تھے۔ فیض صاحب کے بھی بڑے مداح تھے۔ انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ ایک مصرع ہے۔ اس پہ گرہ لگاؤ۔

''اک حال میں ہمیشہ رہتا نہیں زمانہ''

اتفاق سے فوراً ہی دوسرا مصرعہ ہو گیا۔

''کیوں ہنس رہی ہے دنیا سن کر مرا افسانہ''

اس کے تین شعر تھے۔ فلم ''دو آنسو'' کے لیے لکھا تھا۔ پیسے تو مجھے ملے تھے لیکن نام طالب بدایونی کا دیا گیا تھا۔ وہاں پر بڑے مبارک علی خاں سے ملاقات ہوئی تھی جو بڑے غلام علی خان کے بڑے بھائی تھے۔ بہت خوبصورت آدمی تھے۔ فلم ''سوہنی کمہارن'' میں انہوں نے مہینوال کا رول ادا کیا تھا۔ وہ بہت بڑے گائیک تھے۔ وہ فلم ''دو آنسو'' کے میوزک ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے یہی غزل استاد برکت علی خان کو گانے کے لیے دی لیکن ان کی آواز فلم کے لیے موزوں ثابت نہ ہوئی۔ حالانکہ وہ غزل کے بہت بڑے

گائیک تھے اور جتنے بھی غزل گانے والے ہیں۔ جیسے غلام علی مہدی حسن اختری بائی فیض آبادی رفیق غزنوی...... یہ سب برکت علی خان کے رنگ میں گاتے تھے۔

غلام علی

غلام علی غزل کا بہت بڑا گائیک ہے۔ ایک دفعہ ہم اس ''بازار'' میں گانا سننے گئے۔ شاد امرتسری جو بڑے اچھے شاعر تھے۔ ریڈیو پاکستان کے اے آر ڈی تھے۔ وہ رات کو ''عالم خاص'' میں ہوا کرتے تھے۔ ہم دونوں وہاں چلے گئے۔ ہم نے ایک جگہ گانا وانا سنا۔ اب میرے پاس پیسے ختم ہو گئے۔ شاد تو اپنی ''کیفیت'' کا سہارا لیے ہوئے تھے وہ تو کچھ دے نہیں رہے تھے۔ میں نے اس سے کہا ''چلو چلیں پیسے ختم ہو گئے ہیں۔'' یہ غلام علی وہاں مغنیہ کے پیچھے باجا بجایا کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ''آپ میری بھی غزل سن لیں۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا بھئی تو بھی سنا لے۔'' میں نے ساتھ ہی شاد امرتسری کو پکارا۔ ''شاد اب تو یہ بھی غزل سنانے لگا اب تو چل۔'' لیکن جب اس نے غزل شروع کی تو مجھے بہت اچھا لگا۔ اس کو میں نے داد دی اور جو بیس روپے بچ گئے تھے اس کی نذر کیے اور غلام علی سے کہا کہ ''یہ شاد امرتسری ریڈیو پاکستان لاہور کا اے آر ڈی ہے' صبح اسکے پاس چلے جانا۔'' غلام علی صبح ریڈیو چلا گیا۔ دن کے گیارہ بجے کا عمل ہو گا۔ شاد امرتسری نے اسے پہچانا ہی نہیں اور کہا کہ پرسوں ترسوں آ جانا دیکھیں گے۔ غلام علی نے پھر کہا کہ ''آپ اور جالب صاحب رات کو ہیرا منڈی آئے تھے۔'' یہ سننا تھا' شاد فوراً اچھلے اور کہا۔ ''جالب! ہاں یاد آ گیا۔'' فوراً اسے اندر لے گیا' اس کا گانا سنا اور اس کی بہت تعریف کی تو غلام علی ریڈیو میں ان ہو گئے اور پھر چل سو چل۔ اسی لیے میرے فنکشنوں میں وہ بغیر پیسوں کے گاتا ہے صرف سازندوں کا خرچہ لیتا ہے۔

سلامت علی خاں

سلامت علی خاں بڑے گائیک ہیں مگر خوشامد کی طرف زیادہ مائل رہتے ہیں تو مجھے ہمیشہ کہتے کہ ''کون سے کوڑ کام میں پڑ گئے ہو۔'' کیونکہ انہیں سیاست سے کوئی علاقہ نہیں ہے اور نہ ہی ایسی جبلت یا شعور ان کے پاس ہے اسی لیے میں انہیں جواب دیتا کہ ''آپ کو اس کا پتہ نہیں ہے کہ ہم آپ کی عزت میں اضافہ کرانا چاہتے ہیں اس طرح کہ آپ شہنشاہ ایران کے ساتھ کھانا بھی کھائیں ان کے سامنے صرف گانا ہی نہ سنائیں۔ ہم آپ کو برابر کے حقوق دلانا چاہتے ہیں۔'' ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آیا کرتی تھی۔ بہر حال اس سے ان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ گانے والوں کے فن کا تو میں قائل ہوں لیکن ان کے مزاج میں خوشامد بھی بہت

ہوتی ہے جیسے وہ آمروں اور درباروں کے دل بہلانے کی ''چیز'' ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا فن عوام کے لیے ہونا چاہیے۔ جیسے نصرت فتح علی خان آج کے دور میں بہت سارے فلاحی مقاصد میں بھی اپنے فن کے ساتھ پیش پیش رہتے ہیں عمران خان کینسر ہسپتال کے لیے انہوں نے اچھی خدمت انجام دی ہے۔

غزلیں گانے والوں کا میں احترام کرتا ہوں مگر غزل کی شاعری بڑے طبقے کو جھنجھوڑتی نہیں ہے بلکہ غزل ان کی تسکین کا سامان بنتی ہے۔ بڑے گانے والے یا گانے والیاں ہمارے غصے میں کہے ہوئے شعر جب گاتے تھے تو ان کا بھرپور وار نہیں ہوتا تھا' تو پھر میں نے غزل کو تیاگ دیا۔

اس شہر خرابی میں غم عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

شعر اپنی جگہ اچھا ہے۔ بڑی اچھی غزل ہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے بھی یہ غزل سنی تھی اور بہت پسند کی تھی۔ مگر وہ جو ''میں نہیں مانتا'' والی نظم ''دستور'' ہے اس میں جو Negation ہے' انکار کرنے کی جو قوت ہے' اس نظام کو رد کرنے کی بات' وہ غزل میں نہیں آتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ غزل جیسی صنف تمام خیالات کے لیے ناکام ہے۔ غالب کے ہاں غزل بڑی توانا شکل میں ملتی ہے۔ فیض صاحب نے غزل اور نظم یکساں طور پر بہت بہتر کہی ہیں۔

خواجہ خورشید انور

خواجہ خورشید انور کا میں بہت مداح تھا' وہ متحدہ ہندوستان کے بہت بڑے موسیقار تھے۔ ایک تو وہ بے پناہ پڑھے لکھے آدمی تھے اور انہوں نے باقاعدہ میوزک سیکھا تھا اور اس کی تھیوری سے بھی واقف تھے اور بہت اچھے شاعر تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ فیض صاحب نے اپنی پہلی غزل جو اپنی ''محبوبہ غزل'' کو بھیجی تھی وہ خواجہ خورشید انور کی لکھی ہوئی تھی یعنی وہ فیض صاحب سے پہلے شاعر تھے اور پھر وہ بڑے موسیقار ہو گئے اور فیض صاحب بڑے شاعر ہو گئے۔ خواجہ صاحب ایک فلم ''مرزا صاحباں'' بنا رہے تھے' انہوں نے بلوایا۔ اس فلم کے ڈائریکٹر داؤد چاند تھے۔ ڈائریکٹر نے مجھے سچوایشن دی تو میں نے اس پر کچھ مکھڑے کہے۔ ایک مکھڑا یوں تھا کہ

چاند گہنا گیا جل بجھی چاندنی
اب کہاں روشنی دل پر غم چھا گیا

پہلے بھی کسی شاعر نے لکھا تھا کہ "چاند ایسے ہے" تو داؤد چاند نے اس کو ٹھکرا دیا تھا۔ داؤد چاند شعر کم ہی سمجھتے تھے۔ اردو زبان بھی نہ جانتے تھے ان کا تلفظ بھی غلط تھا۔ وہ شام کو سام کہتے تھے جب ایکٹر سام دہراتا تھا۔ تو وہ کہتے "نہیں اپنا سام بولو ہمارا سام مت بولو۔" خواجہ خورشید انور نے مجھ سے کہا کہ "آپ میرے گھر آیئے گا' بیٹھیں گے اور لکھیں گے تو ہو جائے گا۔" اب میں ان کی یہ بات اس وقت نہیں سمجھ سکا۔ اس وقت ہماری شاعرانہ انا عروج پر تھی۔ ہم نے سوچا ہم کیوں ان کے گھر جائیں۔ ہم نہیں گئے اس لیے ان کے ساتھ گیت نگاری کا سلسلہ شروع نہ ہو سکا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہاں بیٹھ کر لکھنا پڑتا ہے۔ پھر اسے دھن سے ملانا پڑتا ہے اور کئی کئی دفعہ مکھڑے لکھنے پڑتے ہیں تا کہ سچوایشن پرفٹ ہو جائیں اور طرز بھی اچھی کمپوز ہو جائے تو وہ گیت Approve ہوتا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں بعد میں آئی۔ جب حمید اختر نے فلم "پرائی آگ" بنائی تو میں نے خواجہ خورشید انور کے ساتھ دو گانے لکھے تھے۔

اے شام بتا کہ سحر کتنی دور ہے
آنسو نہیں جہاں وہ نگر کتنی دور ہے
دم توڑتی نہیں ہے جہاں پر کسی کی آس
وہ زندگی کی راہ گزر کتنی دور ہے
اب کوئی پاسباں نہ کوئی اپنا ہم سفر
منزل ہماری کس کو خبر کتنی دور ہے
کوئی پکارتا ہے تجھے کب سے اے خدا
کہتے ہیں تو ہے پاس مگر کتنی دور ہے

یہ گانا مہدی حسن نے گایا تھا اور دوسرا نسیم بیگم نے گایا۔

مل گئی آسماں سے زمیں
مجھ کو آتا نہیں ہے یقیں
یوں زمانے میں ہوتا نہیں

میرے ان گیتوں کی طرزیں خواجہ خورشید انور نے بہت خوبصورت بنائی تھیں وہ مزاجاً بڑے اچھے آدمی تھے۔ ان کے اندر بڑا

سوز اور دکھ تھا۔ نہ ختم ہونے والا دکھ جو نغموں میں ڈھل گیا تھا۔ ان کے دل میں دکھ پلتا رہا اور وہ اچھا میوزک دے گئے۔ زمانہ انہیں کبھی نہیں بھلا سکے گا۔ ایسے لوگ لافانی ہوتے ہیں۔ میں کیمپ جیل میں تھا۔ کیمپ جیل کے نزدیک ہی شمع سینما کے عقب میں ان کا گھر تھا۔ جیل میں ایک آدمی مجھ سے ملاقات کے لیے آیا تو میں نے سگریٹ کا پیکٹ پھاڑ کے اس پر خواجہ خورشید انور کو لکھا کہ ''دس گولڈ لیف کے پیکٹ بجھوا دیں۔ حبیب جالب' کیمپ جیل۔'' جب وہ ان تک گیا تو ایک گھنٹے کے بعد دس پیکٹ گولڈ لیف کے لے کر آ گیا۔ خواجہ خورشید انور بہت بڑے موسیقار اور صاحب دل انسان تھے۔

ریاض شاہد

آغا جی اے گل بہت محنت سے ترقی کر کے ایور نیو اسٹوڈیو کے مالک بنے تھے۔ وہ بھی بڑے سخن فہم تھے اور بڑے اچھے منتظم تھے۔ ایک دفعہ ریاض شاہد نے مجھ سے کہا کہ فلم ''زرقا'' اگر ہٹ ہو گئی تو میں تمہیں پانچ ہزار روپے انعام دوں گا۔ ''زرقا ہٹ ہو گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ لاؤ بھئی۔ کہنے لگا۔ ''ابھی میرے پاس نہیں ہیں' ہوں گے تو دے دوں گا۔'' میں نے آغا جی اے گل سے کہا آپ ریاض شاہد سے کہیں کہ یہ پیسے میں حبیب جالب کو دیتا ہوں تمہارے پاس جب ہوں تو تم مجھے دے دینا۔ اس طرح مجھے پانچ ہزار مل جائیں گے ورنہ یہ نہیں دے گا تو آغا صاحب نے اس سے کہا کہ ''میں حبیب جالب کو پانچ ہزار دے رہا ہوں' تو مجھے دے دینا۔'' ریاض شاہد بولا۔ ''نہیں جلسہ کر کے دوں گا۔'' میں نے کہا' یہ نہیں دے گا اور جلسہ بھی نہیں ہوا۔ اس نے پیسے بھی نہیں دیے اور اللہ کو پیارا بھی ہو گیا۔ پیسے آسانی سے وہ کسی ایکٹر کو نہیں دیا کرتا تھا۔ وہ تو دباؤ ڈال کر اس سے چھین لیتے تھے۔ سیٹ پر چلے جاتے تھے اور کہتے ''اوئے ریاض شاہد ادھر آؤ۔'' اب نیلو سیٹ پر ہے تو وہ پریشان ہو جاتا تھا کہ اب یہ بے عزتی کر دیں گے اور ہم اس کی بے عزتی کرتے تھے۔ وہ پھر پوچھتا ''اچھا کیا بات ہے؟'' ہم کہتے ''تین سو روپے نکالو۔'' وہ کہتا ''لو تین سو...... اور ایور نیو اسٹوڈیو سے تین میل دور چلے جاؤ۔'' وہ طبعاً ایک اچھا آدمی تھا۔ اس نے بہت اچھی فلمیں بنائیں۔ ریاض شاہد بڑا Quick آدمی تھا۔ وہ سیٹ پر ہی سین اور مکالمے تک بدل دیتا تھا۔ وہ ایکٹروں کی پرواہ نہیں کرتا تھا اپنی تحریر کی پرواہ کرتا تھا۔ اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا کہ اس کی کہانی اور مکالموں میں جان ہے اور ان کے بل پر ایک کامیاب فلم بن سکتی ہے۔

رشید عطرے

رشید عطرے ہمارے بہت ذہین اور منفرد اسٹائل کے میوزک ڈائریکٹر تھے۔ وہ ایک مکھڑے کی متعدد شکلیں پیش کر دیتے

تھے۔ بمبئی میں وہ آر سی بورال کے شاگرد تھے۔ وہ ایک کلچرڈ آدمی تھے۔ ادیبوں اور شاعروں میں بیٹھا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ میں نے فلم موسیقار، قیدی، گلفام اور زرقا میں کام کیا تھا۔ زرقا کا یہ گانا تو بہت مشہور ہوا تھا۔

تو کہ ناواقف آداب غلامی ہے ابھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
آج قاتل کی یہ مرضی ہے کہ سرکش لڑکی
سر مقتل تجھے کوڑوں سے نچایا جائے
موت کا رقص زمانے کو دکھایا جائے
اس طرح ظلم کو نذرانہ دیا جاتا ہے
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
دیکھ فریاد نہ کر، سر نہ جھکا، پاؤں اٹھا
کل کو جو لوگ کریں گے تو ابھی سے کر جا
ناچتے ناچتے آزادی کی خاطر مر جا
منزل عشق میں مر مر کے جیا جاتا ہے
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

ماسٹر عنایت حسین

ماسٹر عنایت حسین بہت اچھے میوزک ڈائریکٹر تھے۔ فلم ”دوراستے“ میں یہ گانا میں نے لکھا تھا جس کا میوزک انہوں نے دیا۔

بتا کے میرا نشیمن جلا دیا تو نے
مری وفا کا مجھے یہ صلہ دیا تو نے
کیا تھا عہد وفا تو نے جو محبت میں
مجھے تو یاد ہے اب تک بھلا دیا تو نے
فضا اداس نظر بے قرار دل ویراں

ہر اک چراغ تمنا بجھا دیا تو نے
زمانہ میری تباہی پہ مسکرائے گا
بھرے جہاں میں تماشا بنا دیا تو نے

ایک اور فلم ''سیما'' کے لیے میں نے ایک گیت لکھا تھا۔ رات کو ہی میں نے پورا گیت لکھ دیا اور انہوں نے اسے Approve کر دیا اور کہنے لگے کہ یہ صبح تیار ہو جائے گا۔ صبح جب گئے تو ماسٹر عنایت حسین کہنے لگے کہ ''جالب صاحب! یہ مصرع لمبا ہے' سلیم رضا سانس کہاں لے گا؟'' میں نے یہ کوئی کپڑا ہے جسے کاٹ دیا جائے۔ ان کے کہنے پر ہی ہم نے ایک رکن کم کر دیا۔

بھول جاؤ گے تم
کر کے وعدہ صنم
تمہیں دل دیا تو یہ جانا
بھول جاؤ گے تم

درد کا ہے سماں غم کی تنہائی ہے
جس طرف دیکھئے بے کسی چھائی ہے
آج ہر سانس پر ہو کے بے تاب دل
دھڑکنے لگا تو یہ جانا
بھول جاؤ گے تم

کیسے گزرے گی شب' کیسے ہوگی سحر
اب نہ وہ منزلیں ہیں نہ وہ ہم سفر
دیکھتے دیکھتے رہگذر رہگذر
اندھیرا ہوا تو یہ جانا

بھول جاؤ گے تم

چاند کو دیکھ کر ہو رہا ہے گماں
پھول کے رخ پہ چھائی ہو جیسے خزاں
مسکراتا ہوا میری امید کا
چمن لٹ گیا تو یہ جانا
بھول جاؤ گے تم

اب زمانہ کچھ اور ہے' وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ اس زمانے میں ایک ہی وقت میں میوزک ڈائریکٹر کے پاس ایک ہی فلم ہوتی تھی۔ اب میوزک ڈائریکٹر کے پاس بہت زیادہ فلمیں ہوتی ہیں اس لیے وہ آدھے گھنٹے میں پروڈکسن کر دیتے ہیں لیکن ان میں وہ معیار اور حسن نہیں ہوتا ہے جو پرانی فلموں کی پہچان ہوا کرتا تھا۔ ماسٹر عنایت حسین' خواجہ خورشید انور اور رشید عطرے جیسے موسیقار ایک مکھڑا لے کر اس پر سوچ بچار کرتے تھے اپنی تخلیقی قوتوں کا بھرپور استعمال کیا کرتے۔ ان کے ہاں تجربات بھی نظر آتے ہیں۔ وہ ہم سے گیت لے لیتے اور کئی دن اس پر سوچتے۔ مختلف طرزیں گیت پر بٹھاتے تھے۔ تب جا کر کسی گیت کا میوزک بنتا تھا۔

مہدی حسن

مہدی حسن ہمارے دوستوں میں سے ہیں کراچی میں مہدی حسن' احمد رشدی اور میں ایک حجام کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا اور نا ہنجار زمانے کی شکایتیں کیا کرتے تھے۔ احمد رشدی کو ایک فلم ''شکار'' میں گا نا مل گیا تھا تو مہدی حسن بہت ناخوش تھے اور کہتے ''دیکھو ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔'' میں اسے تسلی دیتا کہ تمہاری باری بھی آ جائے گی تم بھی اچھے گا ئیک ہو ایک فلم تھی ''مس ۵۶'' اس کا میوزک بابا چشتی دے رہے تھے۔ مہدی حسن مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے پاس آئے اور کہا کہ اس فلم کے گیت لکھ دو۔ میں نے ایک مکھڑے کے سولہ سترہ انترے لکھ دیئے۔ وہ گیت مہدی حسن نے گایا تھا۔ لیکن وہ لاہور آ کر ریاض شاہد کی ایک فلم سے فلموں میں ہٹ ہوا تھا۔ جب اس نے فیض صاحب کی غزل ''گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے'' کو فلم کے لیے گایا تھا۔ مہدی حسن سے ہمارے پرانے تعلقات آج تک استوار ہیں۔ کراچی میں میری ایک کتاب کی تقریب رونمائی تھی۔ میں نے مہدی حسن سے کہا کہ تمہیں آنا ہے اور ہم تمہیں پیسے نہیں دیں گے۔ نہیں آ ؤ گے تو پھر تیار ہو جانا۔ میں نے تو اسے ''تیار ہو جانا'' محبت میں ہی کہہ دیا تھا۔ وہ

ہماری تقریب میں آیا اور اس نے ہمارا کلام سنایا تھا۔ اس نے کوئی معاوضہ نہیں لیا تھا۔ پھر بھی اس کے سازندوں کو خوش کر دیا تھا۔ غلام علی بھی جب ہماری کسی تقریب میں آئیں تو انہیں معاوضہ نہیں دینا پڑتا وہ نہیں لیتے البتہ سازندوں کو دینا پڑتا ہے۔

استاد اللہ رکھا

ایوب اولیاء ہمارے دوست تھے۔ وہ علم موسیقی کو جاننے والے تھے اور انہیں خاصا گیان بھی ہو گیا تھا۔ اچھے سامع بھی تھے۔ موسیقاروں میں رہ کر وہ بہت کچھ موسیقی کے بارے جان چکے تھے۔ ان کی شادی استاد اللہ رکھا کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ لندن میں ایوب اولیاء کے گھر استاد اللہ رکھا سے دوبارہ ملاقات ہوئی تھی کیونکہ اس سے پہلے ان سے لاہور میں ملاقات ہو چکی تھی۔ انہوں نے میرا وڈیو کیسٹ بھی دیکھا ہوا تھا اور میرا کلام سنا ہوا تھا۔ انہوں نے میری کافی تعریف کی تھی لیکن میں ان کے فن کی کیا تعریف کروں' مجھے یوں لگتا جیسے استاد اللہ رکھا کے بعد اب کوئی طبلہ نہیں بجا سکتا' ان کا فن انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے اور وہاں سے آگے شاید ہی کوئی جا سکے۔ ویسے گنجائش تو رہتی ہے کوئی چیز کہیں ختم نہیں ہو جاتی' ارتقاء جاری رہتا ہے۔ ایجادیں جاری رہتی ہیں ان کی سترہویں سالگرہ بمبئی میں منائی گئی تھی۔ ایوب اولیاء لندن میں میرے پاس آئے اور کہا کہ "میں استاد اللہ رکھا کی سالگرہ پر بمبئی جا رہا ہوں' آپ کوئی پیغام تہنیت دینا چاہیں تو دے دیں۔" میں نے کہا کہ کل آنا چند شعر ہو جائیں گے اور وہ لے جانا۔" اس دن صبح حسب معمول ہائیڈ پارک گیا' وہاں میں نے استاد اللہ رکھا پر یہ نظم کہی تھی۔

ایک عالم کو تو نے مسخر کیا
راج استاد تو نے دلوں پہ کیا
سننے والوں نے بے ساختہ داد دی
تال کو تو نے اس طرح ازبر کیا
تو گریزاں رہا بحث و تحسین سے
پیار سے تو نے میدان فن سر کیا
تجھ تیرے واسطے گرم و سرد ایک سے
تو نے اپنا نام خود کو لٹا کر کیا
ترے کردار و گفتار لے میں رہے

جو کہا تو نے وہ زندگی بھر کیا
پیار مذہب ترا دین انسانیت
تجھ سے مل کر یہ محسوس اکثر کیا
انگلیوں کو تری یونہی چومے جہاں
تاقیامت رہے تیرا سکہ رواں

ایوب اولیاء میری آواز میں یہ نظم ٹیپ کر کے اپنے ساتھ بمبئی لے گئے اور انہوں نے وہاں استاد اللہ رکھا کی سالگرہ کی تقریب میں یہ نظم سنا دی۔ لوگوں نے وہاں بہت Appreciate کیا۔ استاد اللہ رکھا نے شکریے کے طور پر ہمیں ایک بہترین کرتہ پاجامہ بھیجا۔ یہ کسی عظیم آرٹسٹ کی طرف سے میرے لیے بہت عظیم تحفہ تھا۔ استاد اللہ رکھا فیاض قریشی کے نام سے فلم کے لیے میوزک بھی دیتے تھے۔ فلم ''سبق'' میں ان کی کمپوز کی ہوئی دھنیں مقبول ہوئی تھیں۔ پاکستانی آرٹسٹ علاؤ الدین نے ہندوستان سے اپنی فنکارانہ زندگی کا آغاز کیا تھا۔ انڈین فلموں میں بھی انہوں نے کام کیا تھا۔ علاؤ الدین میوزک کے بڑے دلدادہ تھے۔ طبلہ انہوں نے استاد اللہ رکھا سے ہی سیکھا تھا۔ لتا منگیشکر اتنی بڑی فنکارہ ہیں کہ وہ کسی بھی گانے کی ریہرسل نہیں کیا کرتی ہیں۔ استاد اللہ رکھا نے لتا سے کہا کہ ''آپ آئیں اور گانے کی ریہرسل کریں۔'' لتا نے کہا کہ ''گانا ریکارڈ ہو جائے گا۔'' لتا منگیشکر نے انہیں ایک عام میوزک ڈائریکٹر سمجھتے ہوئے بہت Lightly لیا تھا یعنی ان کی پرواہ نہیں کی تھی۔ ریکارڈنگ والے دن لتا وہ گانا بار بار بھول جاتی تھی کیونکہ اس گیت کی کمپوزیشن میں استاد اللہ رکھا نے کچھ ایسی مرکیاں اور بل رکھے تھے جو ریہرسل کے بغیر نہیں گائے جا سکتے تھے چنانچہ لتا منگیشکر جیسی عظیم فنکارہ بھی انکے فن کی قائل ہو گئی تھی اور انہوں نے اس گیت کو باقاعدہ ریہرسل کرنے کے بعد ریکارڈ کرایا تھا۔ مجھے وہ گانا استاد اللہ رکھا نے خود گا کر سنایا تھا اور میں بہت حیران ہوا کہ وہ خود ایک اچھے گائیک بھی ہیں۔ استاد اللہ رکھا بڑی خوددار شخصیت کے مالک ہیں ان کو اپنے فن کی قدر و قیمت کا احساس ہے اور انہوں نے بڑی عزت نفس کے ساتھ اپنی زندگی گزاری ہے۔ جب میں کسی فنکار میں خودداری اور عزت نفس کا احساس دیکھتا ہوں تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ جب سلامت علی خان نے مجھ سے کہا تھا کہ ''تم کس گھٹیا کام میں پڑ گئے ہو۔'' تو میں نے اسے جواب دیا تھا کہ میں انسانی حقوق کی نگہداری کا جو کام کر رہا ہوں وہ تمہاری عزت کرانے کا ہی کام ہے۔ اب میں نے دیکھا ہے کہ نصرت فتح علی خان ''دی ریفارمر'' کے لیے گا رہے ہیں تو مجھے خوشی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ فنکاروں میں خودداری پیدا ہو اور انہیں دوسرے لوگوں جیسی عزت اور احترام ملے۔ موسیقاروں نے میرے اس کام کا

حوصلہ افزائی نہیں کی ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کو ایک مقام ملنا چاہیے۔ ان کے مقام و مرتبے اور عزت و مرتبے کے لیے بھی میں لڑتا رہوں گا۔ یہ میرا مشن ہے۔

نصرت فتح علی خاں

نصرت فتح علی خاں کو میں اس کے بچپن سے جانتا ہوں۔ میں بھی لائلپور میں رہا ہوں۔ وہاں انکے والد فتح علی خان اپنے بیٹے نصرت کو علی الصبح ساڑھے پانچ بجے کمپنی باغ میں لے جایا کرتے تھے وہاں اسے لے سُر موسیقی اور طبلے کا علم سکھاتے تھے۔ نصرت فتح علی خان اپنے آغاز سے ہی فن میں ماہر اور طاق ہو گیا تھا لیکن ان کے والد نے انہیں کبھی کہیں گانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ایک فنکشن میں لوگوں نے نصرت کو سنا اور حیران ہو گئے کہ اتنا بڑا گائیک اب تک کہاں تھا۔ نصرت فتح علی خان نے بہت ریاضت کی ہے۔ جب وہ اپنے والد صاحب سے فن سیکھتے تھے تو اسی دوران ان کو مٹھائی کھلاتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کا جسم کچھ موٹا ہو گیا۔ جاپان میں تو ان کو "دیوتا" مانا جاتا ہے شاید ان کی شکل و صورت بھی جاپان کے دیوتاؤں جیسی ہے۔ استاد بڑے غلام علی خان بھی فتح علی خان سے سیکھتے تھے۔ بڑے غلام علی خان اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ میں نے اسٹائل فتح علی خان سے سیکھا ہے۔ ایسا استاد موسیقی کی دنیا میں پھر نہیں آیا اور ان کے ہی بیٹے نصرت فتح علی خان بھی اپنے فن میں منفرد انداز رکھتے ہیں۔ لوگوں نے ان کی بہت پذیرائی کی ہے اور اس عزت افزائی کے وہ حقدار بھی تھے۔ وزراء اور وزیر اعظم تو آتے جاتے رہتے ہیں لیکن نصرت فتح علی خان جیسے فنکار روز روز پیدا نہیں ہوتے ہیں۔ نصرت فتح علی خان "دی ریفارمر" کے لیے جو مفت شو کر رہے ہیں تو یہ ایک خوشی کی بات ہے۔ ان کا جذبہ خدمت مجھے بہت پسند آیا ہے۔ یہی میرا مشن بھی ہے۔ میں یہی چاہتا ہوں موسیقاروں اور گائیکوں کا Status بہت بلند ہو اور ان کی عزت و تکریم کی جائے۔ بڑے غلام علی خان یہاں سے اس لیے چلے گئے تھے کہ ان کو وہ مقام کہیں نہیں ملا تھا جو کہ ملنا چاہیے تھا۔ وہ جب بھی پاسپورٹ کی انکوائری کے لیے تھانے جاتے تو بہت ہی نامناسب لفظوں میں ان کے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا اور وہ اپنے ایک جائز کام کے لیے وہاں بیٹھے رہتے تھے۔ وہ حکام کے اور یہاں کے رویوں سے تنگ آ کر ہندوستان چلے گئے تھے۔ روشن آراء نے بھی اسی وجہ سے گانا چھوڑ دیا تھا۔ یہاں پر کوئی حکومت جب کسی فنکار کی پذیرائی کرتی ہے تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ پریذیڈنٹ یا وزیر اعظم گانے کا شوق رکھتا ہے تو اختلافات کے باوجود مجھے اس کے ذوق پر مسرت ہوتی ہے۔ اب پتہ نہیں کہ انہیں خود موسیقی کا ادراک ہوتا ہے یا نہیں۔ موسیقی کا رشتہ سماعت سے ہے۔ کتابیں بھی اسی وقت متاثر کرتی ہیں جب ان میں درج واقعات ہمارے کسی تجربے کا حصہ بنتے ہیں اس لیے موسیقی کو عام معنوں میں روح کی غذا کہا جاتا ہے کیونکہ موسیقی ہمارے مزاج اور

ہماری حسیات پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ اچھی موسیقی اور ایک اچھی آواز انسان کی تہذیب نفس کرتی ہے اور یہی کام اعلیٰ فنون کا ہے جن میں شعر وادب پینٹنگز اور فلمیں بھی شامل ہیں۔ امیر خسرو موسیقی کے بہت بڑے آدمی تھے۔ خود شاعر بھی تھے ان کو لے اور سر کا بہت گیان تھا۔ ان کا نام شاعری اور موسیقی میں آج تک زندہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ موسیقی کے استاد مولانا عبدالسنان جامی بھی تھے جن کے ۴۴ آثار ادبی ہیں۔ یہ ایک علم موسیقی کا رسالہ ہے۔ وہ علم نجوم علم ریاضی اور تمام معروضی علوم سے بھی مستفید ہوتے تھے۔ بیشتر لوگوں کو موسیقی سے لگاؤ نہیں ہوتا ہے اس لیے اگر حکمران طبقے کو گانے بجانے سے رغبت ہے تو یہ ایک اچھا شگون ہے۔ جس کو یہ شوق نہیں ہوتا وہ پتھر کا آدمی ہوتا ہے۔ مولویوں کو خاص طور پر اس کا شوق نہیں ہے وہ گانے کو برائی سمجھتے ہیں اور ''غیر اسلامی فعل'' گردانتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم کیمپ جیل میں تھے تو وہاں جمیعت العلمائے اسلام (نورانی گروپ) کے مولوی سلیم اللہ ہوتے تھے۔ دوسرے مولانا اجمل خان تھے' مولوی سلیم اللہ میلے ٹھیلے کا آدمی تھا۔ ''کھلا ڈھلا'' مولوی تھا۔ جب ہم دونوں نے مولانا اجمل خان کو کوٹھڑی سے باہر نکالنا ہوتا تھا تو ریڈیو پر لتا کی آواز کو اونچا کر دیتے تھے۔ وہ لاحول پڑھ کر باہر چلا جاتا تھا اور اسے باہر ٹہلاتے رہتے تھے۔ پھر جب ہمیں اس پر ترس آتا تھا تو کہتے اب ''مولوی'' کو اندر لے آئیں اور اسے آواز دیتے تھے کہ ''اچھا مولانا لتا کی آواز بند کر دی ہے اب اندر آ جاؤ۔'' تو وہ آ جایا کرتے تھے۔ میں نے مولویوں کے ساتھ بھی جیل کاٹی ہے۔ ہمیں جمہوریت کے لیے اتحاد کرنا پڑتے ت ھے۔ اس قسم کے ایک اتحاد کے لیے ولی خان نے اپنی تمام پارٹی سے ووٹ لے کر دیا تھا اور ہمیں بڑا مطعون کیا گیا تھا لیکن آج شیخ رفیق احمد اتحاد بنانے کے لیے منصورہ جاتے ہیں۔

دین محمد قوال

دین محمد قوال اپنے زمانے ''دلیپ کمار'' تھا۔ اس کی بڑی شہرت تھی اور بڑی پذیرائی ہوتی تھی جب وہ آ جاتا تھا تو لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ آ گیا ہے۔ اس لیے اسے ایک مکان کی چھت پر لے جا کر سب کو اس کا چہرہ دکھایا جاتا تھا کہ وہ آ گیا ہے وہ وہیں اعلان کرتا کہ ''بھائیو میں آ گیا ہوں اور شام کو قوالی ہوگی۔'' اس کے ریکارڈ بہت مشہور تھے۔ دین محمد قوال نے جالندھر میں اپنی ایک بڑی کوٹھی بنائی ہوئی تھی۔ وہ اکثر اپنی کوٹھی سے باہر ایک کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا اور اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا تھا۔ اگر کوئی امیر آدمی بھی اس کے سامنے سے گزرتا تھا تو وہ اسے سلام نہیں کرتا تھا بلکہ اسے گھورتا رہتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی اس میں بہت زیادہ انا تھی وہ بڑے بڑے بدمعاشوں سے لڑتا جھگڑتا تھا۔ ایک دن دین محمد قوال ایک کوٹھے پر گانا سننے کے لیے گیا۔ وہ گانا سن رہا تھا کہ وہاں شہر کا ایک بہت بڑا بدمعاش آیا۔ گانے والی نے گانا بجانا بند کر دیا۔ دین محمد قوال نے اس سے پوچھا کہ ''تم نے گانا بجانا کیوں بند کر دیا۔''

کہنے لگی۔ ''چپ چپ' وہ آ گئے ہیں۔'' ''وہ کون آ گئے ہیں؟'' دین محمد نے پوچھا۔ ''میں آ گیا ہوں اوئے توں کون ایں؟'' وہ بدمعاش بولا۔ ''یہ دین محمد قوال ہیں۔'' اس گانے والی نے جواب دیا۔ بدمعاش کہنے لگا۔ ''اوئے مراثی تینوں پتہ نہیں میں کون آں؟'' دین محمد قوال نے اس بدمعاش کو پکڑ لیا اور کہا۔ ''تیرے بدمعاش کی بہن کو........'' اور اس کو الٹا کر دیا۔ وہ معافیاں مانگنے لگ گیا تو دین محمد نے اسے سیدھا کیا اور وہ درست ہو گیا بلکہ بعد میں دونوں دوست بھی ہو گئے تھے۔ اس بدمعاش نے کہا کہ ''میں نے ایسا خوفناک گویا کبھی نہیں دیکھا۔'' دین محمد قوال خاصا تگڑا آدمی تھا۔ اس کا باپ بھی ایسا ہی تھا وہ باتیں سنایا کرتا تھا کہ ''میرا باپ بڑا بہادر انسان تھا۔''

عزیز میمن

''احباب حبیب جالب'' اس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی کہ ایک ایسا پلیٹ فارم بنایا جائے جہاں ادبی' تہذیبی اور سیاسی سرگرمیاں جاری رکھی جا سکیں۔ مجاہد بریلوی سابق جنرل سیکرٹری اور عبدالحمید چھاپڑا سابق صدر پریس کلب کراچی کے توسط سے عبدالعزیز میمن سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میری سالگرہ کی تقریب میں تشریف لائے تھے۔ انہیں ''احباب حبیب جالب'' کا صدر بنا لیا گیا تھا۔ اس مجلس میں اس دور کے تمام اپوزیشن لیڈر بھی شامل تھے۔ اعتزاز احسن' ملک محمد قاسم' فتح یاب علی خان' معراج محمد خان اور ملک مختار اعوان بھی شریک ہوتے تھے۔ ''احباب حبیب جالب'' کے تحت کتابوں کی تقاریب رونمائی' کلچرل اور گیت سنگیت کے پروگرام بھی ہوئے۔ یہی اس کے مقاصد تھے۔ عبدالعزیز میمن درد دل رکھنے والے ایک نیک سیرت انسان ہیں۔ ان کو پی پی کی طرف سے ایم این اے کے لیے ٹکٹ بھی ملا تھا لیکن وہ ایک بنک میں اہم عہدے پر فائز ہیں اس لیے وہ یہ الیکشن نہ لڑ سکے۔ اس لیے یہ ٹکٹ ان کے بھائی کو مل گیا تھا اور وہ تھوڑے ووٹوں سے ہی ہارا تھا۔ عبدالعزیز میمن کے رویہ ہمارے ساتھ دوستانہ اور سرپرستانہ رہا ہے۔ ''احباب حبیب جالب'' پروڈکشن کے تحت دو فلمیں ''کالے چور'' اور ''درندگی'' بنی تھیں۔ جن کے گیت میں نے لکھے تھے۔ فلم بھی کلچرل سرگرمیوں کے زمرے میں ہی آتی ہے اس لیے ''احباب حبیب جالب'' کے تحت یہ فلمیں پیش کی گئیں۔ عزیز میمن نے میری بیٹی کی شادی پر زیورات کا ایک سیٹ دیا تھا۔ میری بیٹی کی شادی پر تمام اپوزیشن لیڈر آئے تھے۔ عزیز میمن نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے تشریف نہ لا سکیں بعد میں ایک تقریب کے دوران محترمہ بے نظیر صاحبہ مجھ سے ملیں تو انہوں نے مجھ سے معذرت کی کہ وہ مصروفیت کی وجہ سے بیٹی کی شادی پر نہ آ سکیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ کا خط بھی مل گیا تھا اور آپ کی سیاسی مصروفیات جو کہ ملک و قوم کے مفاد میں ہیں وہ زیادہ اہم ہیں۔ اس معاشرے میں جہاں اسٹیٹس

روپے پیسے سے بنا ہو محترمہ بے نظیر بھٹو کا یاد رکھنا اور معذرت کرنا بہت بڑا کردار ہونے کی دلیل ہے اور ان کے بلند مرتبت ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔

''احباب حبیب جالب'' کے قیام کا مقصد یہی تھا کہ کہیں نہ کہیں جمہوریت پسندوں کا اجتماع ہوتا رہے اور آزادی تحریر و تقریر کا چراغ جلتا رہے۔ میری ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں چوہدری اعتزاز احسن نے ایک گھنٹے تک تقریر کی تھی اور تمام آمرانہ نظام کی دھجیاں بکھیر دی تھیں اور میرا مقصد بھی یہی تھا۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد یہ بھی تھا کہ اگر کوئی ادارہ اجتماع کرنے کی جرات نہیں کرتا یا جلسوں کے انعقاد کے لیے ہی کوئی ہال نہیں ملتا تو کیوں نہ ایک اپنا ہی ادارہ بنا لیا جائے جس کے زیر اہتمام یہ سرگرمیاں جاری رکھی جا سکتی ہیں۔ ''احباب حبیب جالب'' نے ''کالے چور'' فلم بنائی۔ اس کی تھیم یہ تھی کہ موجودہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام میں مراعات یافتہ لوگوں کے جرائم ڈھکے چھپے رہتے ہیں۔ بیوروکریسی بھی ان کا ساتھ دیتی ہے' ان کے جرائم کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ انصاف کا حصول مشکل بنا دیا جاتا ہے۔ عدل جہانگیری کی طرح جیسے اس کی زنجیر رات کو ہلائی جا سکتی تھی اور بادشاہ آ جاتا تھا ہمارا مقصد بھی یہی تھا کہ عدالت چوبیس گھنٹے کھلی رہے تاکہ انصاف حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے اور بے گناہ لوگوں کو زندگی سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں اور ذہنی اذیت نہ پہنچے۔ یہ فلم ''کالے چور'' کی تھیم تھی۔ یہ فلم بہت کامیاب ہوئی' لوگوں نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ سنسر بورڈ والوں نے اس فلم کو سنسر کرنے میں پس و پیش کیا تھا اور پہلے اسے لاہور کے لیے ناقابل نمائش قرار دیا۔ ہم نے بھاگ دوڑ کی تو اسے اجازت مل گئی۔ سنسر بورڈ کو بھی پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ بورڈ کے ارکان وسیع القلب اور زیادہ پڑھے لکھے ہونے چاہئیں۔ ان کا فلم کی تکنیک کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ دنیا بھر میں جو فلمیں بن رہی ہیں وہ بھی ان کی نظروں کے سامنے سے گزری ہوں تو انہیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ اچھی فلم کیا ہوتی ہے۔ آج فلم کا میڈیا بہت موثر اور کامیاب ہے اس لیے سینما نے بہت ترقی کر لی ہے جبکہ پاکستان میں فلم کے پیچھے رہ جانے کی بنیادی وجوہات میں سنسر بورڈ اور معاشرتی رویے قابل ذکر ہیں۔ بہرحال ہمارے کچھ دوستوں نے ہماری رہنمائی کی تھی اور انہی کی عنایت سے ''کالے چور'' تمام ملک میں ریلیز ہو گئی۔

تنویر نقوی

اردو گیت کو حفیظ جالندھری نے شہرت دی اور رواج کیا ہے۔ اس حوالے سے حفیظ جالندھری کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ گیت نگاری میں تنویر نقوی بہت بڑا نام ہے۔ اس نے بمبئی جا کر مدھوک کو منظر سے ہٹایا ہے۔ یہ اس کا بڑا کمال ہے۔ اس کا مشہور زمانہ

گیت ہے۔

آواز دے کہاں ہے
دنیا میری جواں ہے
چلنے کو اب فلک ہے
تاروں کا کارواں ہے
آ رات جا رہی ہے یوں
جیسے چاندنی جا رہی ہے

تنویر نقوی ایک ایسا شاعر تھا جیسے وہ فلم کے گیت لکھنے کے لیے ہی پیدا ہوا تھا۔ وہ فارسی دان تھا۔ غزل بھی لکھتا تھا۔ اس کے کئی گیتوں میں فارسی ترکیبیں ہیں۔ تنویر نقوی اٹھک لکھنے والا آدمی تھا۔ اکثر وہ ہم سے باتیں کر رہا ہوتا اور گانا بھی سوچتا جاتا۔ اس کے گیتوں میں لفظ سیدھے سادے ہیں۔ سامنے کے لفظوں کو وہ ایسا پروتا تھا کہ بہت ہی خوبصورت گیت بن جاتا تھا۔ تنویر نقوی نہایت شریف النفس اور مخلص دوست تھا۔ دلجیت مرزا بھی ہمارے ملتان کے دوستوں میں سے ہیں۔ کافی ہاؤس میں دلجیت مرزا' اسلم پرویز اور سب اکٹھے شامیں گزارا کرتے تھے۔ مرزا' تنویر نقوی کا بھی دوست تھا لیکن بغیر معاوضے کے ہی لکھوانے کی کوشش کرتا تھا۔ تنویر نقوی چونکہ ایک بامروت آدمی تھا' اس لیے وہ مرزا کو دیکھ کر کانپنے لگتا تھا کہ ''وہ آ گیا ہے اور میں انکار نہیں کر سکتا۔'' اس لیے وہ اس سے چھپا چھپا پھرا کرتا تھا۔ تنویر نقوی کے ہاں بمبئی میں سب لوگ جا کر رہتے تھے۔ علاؤالدین' طالش سب وہاں رہتے تھے۔ تنویر نقوی گانے لکھ کر کماتا تھا اور لوگ اس کے ڈیرے پر پڑے رہتے تھے۔ وہ خدمت گزار آدمی تھا۔ اپنے دوستوں کی خدمت کرتا رہا۔ بمبئی میں اس کا گھر ''پناہ گاہ'' بنا ہوا تھا۔ ہماری اس کے ساتھ دوستی پاکستان میں آ کر ہوئی تھی۔ آخری ایام میں جب وہ بہت بیمار تھے تو میں انہیں لے کر شیخ رفیق کے پاس گیا تھا کہ ان کا علاج کراؤں اور دیکھ بھال کروں مگر اس کی دیکھ بھال نہیں ہوئی۔ اسے عام ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ان دنوں حنیف رامے وزیر اعلیٰ ہوا کرتے تھے۔ انہیں ایک چٹ بھیجی تھی' وہ میٹنگ میں تھے۔ یہ بڑے لوگ جو ہوتے ہیں انہیں بڑی مصیبتیں ہوتی ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ میٹنگ میں ہوں۔ اس لیے کچھ نہ ہوسکا۔ حنیف رامے کے پرچے میں بھی ہم لکھا کرتے تھے' وہ ہمیں معاوضہ نہیں دیتے تھے کبھی کبھار سگریٹ کا پیکٹ دے دیا کرتے تھے۔ ''کارواں'' کے چوہدری عبدالحمید نے میری خواہش کے مطابق میری کتابوں ''برگ آوارہ'' اور ''سر مقتل'' کا ٹائٹل حنیف رامے سے بنوایا تھا۔ وہ پتہ

اچھے پینٹر ہیں' سیلف میڈ ہیں۔ بنیادی طور پر اچھی سوچ رکھنے والے آدمی ہیں۔ انکی خواہش ہے کہ صاف ستھرا معاشرہ پیدا ہو وسیع المطالعہ ہیں۔ ان کا تعلق ادب کو پھیلانے والے لوگوں سے ہے۔ چوہدری نذیر احمد کے ''سویرا'' کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔

سرفراز اقبال

سبط حسن ایک مکمل آدمی تھے۔ ان میں بہت زیادہ خوبیاں تھیں۔ باذوق خواتین کے ساتھ ان کا ربط ضبط تھا۔ ان کا یہ رویہ بھی دانشورانہ' سیکولر اور روشن خیالی کے ہی تابع تھا۔ سرفراز اقبال باذوق خاتون ہیں' ان کا ایک اچھا رویہ ہے۔ سبط صاحب شعر بھی اپنے رنگ اور انداز میں کہہ لیتے تھے۔ سرفراز اقبال کے لیے بھی انہوں نے ایک نظم لکھی تھی۔ انہوں نے ''دامن یوسف'' میں لکھا کہ ''فیض صاحب کی طرح تو نہیں لکھ سکتا۔'' فیض صاحب کے خطوط بھی سرفراز اقبال کے نام ''دامن یوسف'' میں شامل ہیں۔

سرفراز اقبال سے میرا تعارف اس طرح ہوا کہ اسلام آباد میں ''احباب حبیب جالب'' کے تحت میری کتاب کی تقریب رونمائی تھی۔ فہمیدہ ریاض کی صدارت تھی۔ ایک خاتون سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ تقریب کے اختتام پر اس خاتون نے مجھ سے آ کر کہا کہ ''کئی برسوں سے آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔''

میں نے کہا' بی بی میں نے آپ کو پہچانا نہیں' آپ کی تعریف؟

اس نے کہا کہ ''مجھے سرفراز اقبال کہتے ہیں۔''

نام تو میں نے سنا ہوا تھا' وہ ہمارے بزرگوں کی ''محبوب نظر'' تھی۔

میں نے اس سے کہا کہ یہ میری عزت افزائی ہے کہ آپ ہمارے بزرگوں کی ملنے والی ہیں اور آپ کو ہم سے بھی ملنے کی آرزو ہے۔ یہ تو آپ نے ہمارا مرتبہ بلند کر دیا۔

کہنے لگی کہ ''کل آپ میرے ہاں کھانا کھائیں۔''

میرے ساتھ مجاہد بریلوی بھی تھے۔ میں نے محترمہ سے کہا کہ ان کو بھی میرے ساتھ ہی رکھیں کیونکہ یہ بھی میرے ساتھ ہی کراچی سے چل کر یہاں آئے ہیں۔ ہم دونوں ایوب ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو سرفراز اقبال کا فون آ گیا کہ ''آپ سو تو نہیں گئے؟ آپ کل آئیں گے نا؟ .... میرے ہاں کھانا ہے۔ ضرور تشریف لائیے گا۔ بھول نہ جائیے گا۔''

میں نے کہا۔ ''جناب' میں نے وعدہ کر لیا ہے اب ضرور آؤں گا۔'' ایک بجے وہ خود ہی آ گئیں اور ہم کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئیں۔ مجاہد بریلوی اور زاہدہ حنا بھی میرے ساتھ تھیں۔ انہوں نے تصویریں وغیرہ کھینچیں۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ

ایک بہت ہی باذوق روشن خیال اور غیر روایتی قسم کی خاتون تھیں۔ ان کا چہرہ کوئی ایسا غیر معمولی تو نہیں تھا لیکن لگتا تھا کہ وہ حسن باطنی رکھتی ہیں۔ ان کی پذیرائی کرنے کے انداز سے وہ بڑے لوگوں کے دل کو بھا جاتی ہیں۔ ان کی خاطر تواضع سے میں بھی بہت متاثر ہوا تھا۔ بڑے لوگوں کے ان کے نام خطوط ''دامن یوسف'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ جب انہوں نے مجھ سے میرا ایڈریس مانگا تو میں نے دل میں کہا۔ ''جالب! اب تمہارا ڈاک خرچ بڑھ گیا۔'' لیکن میں نے ان کے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ میں جب دوبارہ اسلام آباد گیا تو سرفراز اقبال نے شکایت کی کہ ''آپ ہمارے ہاں نہیں آتے' فیض صاحب اکثر ہمارے ہاں آیا کرتے تھے اور یہیں رہا کرتے تھے۔''

◆◆◆

برگِ آوارہ

لندن

عارف اقبال بھٹی اور عابد حسن منٹو کی کوششوں سے جب میرا پاسپورٹ بحال ہوا تو کراچی کے دوستوں اقبال جعفری' عبدالحمید چھاپڑ' مجاہد بریلوی اور مصطفیٰ جتوئی کے توسط سے ہم لندن پہنچ گئے۔ لندن میں صبغت اللہ قادری' ان کی بیگم' شمیم احمد خان' مسعود بھائی' منیر ڈار اور بے شمار لوگ مجھے ایئر پورٹ پر لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میں صبغت اللہ قادری کے گھر ٹھہرا۔ اس نے میرے اعزاز میں ایک بڑی پارٹی کا اہتمام کیا' جس میں پچاس ساٹھ آدمی آئے تھے۔ ضیاء سرحدی' افتخار عارف' احمد فراز اور جلاوطن سیاسی ورکرز بھی تھے۔ وہیں یہ پروگرام طے ہوا کہ میرے اعزاز میں جلسہ کیا جائے۔ اس جلسے میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ رکھا گیا' البتہ خواتین کے لیے داخلہ مفت تھا۔ اس جلسے کی صدارت کے لیے بہت سارے نام آ رہے تھے۔ میں نے زہرہ نگاہ کا نام منتخب کیا اور انہیں صدارت دی گئی۔ اس جلسے میں ضیاء الحق کے عہد کی تمام اپوزیشن موجود تھی۔ جام صادق علی' غلام مصطفیٰ کھر' سردار مینگل' شیخ رشید' روزنامہ مشرق کے ایڈیٹر' روزنامہ نوائے وقت کے صحافی' لندن کے سکھ' ہندو اور پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اداکار دلیپ کمار کی بہن نے بھی اس جلسے میں شرکت کی۔ میرا ایک بہت پرانا دوست سعید بالم جو پینٹر ہو گیا تھا' وہ بھی آیا' اس نے میری تصویر بنائی تھی۔ اس فنکشن کے حقوق بی بی سی کے چینل فور نے لے لیے تھے۔ ہمراز احسن نے اس جلسے کی فلم بنائی۔ ٹی وی کے لیے کوریج ریکارڈ کی تھی۔ تین گھنٹے کی فلم بنی۔ صبغت اللہ قادری کے علاوہ دوسرے مقررین نے تقریریں کی تھیں۔ زہرہ نگاہ نے کہا کہ ''میں بہت خوش ہوں کہ حبیب جالب نے کسی کو صدر تو مانا۔ میری صدارت پر وہ راضی ہوئے۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے ورنہ وہ کسی کو 'صدر' مانتے ہی نہیں ہیں۔'' وہاں کسی انگریزی' اردو اور پنجابی شاعر کے لیے اتنے سامعین اکٹھے نہیں ہوئے جتنے میرے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ یہ بات احمد فراز نے فیصل فور پر کہی۔ لندن آنے کی دعوت مجھے ہمایوں گوہر نے دی تھی جب وہ کراچی آئے تھے۔ انہوں نے مجھے فیض صاحب کی کلیات ''سارے سخن ہمارے'' (مطبوعہ لندن) پیش کی تو کہا کہ ''ہم آپ کی کلیات بھی اس طرح چھاپنا چاہتے ہیں۔ لندن میں میری کلیات کی کتابت کرائی گئی۔ کچھ اغلاط اس میں رہ گئی تھیں ان کو درست کیا گیا لیکن پھر بھی اس میں کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اپنی کلیات کی آخری شکل دیکھنے کے لیے میں دوسری بار لندن گیا تھا اور وہاں منیر ڈار کے ہاں ٹھہرا تھا جو میرے

لائلپور کے زمانے کے بڑے اچھے دوست ہیں۔ وہ پیپلز پارٹی میں ہیں۔ کلیات میں جو اغلاط رہ گئی تھیں انہیں درست کروانے کے لیے کاتب ڈھونڈا گیا۔ اس سے غلطیاں درست کروائی گئیں۔ میں نے تنہا یہ کام کیا تھا۔ ہمایوں گوہر نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کام کے لیے مہینہ یا ڈیڑھ مہینہ رہنا پڑے گا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے لندن میں ٹھہرنے کے لیے ایک علیحدہ مکان لے دیا تھا۔ حالانکہ دوست احباب میرا بہت خیال رکھتے تھے' منیر ڈار کے ہاں بھی مجھے بہت آرام تھا' لیکن کام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ علیحدہ مکان میں ٹھہرنا پڑا۔ وہاں شام کو سب دوست آجاتے تھے۔ بڑا اچھا مکان تھا' دو تین کمرے تھے۔

انگلستان کی دنیا ایک حسین دنیا ہے۔ وہاں لگتا تھا جیسے ہندوستان کی ساری دولت سنگین عمارتوں کی شکل میں نظر آرہی ہے لیکن انسانی محنت کو داد دینا پڑتی ہے۔ وہ لوگ کہاں سے چلے تھے اور کہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے ہندوستان پہ حکومت کی تھی۔ ان کے اپنے ملک میں ایک ڈیموکریٹک سسٹم قائم ہے۔ حقوق انسانی سب کو میسر ہیں۔ صفائی کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی چیز کھلے عام نہیں پھینکی جاسکتی۔ وہاں ڈسٹ بن جگہ جگہ لگے ہیں ان میں ہی بیکار چیزیں پھینکی جاتی ہیں۔ لوگوں کی ایجوکیشن اتنی ہے کہ وہ کوئی چیز نہیں چراتے۔ بڑے بڑے اسٹورز ہیں' جن میں کیمرے لگے ہوئے جو نگرانی کرتے ہیں۔ جو چیز بھی خریدنا ہو لوگ خریدتے ہیں اور کاؤنٹر پر خودکار مشینوں میں بل ادا کرتے ہیں۔ کسی ہوٹل کی کوئی چیز اگر غیر معیاری ہے تو اس کا لائسنس کینسل ہوجاتا ہے۔ کہیں ملاوٹ نہیں ہے۔ وہاں کوئی کسی کو یہ نہیں پوچھتا' کون ہو کہاں سے آئے ہو کہاں جاتا ہے؟ سب کو اپنے کام سے کام ہے۔ کوئی کسی لڑکی کو لے کر بیٹھا ہے تو کسی کو کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی۔ ایک پب میں ایک بوڑھی عورت آئی' اس نے دو پیگ پکڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک میز پر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ پیتی رہی۔ کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی اسے گھورا۔ وہ مغربی ملک ہے' اس کی کیا بات ہے لیکن ان کو دیکھ کر اپنی گندی نالیاں یاد آتی تھیں اور اپنا گندا پانی اور آلودہ فضا بھی یاد آتی تھی کہ ہم نے لوٹ کر واپس ''آنے والی تھاں'' ہی آنا تھا۔ یہ تو ہم بھول سکتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ضیاء الحق کی آمریت عروج پر تھی وہاں لوگ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے تو ہمارے جیسا آدمی وہاں پہنچ گیا تھا جس کی قید و بند کی اپنی ایک تاریخ تھی اس لیے ہماری وہاں بہت پذیرائی کی گئی۔

لندن میں میری کلیات کو غلطیاں وغیرہ لگ گئیں۔ کتاب کا ٹائٹل ایک افریقی دوست نے بنایا تھا۔ اس کی تقریب رونمائی لندن یونیورسٹی کے افرو ایشیا اسٹڈی ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ الطاف گوہر نے صدارت کی اور معروف ٹی وی کمپیئر انور مقصود نے نظامت کے فرائض بڑی خوبصورتی سے ادا کیے تھے۔ انور مقصود نے کہا کہ ''جو ادیب مرحوم ہوچکے ہیں ان کے لیے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی جائے۔'' جب ایک منٹ ہوچکا تو انہوں نے کہا کہ ''دو منٹ ان زندہ ادیبوں شاعروں کے لیے اختیار کی جائے جو'' زندہ

مردہ" ہیں۔" میری کلیات کا نام "حرف سردار" مشتاق احمد یوسفی نے تجویز کیا تھا۔ انور مقصود نے تقریر میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک سکھ سردار کو مخاطب کر کے کہا کہ "آپ اس تقریب میں شاید اس لیے ذوق وشوق سے بیٹھے ہیں کہ یہ "حرف سردار" کی تقریب ہے۔" انور مقصود نے چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے معنی پیدا کیے۔ وہ ایک نہایت ذہین آدمی ہیں۔ ان سے بہتر نظامت کے فرائض کوئی کم ہی ادا کرتا ہوگا۔ ان کی بہن زہرہ نگاہ ایک اچھی شاعرہ ہیں۔ ان کے شعر پڑھنے کا انداز بہت خوبصورت ہے اور بات کرنے کا اسٹائل منفرد ہے۔ زہرہ نگاہ نے کہا کہ "فیض صاحب کی کلیات "سارے سخن ہمارے" جب چھپی تو اسے دیکھ کر فیض صاحب کے چہرے پر جو شادابی اور طمانیت کی لہر نظر آئی تھی وہی لہر میں حبیب جالب کے چہرے پر دیکھ رہی ہوں اور جو کام باپ سے نہ ہو سکا وہ بیٹے نے کر دیا۔" (ان کا اشارہ ہمایوں گوہر کی طرف تھا) تقریب بھرپور تھی۔ حاضرین کی بڑی تعداد یہاں بھی جمع تھی۔ اتنے لوگ تھے کہ تمام ہال چھلک رہا تھا۔

یہ جو ہم نے جیلیں کاٹیں یا صعوبتیں اٹھائی تھیں اس کا صلہ لوگوں نے ہمیں اپنی محبت سے دیا ہے۔ وہاں جو ہماری پذیرائی کی گئی یہ آمرانہ نظام اور آمروں کے خلاف ایک ردعمل کا اظہار تھا۔ وہاں مجھ سے کہا گیا کہ "لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو" نظم سنائی جائے۔ میں نے کہا کہ میں یہاں "جالندھر" کا ذکر کروں گا۔ یہاں "لاڑکانہ" کی بات نہیں ہوگی کیونکہ اس سے ضیاء الحق کو فائدہ پہنچے گا۔ وہ عہد چلا گیا' اس وقت ہمارا سابقہ ضیاء الحق سے ہے اور یہاں ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے وہ فائدہ اٹھالے۔

امریکہ

لندن سے ہم امریکہ چلے گئے۔ نیویارک میں نوائے وقت کے عباس اطہر نے ہمارے لیے دو تین فنکشن Arange کیے تھے۔ ان کے بچوں نے مجھ سے بہت محبت کی۔ مجھے صبح اٹھ کر سیر کرنے کی عادت تھی' چونکہ مجھے راستے معلوم نہیں تھے۔ اس لیے ایک دو دن ان کی بیوی میرے ساتھ جاتی رہی' پھر ان کا لڑکا میرے ساتھ جانے لگا۔ میں بہت تیز چلتا تھا تو دوسرے دن عباس اطہر کا لڑکا کہنے لگا۔ "انکل! آپ بہت تیز چلتے ہیں' آپ تھکتے نہیں ہیں؟" پھر میں اکیلا جاتا رہا کیونکہ ایک ڈر بھی تھا کہ وہاں راہزن بہت ہوتے ہیں' چھین لیتے ہیں جو کچھ آپ کے پاس ہو۔ نیویارک میں عباس اطہر کے علاوہ محمود باجوہ اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ وہاں آغا سعید کے صاحبزادے آغا خالد کا برکلے یونیورسٹی میں حقوق انسانی سے متعلق پورا سرکل تھا۔ میرے اعزاز میں برکلے میں بھی تقریب ہوئی تھی۔ پورا ہال بھرا ہوا تھا بہت سارے امریکن بھی آئے تھے۔ ایک یہودی لڑکی بھی آئی اس کا مجھ سے تعارف کرایا گیا کہ وہ فلسطین کی آزادی اور اس کے قیام کے حق میں تھی اور اس کے لیے کام کر رہی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ لگاتار ڈھائی

گھنٹے تک وہ محفل رہی۔ اس میں ایک مغنیہ بھی آئی تھیں جس نے میری دو غزلیں تیار کی تھیں۔ اس کے ساتھ ایک سکھ طبلہ نواز اور ایک ہندو باجا بجانے والا تھا۔ اس نے میری غزلیں سنائیں۔

اب یہ نہیں ہوتا تھا کہ میں کوئی باقاعدہ معاوضہ طے کر کے جاتا تھا جیسے دوسرے لوگ خاص طور پر گانے والے طے کر کے جاتے ہیں۔ میرے پیش نظر تو حقوق انسانی کا کام تھا اور یہ جذبہ کارفرما تھا کہ ہم جس ملک سے آئے ہیں وہاں جمہوریت نہیں ہے۔ عدم جمہوریت اور آمریت کے خلاف پرچار کرنا ہی مقصود ہوتا تھا۔ امریکہ میں صحافیوں سے بات چیت ہوئی تو انہوں نے کہا کہ "آپ جو کچھ بھی کہیں گے وہ چھاپ دیں گے۔" میں نے ان سے کہا کہ آپ کے لوگ ہمارے عوام میں بہت غیر مقبول ہیں بلکہ آپ کی حکومت سے ہم نفرت کرتے ہیں کیونکہ یہ آمروں کو سپورٹ کرتے ہیں اور حقوق انسانی کو پامال کرتے ہیں۔ آپ لوگ اپنے ہاں جمہوریت رکھتے ہیں اور ہمارے ہاں آمریت کو فروغ دیتے ہیں۔ آمریت کے دست و بازو بنتے ہیں اور انہیں پالتے ہیں۔ میں نے امریکی صحافیوں سے کہا کہ یہ لکھیں کہ جہاں جہاں آپ آمروں کو سپورٹ کرتے ہیں وہاں کے عوام آپ کو اپنا قاتل سمجھتے ہیں اور آپ سے بے حد نفرت کرتے ہیں۔ میں نے یہ باتیں کھل کر کیں وہاں جلسوں میں بھی یہ سب کچھ کہتا رہا کیونکہ ان کے ہاں جمہوریت تو ہے آپ وہاں بات کر سکتے ہیں۔ میرے Tour اس لحاظ سے مشنری ٹور ہوتے تھے۔

امریکہ میں ہی مولانا ظفر علی خان کے پوتے نے مجھے ایک تقریب کی غرض سے اپنے ہاں بلایا۔ مجھے ایک جہاز میں بٹھا دیا گیا۔ ایک جگہ اتر کر مجھے دوسری فلائیٹ لینی تھی لیکن وہ مجھے فلوریڈا لے گیا اور میں دوسری فلائٹ نہ لے سکا۔ میں نے کہا' یہ جہاز مجھے کدھر لے جا رہا ہے؟ وہ جگہ تو جلدی آ جانا چاہیے تھی تو کسی نے کہا کہ آپ فلوریڈا جا رہے ہیں ادھر منتظمین جلسہ میرے منتظر تھے۔ میں نے شور مچا دیا کہ میں دعویٰ کر دوں گا' میرا بہت نقصان ہو گیا۔ جہاز والے بہت معذرت خواہ ہوئے انہوں نے مجھے رات کے دو بجے فلوریڈا سے واپس بھیجا اور میری دیکھ بھال کے لیے خاص طور پر ایک لڑکی میرے ساتھ لگا دی۔ تھوڑا سا مجھے اپنی غلطی کا بھی احساس ہوا کہ مجھے وہیں پوچھ لینا چاہیے تھا۔ میں چپ تھا کہ قصور اگر میرا تھا تو انہیں بھی پوچھ لینا چاہیے تھا کہ آپ کے پاس کیا ٹکٹ ہے اور آپ کدھر جا رہے ہیں۔ کچھ غلطی ان کی بھی تھی کہ انہوں نے تسلیم کی تھی اور مجھ سے زائد کرایہ کیا لینا تھا تلافی کے طور پر میزبانی کے لیے ایک لڑکی دے دی۔ بیچاری لڑکی ہر پانچ دس منٹ بعد آ کر پوچھتی کہ "کوئی چیز چاہیے؟" اس کو خواہ مخواہ مصیبت پڑی ہوئی تھی۔ وہ خوبصورت سی میزبانی تھی جس میں مہربانی بھی تھی اور اس نے مجھے چپ کرا دیا۔ اس نے میری خدمت کی میرا خیال رکھا۔ مجھے اس نے دوسرے جہاز میں بٹھا دیا' میں نے اس حسین میزبان کا شکریہ ادا کیا اور بیس ڈالر اس کو دیئے۔ وہ نہیں لے رہی تھی' میں نے اس کے

ہاتھ میں دے دیئے اور کہا کہ تم نے مجھے راستہ دکھایا اور تم نے میری خدمت بھی کی ہے' منزل مقصود کی طرف لے آئی ورنہ پتہ نہیں میں کدھر چلا جاتا۔'' آدھا مجرم میں تھا اور آدھے مجرم وہ تھے۔

جب میں رات کو وہاں پہنچا تو مولانا ظفر علی خان کی بوڑھی ہمشیرہ بیٹھی ہوئی تھیں' انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''صاحب ہمارا تو بڑا نقصان ہو گیا۔ سب لوگ چلے گئے ہیں۔'' کچھ لوگ وہاں موجود تھے' زیادہ تر گھر کے لوگ ہی رہ گئے تھے۔ میں بے پناہ تھکا ہوا تھا۔ میں نے ان سے کہا' میرے ساتھ تو یہ کچھ ہوا...... اور پھر بچے کھچے حاضرین جلسہ کو کچھ سنایا۔ مولانا ظفر علی خان کی باتیں کیں اور اپنا فرض ادا کیا۔ دوسرے دن انہوں نے مجھے کار میں بٹھا کر واپس نیویارک پہنچا دیا۔ عباس اطہر نے مجھ سے پوچھا کہ ''کیا سلوک ہوا؟'' میں نے کہا' یہ ہوا۔ انہوں نے پوچھا' کچھ لیا دیا؟ میں نے کہا کہ میں نے تو ان سے نہیں کہنا تھا کہ مجھے کچھ دو۔ عباس اطہر کہنے لگے کہ ''میں تو انہیں خط لکھوں گا کہ تم لوگوں نے شور تو اس قدر مچایا ہوا تھا کم از کم دو تین ہزار ڈالر دے کر تو بھیجتے۔'' میں نے اس سے کہا' بھائی میں قوال تو نہیں ہوں کہ جا کر مطالبہ کروں۔ میرا کام تو اعزازی ہی ہوتا ہے۔ کسی نے اپنی خوشی سے دے دیئے تو لے لیے' خط وغیرہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے اسے روکا کہ مولانا ظفر علی خان کے پوتے سے کوئی بات نہ کرنا' وہ تو میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور آغا سعید کا لڑکا ہمارا دوست ہے اس کو بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عباس اطہر ان کے رویے سے بہت ناخوش تھا۔ میں نے کہا' جانے دو یہ تاثرات جو ہم یہاں چھوڑ کر جاتے ہیں جو ہمارا نقش لوگوں کے دلوں میں رہ جاتا ہے۔ اس سے ہماری عزت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مشتاق یوسفی نے کہا تھا کہ ''حبیب جالب یہاں آیا' وہ کوئی ایسی بات کوئی ایسا نقش چھوڑ کے نہیں گیا جس سے اس کی عزت میں کمی واقع ہوئی ہو' وہ نہایت ادب کے ساتھ گھروں میں رہا' خواتین کا احترام ملحوظ خاطر رکھا۔'' اب شاعر ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آپ تہذیب و شائستگی کا خیال نہ کریں' آپ پر کوئی حدود و قیود نہیں ہیں۔ پھر ہم تو حقوق انسانی کے لوگ ہیں۔ ہم عورتوں کے حقوق کے نگہدار بنتے ہیں۔ ہم ایسا کوئی نقش دیار غیر میں بھی نہیں چھوڑ سکتے جس سے ہمارے ملک کی عزت پامال ہو۔ اس لحاظ سے دیار غیر سے بڑا مطمئن واپس آیا تھا۔

کینیڈا

کینیڈا میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ قلعہ گوجر سنگھ کے شریف صاحب جو ہماری پارٹی کے ہیں۔ ان کے صاحبزادے کا میں وہاں مہمان تھا۔ ٹورنٹو بہت خوبصورت جگہ ہے۔ کشادہ اور کھلی جگہیں' مکانوں کے ارد گرد بھی گراؤنڈز ہیں' آدھا کینیڈا آباد ہے اور آدھا آباد نہیں ہے۔ وہاں کا پانی بہت صحت افزا ہے۔ اس لیے وسکی کینیڈا کے پانی سے ہی بنتی ہے۔ مجھے پتھر بھی شیشہ ہی نظر آئے۔ فلک

بوس عمارتیں۔ایک بلڈنگ کو دیکھ کر لگتا جیسے ہمارے ملک کے ایک سال کا بجٹ اس پر خرچ آیا ہو۔ پانچ پانچ اور چھ چھ سڑکیں ایک دوسرے پر لہراتی ہوئیں' ان کے فن تعمیر سے انسانی محنت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے کمالات جھلک رہے تھے۔ وہاں میرے اعزاز میں ایک مشاعرہ ہوا۔ سلیم شاہد اور احمد فراز بھی تھے۔ فراز کا تو پہلے سے وہاں آنا جانا تھا۔ میں تو پہلی بار گیا تھا۔ اس لیے بینر پر ''حبیب جالب کے نام ایک شام'' جلی حروف میں لکھا تھا اور ان کے نیچے نام چھوٹے حروف میں لکھے ہوئے تھے' اس پر احمد فراز بڑا ناخوش و نالاں ہوا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم چونکہ پہلے بھی یہاں آ چکے ہو اس لیے تمہارا نام چھوٹے حروف میں لکھا گیا ہے۔ تمہیں خوشی نہیں ہوئی تو مجھ سے پہلے آ کر اپنا نام بڑے حروف میں لکھوا لیتے' شاعروں میں ایسی حسد ہوتی ہے۔ ہمارا مسئلہ تو یہ تھا کہ ہمیں ''عوامی شاعر'' کا خطاب فیض صاحب دے گئے تھے۔ ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ ایک دوسرے بڑے نیشنل شاعر نے ہمیں یہ خطاب دیا ہے۔

احمد فراز

کینیڈا میں کراچی کے ایک دوست نے ہوٹل بنایا تھا۔ اس نے دعوت دی۔ میں نے کہا' احمد فراز سے بھی کہہ دیں۔ اس نے فراز سے بھی کہا اور ہم اس کے ہوٹل میں چلے گئے۔ اتفاق سے اس نے ہمارے سامنے ''جانی واکر'' رکھ دی۔ فراز صاحب کہنے لگے ''میں یہ نہیں پیتا' یہ میری توہین ہے۔ میں تو بلیک لیبل پیتا ہوں۔'' میں نے کہا ''صاحب' یہ ہوٹل ہے میں یہاں شراب تو نہیں بیچتا' تم ویسے ہی ہمارے ساتھ ایک دو گھونٹ پی لو۔'' کہنے لگا' نہیں نہیں۔ اور چلا گیا۔ وہاں لوگ بیٹھے یہ سب کچھ سن رہے تھے۔ میں نے اپنے میزبان کا اکیلے ہی ساتھ دیا دو پیگ پی لیا اور اس سے معذرت چاہی کہ میں فراز کے ساتھ ہی ٹھہرا ہوا ہوں اور آ کر کار میں بیٹھ گیا۔ کار میں احمد فراز نے مجھ سے کہا ''دیکھا میں نے اسے کیسے ڈانٹا ہے۔'' میں نے کہا' تم نے بیہودگی کی ہے۔ ادھر تم نیشنل شاعر بنتے ہو اور ادھر ایک پیگ کے لیے لڑتے ہو' کیا فائدہ ایسا نیشنل شاعر بننے کا' یہ تم نے میری توہین کی ہے۔ وہ میرا دوست ہے اس نے محنت سے پیسہ کما کر یہ ہوٹل بنایا ہے اور تم ایک پیگ کے لیے خوار ہو رہے ہو۔ یہ بیہودگیاں ایسی ہیں جو اس قسم کے شاعروں کو کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی شاعرانہ عظمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ نہیں ہوتا ہے۔ فیض صاحب جیسا آدمی جنہوں نے کسی کے ساتھ تختی کے ساتھ بات کم ہی کی ہوگی وہ بھی ان لوگوں سے نالاں رہتے تھے۔ میں نے احمد فراز سے کہا کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا ہے کیونکہ جب ہم ملک سے باہر آتے ہیں تو ملک کے سفیر ہوتے ہیں ہماری ہر حرکت کا نوٹس لیا جاتا ہے اور وہ لکھی جاتی ہے۔

کینیڈا میں ہی مشاعرہ تھا' جو اس کے منتظم تھے ان کے والد صاحب سے میری بحث ہوگئی۔ وہ پروضیاء الحق تھا۔ یہ بحث احمد فراز نے ہی کرادی تھی' بات اس نے شروع کی۔ میں نے اس کا ساتھ دیا اور بات آگے بڑھ گئی۔ اب بحث میں سخت الفاظ بھی ادا ہو گئے اور یہ بیچ میں سے نکل گیا۔ مجھے اس کا تعارف ہی نہیں کرایا کہ یہ منتظم مشاعرہ کا باپ ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ میرے میزبان کے والد ہیں تو میں نے ان سے معذرت کی کہ زیادتی ہوگئی ہے۔ یہ تو احمد فراز ادھر لگا کے خود کھسک گیا ہے۔

احمد فراز نے وہاں ہر جگہ میرے گھٹنے ہی پکڑے رکھے کہ "اپنے مصائب کا ذکر مت کرنا مجھے ہی کرنے دو۔" اور وہ کرتا رہا اپنے بارے میں کہتا رہا کہ "میں جیل میں رہا ہوں۔ فوج مجھے پکڑ کے لے گئی تھی۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھی تھی۔ یوں کر دیا تھا' ووں کر دیا تھا۔" میں نے سوچا' ٹھیک ہے کہنے دو جو یہ کہتا ہے۔ لوگ تو مجھے جانتے ہی ہیں۔ ان کی تو جلا وطنیاں بھی بڑی "خوبصورت جلا وطنیاں" تھیں۔ وہاں انہوں نے جلا وطن رہ کر بڑے مزے لوٹے ہیں۔ یہاں سب سے پہلے لوٹ آئے اور خوب فائدے اٹھائے۔ میں نہیں کہتا' یہ اچھے شاعر نہیں ہیں۔ اچھے شاعر ہیں مگر ان کا جھوٹ بولنا سوہان روح ہے۔ لندن میں کتاب کی رونمائی کی تقریب تھی۔ میں سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ احمد فراز کہہ رہا تھا کہ "میں نے بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔" اور مجھے دیکھ کر کہا کہ "جالب نے بھی اٹھائیں۔" میرے ساتھ شہرت بخاری بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا' اپنا ہی ذکر کر لیتا تو اچھا تھا' اسے "جالب نے بھی" کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک جگہ مجھے سید محمد جعفری کے لڑکے نے بلایا تھا۔ احمد فراز کہنے لگا' میں بھی جاؤں گا۔ اسے معلوم تھا کہ کہنے کی کیا ضرورت تھی وہ مجھے ہی بلا رہے ہیں کیونکہ میں وہاں پہلی بار گیا تھا۔ لوگ مجھے دیکھنا اور سننا چاہتے تھے۔ یہ تو وہاں پہلے سے ہی تھا۔ اس کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ ان سے فلاں فلاں ڈیمانڈ کی جائے کہ وہ ہمیں دے دیں ورنہ میں تمہیں ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے تو سید محمد جعفری کے لڑکے نے بلایا تھا لیکن اب میں نہیں جاؤں گا کیونکہ تم نے جو کچھ کہا ہے کہ ان کے سامنے مطالبات پیش کروں تو میں یہ نہیں کر سکتا اس لیے نہیں جاؤں گا۔ اب منتظم مشاعرہ کے ٹیلیفون افتخار عارف کو آ رہے تھے کہ ہم نے صرف حبیب جالب کو ہی بلایا ہے وہ کسی کے سہارے نہ آئیں' خود آئیں۔ میں نے کہا کہ میں اس کے ساتھ نہیں جا سکتا یہ اب اکیلے ہی مشاعرہ بھگتائے۔ شمیم احمد خان بھی میرے ساتھ تھا' میں نے اس کے سامنے ہی یہ بات کہی تھی۔

ہائیڈ پارک

شمیم احمد خان پیپلز پارٹی کے ڈپٹی اسپیکر تھے۔ میں ان کے ساتھ ایک دن لندن کے ہائیڈ پارک میں بھی گیا۔ میں نے اس پارک میں یہ منظر دیکھا کہ مختلف خیال کے لوگ تقاریر کر رہے ہیں۔ لوگ سن رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ مقرر حضرات خدا کو بھی نہیں

بحث رہے۔ ملکہ کے خلاف بھی بول رہے ہیں۔ کسی کو بھی نہیں بخش رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف لگے ہوئے ہیں۔ کہیں ایک عورت کھڑی ہے وہ مردوں کے خلاف تقریر کر رہی ہے اور لڑکیاں اس کو سن رہی ہیں۔ ایک جگہ ایک افریقی لڑکا عورتوں کے ہم جنسی تعلقات بیان کر رہا ہے۔ ایک جوڑا اسے بھی سن رہا ہے۔ وہ افریقی لڑکی سے کہتا ہے کہ "تم اس کے ساتھ کیوں کھڑی ہو یہ تو شکل سے ہیجڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس سالے ہیجڑے کو لیے پھر رہی ہو۔" ایک طرف کمیونسٹ بھی تقریریں کر رہے ہیں۔ مذہبی لوگ بھی ہیں۔ ایک جوڑا ایک افریقی لڑکی اور لڑکے سے بحث کر رہا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ "ہم لوگ یہودی ہیں ہم خدا کی منتخب تخلیق ہیں اور تم کیا ہو؟" وہ کہہ رہا ہے کہ "تم نے جو ہٹلر کا حشر دیکھا' تمہارا بھی وہی حشر ہوگا۔" وہ افریقی لمبا تھا۔ اس کے چہرے تک ہاتھ نہیں جا سکتا تھا' اس لیے دوسرا شخص ہوا میں ہاتھ لہرانے لگا۔ وہاں قریب ہی پولیس بھی کھڑی تھی۔ کسی نے بھی گریبان پر ہاتھ ڈالا تو وہ پولیس فوراً آ جاتی تھی۔ وہاں یہ قانون ہے کہ بحث کرو' لڑائی کرو چاہے گالی دو لیکن ہاتھ پائی نہیں ہو سکتی۔ یہ نوبت وہ نہیں آنے دیتے۔ لوگوں کو بھی اس کا احساس ہے کہ ہماری حدود کہاں تک ہے اور ہمارا ہاتھ کہاں تک جانا چاہیے۔ ہائیڈ پارک میں ہی ایک تنہا آدمی اسٹول پر کھڑا تقریر کر رہا تھا۔ اس کو سامعین نہیں ملے تھے۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے شمیم احمد خان سے کہا کہ اسے پوچھو تمہیں سامعین کی ضرورت ہے تو ہم سے خطاب کرو' ہم تمہاری گفتگو سننا چاہتے ہیں۔ شمیم احمد خان نے اس سے کہا۔ "تم ہمیں اپنے سامعین سمجھو۔" وہ کہنے لگا۔ "میں تمہیں درخورِ خطاب ہی نہیں سمجھتا۔" اس نے ہماری پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ ہم وہاں دو تین گھنٹے پھرتے رہے۔ تقریریں سنتے رہے اور اس آدمی کو سٹول پر تنہا کھڑے دیکھا۔ جب دوبارہ اس سے سامنا ہوا تو اس نے ہمیں بہ نگاہِ قہر ہی دیکھا۔ مجھے وہ غالب کے شعر کی تفسیر ہی لگا کہ

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ناروے

لندن کے قیام کے دوران سارے انگلستان اور سکنڈے نیوین ممالک کو پتہ چل گیا تھا کہ حبیب جالب آئے ہوئے ہیں۔ ہمارے ایک دوست سعید انجم جو سوشلسٹ پارٹی کے رکن ہیں' وہ ناروے میں رہتے ہیں۔ اس نے مجھے اوسلو بلانے کا اہتمام کیا۔ اوسلو بہت اونچے مقام پر ہے۔ وہ بہت خوبصورت جگہ ہے اور وہاں کے لوگ بھی بہت خوبصورت ہیں۔ ایک حسین نوجوان لڑکی نے مجھے روک کر پوچھا۔ "آپ سگریٹ پیتے ہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "نہیں پیتا۔" میرا جی چاہا یہ حسین لڑکی مجھ سے سوال ہی کرتی

رہے اور میں اسے جواب دیتا رہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی جس کے باعث میں نے سگریٹ چھوڑ دیے تھے۔ اس لڑکی کو بڑی حیرت ہوئی کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ وہ ایک حسین چہرہ تھا۔ ڈیموکریٹک ملکوں کی فضا کا بھی حسن ہوتا ہے جو لوگوں کے چہروں سے عیاں ہوتا ہے۔ سعید انجم نے میرا تعارف وہاں کے صحافیوں سے بھی کرایا کہ میں نے آمرانہ حکومتوں میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ صحافیوں نے اخبارات میں میرے بارے میں نصف نصف صفحات کی رپورٹیں شائع کیں۔ ٹی وی پر بھی مجھے کوریج دی گئی۔ انڈیا سے مالک رام اور رام لعل بھی آئے ہوئے تھے۔ میرے اعزاز میں ایک بڑا جلسہ بھی منعقد ہوا' وہاں بھی لوگ اتنے آئے کہ پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ سعید انجم کی بیوی پڑھی لکھی اور کلچرڈ خاتون ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت عزت دی اور میرا ہر طرح سے خیال رکھا۔ سعید انجم مجھے وہاں سے سویڈن لے گیا۔ لائلپور کے میاں اکرم کے بھائی وہاں رہتے ہیں۔ وہاں بھی ایک محفل ہوئی اور مشاعرہ بھی ہوا۔ سٹاک ہالم بہت خوبصورت شہر ہے۔ پانی میں بنا ہوا یہ شہر دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انسانی طاقت کی آسمان تک رسائی بھی ہے اور پانیوں میں اس نے شہر آباد کر دیے ہیں۔ پہاڑ کاٹ کر نئی بستیاں بنا دی ہیں۔

ایمسٹرڈیم

امریکہ سے آتے ہوئے میں ایمسٹرڈیم رکا تھا۔ وہاں اسد مفتی رہتے ہیں جو بہت اچھے شاعر اور سیکولر ذہن کے آدمی ہیں۔ اس کے ساتھ بھی ہماری بہت پرانی یادیں وابستہ ہیں۔ جب مشرقی پاکستان پر فوج کشی ہو رہی تھی تو یہاں ایک اسٹوڈیو میں اسد مفتی نے علی الاعلان مخالفت کی تھی۔ ریاض شاہد بھی وہاں موجود تھا۔ لوگ اسد مفتی کو مارنے دوڑے تھے۔ یہاں پر اکثریت تو رجعت پسندوں کی ہے۔ وہ رجعت پسند فعل کو ہی سپورٹ کرتے ہیں اور بعد میں پچھتاتے بھی ہیں۔ ایک دفعہ فلم والوں نے ولی خان کے خلاف بھی جلوس نکال دیا تھا۔ اس پر میں نے گیارہ سال تک فلم کا بائیکاٹ کیے رکھا۔ اب ولی خان حکومت کے ساتھ بیٹھے ہیں اور یہ لوگ ان کے خلاف جلوس نہیں نکالتے۔ اسد مفتی نے کہا تھا کہ "یہ فوج کشی غلط ہے' بنگالی کا حق اسے ملنا چاہیے تھا وہ نہیں دیا گیا اس لیے بنگلہ دیش بن جائے گا۔" لوگ اس کو مارنا چاہتے میں نے اور ریاض شاہد نے اس کو بچایا تھا' لوگوں سے ہم نے کہا کہ یہ اس کی رائے ہے۔ اس کو برداشت کرو۔ اسد مفتی بڑا نفیس آدمی ہے۔ ہالینڈ میں ہی مقیم ہے ان کی بیگم وہیں کی ہیں۔ انہوں نے میرے لیے وہاں بہت اہتمام کیا تھا۔ وہاں کچھ پیپلز پارٹی کے لوگ بھی تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ برف باری ہو رہی تھی۔ وہاں ایک تقریب میں میری دو گھنٹے تک پرفارمنس ہوئی تھی۔ میں اکیلا ہی ہوتا تھا۔ ایک دو آدمی باتیں کر کے بیٹھ جاتے تھے پھر میں اور سامعین ہوتے تھے۔ اسد مفتی نے ہماری بہت پذیرائی کی تھی۔ ان کے صحافیوں کے ساتھ بھی تعلقات تھے۔ انہوں نے میرے اعزاز میں ہونے والی تقاریر کی کوریج

کی تھی۔

سوہن سنگھ جوش ایوارڈ

ایمسٹرڈیم سے میں لندن آ گیا۔ وہاں مجھے سوہن سنگھ جوش ایوارڈ ملا تھا۔ جس کی تقریب میں مجھے شامل ہونا تھا۔ سوہن سنگھ جوش پنجاب کے بہت بڑے کمیونسٹ لیڈر تھے شاعر تھے اور جوش تخلص کرتے تھے پنجابی ایسوی ایشن لندن کے سیکرٹری شیر جنگ رام جی جو پنجابی کے بہت اچھے ادیب ہیں انہوں نے مجھے اس ایوارڈ کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہاں کوئلوں کی کانوں کی یونین کا صدر بھی آیا ہوا تھا۔ مجھے اسٹیشن پر کچھ دیر ہو گئی تھی وہ مجھے ایڈز ٹیسٹ کے لیے لے گئے تھے کیونکہ میں امریکہ سے آیا تھا۔ میں ٹیسٹ کرا کے جب دو گھنٹے بعد اس تقریب میں پہنچا تو لوگ بڑی شدت کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ میرے پہنچنے پر وہ خوش ہو گئے۔ ساؤتھ ہال میں یہ تقریب تھی۔ مجھے ایک شیلڈ لال پٹکا اور پچیس پونڈ (یہ ایک نذرانہ ہوتا ہے) دیا گیا۔ میں نے انہیں کچھ اشعار وغیرہ سنائے۔ یہ اعزاز مجھے ملا کہ سوہن سنگھ جوش ایوارڈ دیا گیا۔ ایشین کمیونٹی لندن کے جمیل چشتی نے بھی میرے لیے ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا اور مجھے جمہوریت ایوارڈ سونے کے تمغے کی صورت دیا تھا۔ اس تقریب میں برطانیہ کے ایک ممبر پارلیمنٹ بھی آئے تھے۔ سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ وہاں میری کچھ کتابیں بھی رکھی گئیں جو لوگوں نے خرید لی تھیں۔

برمنگھم

برمنگھم میں افضل بنگش کی صاحبزادی رہتی ہیں۔ ان کے شوہر ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے مجھے وہاں بلایا تھا اور میری کتابوں کی رونمائی کی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ افضل بنگش جب ہماری پارٹی چھوڑ گئے تو میں نے ولی خان سے کہا کہ ایک اچھا منتظم چلا گیا جو ہمیں رات کو سلا کے جاتا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ ولی خان نے کہا تھا کہ فکر نہ کرو ہم ایک اور منتظم پیدا کر دیں گے۔ پھر پیر محمد خان کو انہوں نے اس ڈیوٹی پر لگایا۔ وہ ہمیں سلانے کا بندوبست کرتے اور ہمارے مزاج کے مطابق ہمارے ناز اٹھاتے تھے۔ ولی خان اس لحاظ سے فراخ دل تھے کہ کبھی ہمارے ذوق وشوق کے رستے میں حائل نہیں ہوئے تھے۔ ان کے بھائی غنی خان تو ہمارے ہم مشرب ہیں۔ برمنگھم میں افضل بنگش کی بیٹی نے میری بڑی پذیرائی کی۔ میری صدارت میں وہاں ایک مشاعرہ بھی ہوا تھا۔ قتیل شفائی کے داماد نے بھی میرے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا تھا۔ اس میں بھی سیاسی ورکرز اور لیڈروں نے شرکت کی تھی۔ میرے اعزاز میں ہونے والی ان تقریبات میں لوگوں کی بھاری تعداد میں شرکت کے پس پشت یہ جذبہ کارفرما تھا کہ وہ لوگ پاکستان اور جمہوریت کی کوششوں کو

کامیاب دیکھنا چاہتے تھے۔ گلاسگو میں بھی رہا صبح سیر کرنے روزانہ جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں واپس گھر آتے ہوئے رستہ بھول گیا تو ایک انگریز نے میری مدد کی تھی وہ اپنے تمام کام چھوڑ کر مجھے گھر چھوڑنے آیا تھا۔ اس طرح لندن میں مجھے جاتے ہوئے پیشاب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی مجھے جگہ کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ میری انگریزی بھی واجبی سی ہے۔ میں نے ایک انگریز لڑکی سے "یورین" کا لفظ کہا تو اس نے ٹائلٹ کا راستہ بتا دیا۔ اب وہ ناراض بھی ہو سکتی تھی لیکن وہ اپنا کام چھوڑ کر مجھے مطلوبہ جگہ پر پہنچا گئی میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

برطانیہ

بعض اوقات کہیں اکیلے جانا پڑتا یا رستہ بھول جاتا تو بڑی مشکل پیش آتی تھی لیکن وہاں لوگ فوراً تعاون پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ رستہ بھول گیا۔ میں سڑک پر کھڑا تھا۔ میرے سامنے سے دو آدمی گزر گئے۔ تیسرا بندہ گزر گیا' چوتھا گزر گیا۔ میں رستہ پوچھنے کے لیے انگریزی کا جملہ بنا رہا تھا جو بن نہیں رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔ تیز بھاگنے سے جملہ بن پایا۔

I have to go Edward Road, where is station?

کبھی کبھار جملہ بنانے میں دیر بھی ہو جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ مجھے رستے بھی ازبر ہونا شروع ہو گئے۔ ٹیوب میں بیٹھتا اور پکاڈلی پہنچ جاتا تھا۔ وہاں سے ذرا آگے ہمایوں گوہر کا دفتر تھا۔ جہاں میں تمام جگہوں پر ٹیلیفون کر لیا کرتا تھا۔ مانچسٹر میں بھی میرے لیے دو فنکشن ہوئے تھے۔ ظہور الدین بٹ ہمارا الکلپورکا پرانا یار تھا' بڑا Democratic ہے۔ اس کے والد جمال الدین بٹ عوامی لیڈر تھے اور سہروردی کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ ظہور بٹ نے لندن میں ہمارے دو فنکشن کروائے تھے اس کے توسط سے اور بھی تقریبات ہوئی تھیں۔ لندن میں وہ ہمارے ساتھ ساتھ رہا۔ اس نے پوری یاری نبھائی۔ ہر دوسرے تیسرے دن ان کا ہمارے یہاں آنا جانا رہا۔ لندن میں سردار مظہر علی خان پیپلز پارٹی والے (جو پہلے NAP میں ہوتے تھے) رہتے ہیں۔ ان کے ہاں شیخ رشید بھی ٹھہرتے تھے۔ ان کی بیگم بہت کلچرڈ اور نفیس خاتون تھیں۔ انہوں نے ہمیں بہت اچھے اچھے پکوان کھلائے۔ وہ دال مسور بہت اچھا پکاتی تھیں۔ یہ دونوں میاں بیوی ہمیں اپنی کار میں برمنگھم لے کر گئے۔ بہت سارے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

ایف ڈی فاروقی انگلستان میں بہت اہم آدمی ہیں۔ وہ بریڈ فورڈ میں رہتے ہیں۔ ان کو یہ شوق ہے کہ پاکستان کے ہر اہم سیاست دان کو اپنے ہاں مہمان ٹھہرائیں اور ان کی خدمت کریں۔ ولی خان بھی ان کے ہاں آ کر رہے ہیں اور بہت سارے لوگ اور بھٹو کے دوست ان کے مہمان ہوئے ہیں۔ ان کے گھر ان سب کی تصویریں بھی لگی ہوئی ہیں۔ میں بھی ان کا مہمان ہوا تھا۔ ......

وہاں سے وہ ایک پرچہ "اجالا" بھی نکالتے ہیں۔ جس میں انہوں نے مجھے بھی اعزازی سا عہدہ دے رکھا ہے۔ ان کی شاید وہاں کارپٹ کی دکان ہے۔ انکے بچے بھی بڑے مخلق اور ملنسار ہیں۔ ایک محفل کا تذکرہ کیا کریں۔ جہاں بھی جاتے تھے سارا شہر امڈ آتا تھا۔ کوئی یادداشت نہیں رکھی۔

جب ہم ائیر پورٹ پر اترتے تھے تو وہاں کمپیوٹر لگے ہوتے تھے' جن میں یہ ریکارڈ ہوتا تھا کہ یہاں آنے والا پہلے کتنی بار آ چکا ہے اور اس کا مکمل ڈاٹا ہوتا ہے۔ وہ یہاں تک بتا دیتے تھے کہ آپ ایک مشہور شاعر ہیں۔ وہاں کمپیوٹر بھی سچ بولتا ہے۔ جب ہم آخری بار لندن گئے تو مجاہد بریلوی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہمایوں گوہر کو اطلاع نہیں ہوئی تھی کہ ہم آ رہے ہیں اس لیے وہ ہمیں ائیر پورٹ پر ملنے نہیں آئے۔ ہم بہت پریشان تھے لیکن یہ حوصلہ تھا کہ شہر کے لوگ ہمیں جانتے ہیں۔ کسی کے ہاں بھی چلے جائیں گے۔ پھر ایف ڈی فاروقی بریڈفورڈ سے آ گئے تھے۔ انہیں کسی نہ کسی ذریعے سے پتہ چل گیا تھا کہ ہم آ رہے ہیں۔ ان کے ہاں بھی میرا پروگرام طے ہوا تھا۔ فاروقی صاحب ہمیں اپنی کار میں بریڈفورڈ لے گئے۔ ایف ڈی فاروقی اتنا معقول آدمی ہے کہ اس پر انگلستان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے اندر وہی مشرقی محبوبیت ہے' جسے اس نے برقرار رکھا ہوا ہے' یہ اس کا کمال ہے۔ بریڈفورڈ میں اسے ایک ثقہ اور سنجیدہ آدمی سمجھا جاتا ہے۔ بریڈفورڈ سے آگے وہ مجھے ایک جگہ لے کر گیا۔ بڑی حسین جگہ تھی۔ وہاں چھوٹی چھوٹی باریں ہیں دریاؤں اور نہروں کے کنارے ہیں۔ بہت خوبصورت مناظر جیسے لینڈ اسکیپ ہوں۔ کوئی کسی کو نہیں چھیڑتا نہ ہی تنگ کرتا ہے۔ آپ آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ آپ کے ساتھ والی میز پر بیٹھا ہوا اپنی دنیا میں مگن ہے۔ وہاں کوئی پریشان نہیں کرے گا جب تک آپ اسے نہیں چھیڑیں گے۔ ہم نے جو پابندیاں خود پر لگائے رکھی ہیں وہاں بھی لگائے رکھیں۔ مناظر دیکھنے کے علاوہ ہمیں یاد نہیں کہ ہم کسی کی دل شکنی کر کے آئے ہیں۔ اس بات کا اعتراف وہاں کے لوگوں نے بھی کیا ہے۔

ماسکو

روس میں رائٹرز ایسوسی ایشن نے ہمیں روس کا دورہ کرنے کا دعوت نامہ بھیجا۔ ان دنوں میں میو ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ سردی بے پناہ تھی' میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے سوچا پھر وہاں جانے کا چانس شاید نہ ملے اس لیے یہ موقع کھونا نہیں چاہیے۔ اس میں ہمارے کسی دوست کی سفارش بھی نہیں تھی۔ رائٹرز کا ایک وفد ہمیں لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ انہوں نے ہمیں لینن گراڈ کے ایک بڑے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ ہماری مترجم ایک بہت اچھی پیاری اور کلچرڈ خاتون تھیں' اسے اس بات کا ادراک تھا کہ یہ آدمی بیمار ہے۔ وہ ہر روز میری پوچھ گچھ کرتیں اور بار بار پوچھتی "ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں ہے۔" ہاتھ پکڑ کے اٹھاتی تھیں۔ ہاتھ پکڑ کے سیڑھیاں اتارتا

اور پھر کار میں بٹھاتا اور ہمیں پھر ''دوشنبے'' لے کر جاتا جہاں مولانا عبدالرحمن جامی ۵۷۵ ویں سالگرہ کا جشن تھا۔ مولانا جامی فارسی میں حافظ کے بعد بہت بڑے شاعر تھے۔ انہیں ''خاتم الشعر'' کا لقب ملا ہے۔ روس میں جہاں جہاں فارسی سمجھی جاتی ہے۔ وہ بہت پاپولر ہیں۔ دوشنبے میں ان کا بت بھی نصب کیا جاتا تھا میں اس تقریب میں موجود تھا' اخبارات میں میری تصویریں بھی چھپی تھیں لیکن مشاعرے میں حصہ نہیں لے سکا' کیونکہ میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔ بیمار تو پہلے سے ہی تھے۔ اس لیے مشاعرے میں نہ جاسکا۔

سمرقند بھی گئے۔ وہاں امام بخاری کے مزار پر حاضری دی۔ ان کے مقبرے میں قرآن مجید کے پرانے نسخے رکھے ہوئے تھے۔ وہاں ایسی کوئی فضا نہیں ملی کہ کوئی بھیک مانگ رہا ہے۔ لوگ آجا رہے ہیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ثمرقند میں ہی امیر تیمور لنگ کے مزار پر بھی گئے۔ وہاں کے مدرسے بھی دیکھے۔ ان کی اونچی اونچی دیواروں پر نقاشی اور سونے کا کام دیکھ کر امیر تیمور کے ذوق کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ عجائبات تھے۔ ان مدرسوں میں عبدالرحمن جامی بھی پڑھتے رہے تھے۔ امیر تیمور آدھی دنیا فتح کر چکا تھا۔ وہ جب کسی جگہ کو فتح کر کے آتا تھا تو اس کی یاد میں ایک مدرسہ بنواتا تھا۔ وہ دنیا کو فتح کرنے کے ساتھ ساتھ علم کو بھی فتح کرتا جاتا تھا۔ اس آدمی کا علم کی دنیا میں بڑا احترام ہے۔ اس علاقے کے باشندوں کا لباس اسلامی طرز کا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

اس وقت ثمرقند کے حسن کا عالم کیسا ہوگا کہ حافظ جیسا شاعر معشوق کے سیاہ تل پر ثمرقند اور بخارا کو قربان کر رہا ہے۔ وہ خوبصورت جگہیں تھیں' اس کا اندازہ ان کے آثار دیکھ کر ہوا۔ ہم پھر ماسکو میں آ گئے۔ ماسکو کے رائٹرز سے ملاقاتیں ہوئیں' تقریبات بھی ہوئیں۔ رائٹرز کو دیکھا تو یوں لگا وہ ہمارے یہاں کے سہگلوں اور ولیکاؤں کی قسم کے لوگ تھے۔ ان کی زندگی اور کھانے پینے سے یہی جھلکتا تھا۔ ثمرقند میں ایک ڈنر کے بعد کچھ رقاصائیں مغنی اور گانے والیاں بھی آئیں۔ ایک خاتون جو رقص کر رہی تھی' اس کو اشارہ کیا گیا کہ حبیب جالب کو بھی اٹھاؤ' اس نے مجھے اٹھایا۔ یہ سب دیکھ کر دل کچھ پریشان بھی ہوا کہ یہ لوگ کہاں پہنچ گئے ہیں۔ ان کے رائٹرز کو بھی وہ تمام سہولتیں اور آسائشیں حاصل تھیں جو متمول لوگوں کو دستیاب ہوتی ہیں۔ ہم اپنے آپ کو دیکھ کر شرمندہ ہی ہو رہے تھے لیکن یہ خوشی بھی تھی کہ یہاں رائٹرز کی قدر تو ہے۔ ہم اپنے آپ کو دیکھ کر شرمندہ ہی ہو رہے تھے لیکن یہ خوشی بھی تھی کہ یہاں رائٹرز کی قدر تو ہے۔ ماسکو میں عبدالرحمن جامی کے جشن ولادت کے سلسلے میں آخری تقریب تھی۔ میں ماسکو بھاگم بھاگ اس ہوٹل میں پہنچا جہاں یہ فنکشن ہو رہا تھا۔ میں نے ہوٹل میں ہی جامی کے لیے ایک نظم لکھی۔ ثمرقند میں بھی میری پرفارمنس نہیں ہوئی تھی۔ وہاں میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ سانس میری ٹھیک نہیں تھی۔ رائٹرز ایسوسی ایشن کے ایک اہم عہدیدار نے مجھے بتایا کہ اس نے مجھے لاہور

میں حنیف صاحب کی صدارت میں ہونے والے مشاعرے میں سنا تھا اس نے یہ بھی کہا کہ ''آپ نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔'' یہ میرے لیے حیران کن انکشاف تھا۔ بہرکیف میں نے جو نظم عبدالرحمن جامی پر لکھی تھی' وہ سنائی۔ مجھے وہ خاتون مترجمہ مل گئی جس نے فیض صاحب پر بھی مضمون لکھا تھا۔ وہ اردو کی ادیبہ ہیں۔ نوجوان' حسین' خلیق اور سلیقہ شعار' تمام محاسن اس میں تھے۔ اس کے ساتھ اردو میں ہی گفتگو ہوئی۔ وہ بے عیب اور گرامر کے مطابق کتابی اردو بولتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ تم نے تو کمال کر دیا ہے تم بہت اچھی اردو بولتی ہو۔ کہنے لگی۔ ''تم میری اتنی تعریف نہ کرو کہ میں پانی پانی ہو جاؤں اور اس میں ایک طوفان آ جائے پھر میں اس میں ڈوب جاؤں۔'' اس روسی لڑکی نے اتنی اچھی اردو بول کر مجھے برباد کر دیا۔ وہ حکیم سعید کو بھی جانتی تھی۔ میں جب واپس آیا تو حکیم محمد سعید کے پاس بھی گیا اور اس سے کہا کہ اس نے تمہیں سلام بھیجا ہے' کہنے لگے کہ وہ تمہیں کہاں ملی ہے۔'' میں نے کہا' میں روس گیا تھا۔ میں نے حکیم محمد سعید سے کہا کہ میرا علاج کرو شاید میں تم سے ہی ٹھیک ہو جاؤں اس نے میرا علاج کیا لیکن میں ٹھیک نہ ہوا۔ اس روسی لڑکی نے میری نظم کا روسی زبان میں ترجمہ کیا۔ میں اردو میں ایک ایک شعر پڑھتا جاتا' وہ ترجمہ کرتی جاتی تھی' لوگوں نے بہت داد دی۔ میں نے اپنی نظم سنانے سے پیشتر مولانا عبدالرحمن جامی کے دو تین اشعار فارسی کے سنائے جو ٹو دی پوائنٹ تھے۔ میرا امزاج ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہے اسی لیے میں نے وہ اشعار سنائے تھے۔ مولانا عبدالرحمن جامی کے بیالیس ''آثار ادبی'' ہیں۔ ان کی فارسی زبان میں مثنوی ''یوسف زلیخا'' بہت پاپولر ہے۔ علم نجوم سے لے کر علم عروض تک ہر موضوع پر انہوں نے بیالیس کتابیں لکھی ہیں۔ یوں ہی انہیں ''خاتم الشعرا'' کا خطاب نہیں ملا ہے۔ امیر خسرو کی طرح ان کی موسیقی پر بھی بڑی گہری نظر ہے انہیں۔ تال' سر' شعر و حکمت' فلسفے اور نجوم کا گہرا ادراک حاصل تھا۔ جو لوگ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ وہ اپنے بل پر زندہ رہتے ہیں۔ بڑی ہی محنت' ریاضت جانکاہی اور تندہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ رات دن ایک کرنے پڑتے ہیں۔ پھر کوئی ان کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو آسمانوں کو چھوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور کام کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں بلکہ ان میں ڈوب جاتی ہیں۔

ہم روس مہمان کی حیثیت سے گئے تھے۔ ہمارے ذہن میں اس کا جو نقشہ تھا وہ یہی تھا کہ اس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا' اس کا Impact ہندوستان یا پاکستان کے لوگوں پر رہے گا۔ روس میں کچھ Bureaucratic Attitude زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ اس خیال کو زیادہ پھیلایا نہیں جا سکا۔ اس لیے یہ مضبوط نہیں ہوا۔ کوئی نظریہ فلاپ نہیں ہوتا' اس کے چلانے والے فلاپ ہوتے ہیں۔ اب بھی دنیا میں دو ہی نظام ہیں ایک Capitalistic' دوسرا Socialistic- وہ جو Capitalistic ہیں وہ بھی اپنے طور پر فلاحی مملکتیں بنانے کی طرف جا رہے ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ عدم مساوات اور عدم تحفظ موجود ہے۔ انسان کو مکمل حقوق نہیں

میسر نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں تو آغاز ہی نہیں ہوا۔ یہاں بھی جمہوریت نہیں آئی۔ اب تک ہم جمہوریت کی جنگ لڑ رہے ہیں' ماسکو یا روس میں تبدیلی اگر ڈیموکریٹک ہے تو بہتر ہے کیونکہ وہاں کے آئین میں ایسی گنجائش تو موجود تھی۔ ہمارے بنیاد پرست بغلیں بجا رہے ہیں کہ "ہم نے انہیں حق دلا یا دیا ہے۔" ان کا آئین اجازت دیتا تھا اس لیے بغلیں بجانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

پژمردگی گل پہ ہنسی نہ ہنسو اتنی

آواز دی خزاں نے تو بھی نظر میں ہے

اگر وہاں کی ریاستیں آزاد ہو سکتی ہیں تو پاکستان کی ریاستیں بھی آزاد ہو سکتی ہیں۔ یہاں کے صوبے بھی مکمل آزادی کی طرف جا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں تو یہ سب ہو رہا ہے۔ ہم نے تو تمام زندگی جمہوریت کے لیے جنگ کرتے ہوئے گزاری ہے۔ اب سیکولر دنیا پھیل رہی ہے۔ تاجکستان والے نے بھی کہہ دیا ہے کہ ہم مذہب کو کاروبار حکومت میں نہیں رکھیں گے۔ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے۔ امریکہ' برطانیہ' فرانس' روس اور چین سب کے اندر تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ ہم کسی جزیرے میں نہیں رہتے۔ یہ دنیا "دوڑ پیچھے کی طرف" نہیں جا رہی بلکہ آگے کی طرف جا رہی ہے۔ ستاروں کو چھو رہی ہے' پاتال کو چھو رہی ہے۔ تبدیلیاں ضرور آتی ہیں اور تجربات بھی ہوتے ہیں۔ آئندہ پانچ سات سال میں وہ کہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ آئی اے رحمن جو ہمارا دوست ہے' ہماری روز دعوت کرتا تھا۔ اس نے ہمیں مہینہ رکھا تھا اب اس نے بھی ہم سے کہا کہ "میں آپ کو ایک وقت کا کھانا کھلا سکتا ہوں۔ میرے ہاں گنجائش نہیں ہے۔" میں سمرقند میں ایک دن اکیلے ہی بازار میں نکل گیا۔ زبان تو مجھے آتی نہیں تھی' وہاں ایک ہوٹل تھا کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کھانا منگوایا تو ایک بڑے پیالے میں گوشت اور ایک روٹی کا ٹکڑا میرے سامنے لا کر رکھ دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ یہ پچاس روبل کا کھانا ہوگا۔ میرے پاس دو ڈھائی سو روبل تھے میں نے اس عورت کو یہ تمام روبل پیش کر دیے۔ اس نے ایک روبل اٹھایا' باقی واپس کر دیے۔ پھر میں وہاں اولمپیا یونیورسٹی میں گیا۔ اسٹوڈنٹس سے ملا۔ افضل بنگش کی صاحبزادی بھی وہاں پڑھتی ہیں۔ ہمارے چوہدری فتح محمد کی لڑکی بھی وہاں تھی جو ڈاکٹری کر چکی ہیں۔ نور محمد چوہان کے لڑکے بھی وہاں تھے۔ مجھے وہاں تقریباً ۸۰ طالب علم ملے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "آپ کے بچے روس میں پڑھنے کے لیے کیوں نہیں آئے۔ ہم تو آپ کا نام لے کر یہاں آئے ہیں۔" میں نے ان سے کہا' یہ اطلاع بھی آپ نے مجھے دی ہے' وہاں کے لوگوں نے نہیں دی۔ ایک ہندو لڑکی تھی اس کا نام سنیتا تھا۔ میں نے اپنی نظم کا پہلا مصرع پڑھا۔

"ظلمت کو ضیا' صرصر کو صبا' بندے کو خدا کیا لکھنا"

اس نے دوسرا مصرع پڑھ دیا۔

''پتھر کو گہر دیوار کو در کرگس کو ہما کیا لکھنا''

سیتا کی زبان سے سن کر میں بہت حیران ہوا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے یہ نظم کہاں سنی تھی؟ کہنے لگی۔ ''ہمارے ہاں دہلی میں کمیونسٹ پارٹی کا دفتر ہے وہاں ایک کامریڈ روز یہ نظم گا کر سنایا کرتا تھا۔ میں نے بھی یاد کرلی۔'' میں نے طالب علموں سے کہا کہ ہمارے بزرگ آپس میں لڑتے ہیں تم جلدی سے آؤ تو ہم بزرگوں کو بستر ے کروا دیں' چار پائیاں بچھا دیں ان کے سامنے حقے دھر دیں اور انہیں کہیں تم یہاں بیٹھو۔ تمام بچے بہت خوش ہوئے۔ آنند بھون میں سیتا کے منگیتر سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہاری منگیتر سے ملاقات ہوئی تو اس نے میری وہ نظم سنائی تھی جو تم گایا کرتے ہو۔ جہاں جہاں ہمارے ہم خیال ہیں وہ ہمیں اچھی طرح جانتے ہیں۔

ماسکو ریڈیو والے بھی آئے تھے انہوں نے میرا انٹرویو ٹیپ کیا تھا۔ اوکاڑہ کے کامریڈ سلام کی بچیاں بھی وہاں تھیں۔ بے حد مخلص ہیں۔ اہوں نے میرا بڑا احترام کیا۔ مجھے تمام ماسو میں لیے لیے پھریں۔ کیو اسٹیشن پر جو پینٹنگز آویزاں تھیں' بہت اعلیٰ معیار کی تھیں۔ انکے رنگ دل میں اترتے جاتے تھے۔ تمام اسٹیشن ان خوبصورت تصویروں سے سجے ہوئے تھے۔ مجھے وہاں رہنے کو بہت کم وقت ملا لیکن ماسکو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں عام آدمی اور سرمایہ دار آسانی کے ساتھ رہ سکتے ہیں اور جہاں سرمایہ داری کا جنازہ نکلا۔ یہ وہ جگہ تھی جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور تمام عالم کو ایک نظریہ دیا کہ بادشاہتیں اور یہ دوسرے نظام انسانوں کی فلاح کے لیے نہیں ہیں۔ اب ہم کہیں کہ اسلام ہے تو جب تک اسلام کو پریکٹس میں نہیں لائیں گے' ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ اس کے کیا فوائد ہیں۔ سوشلزم' کمیونزم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا لیکن اس کا قیام تو ہوا اور وہ عمل میں بھی آیا۔ اگر اب وہ نہیں رہا' پہلے تھا تو سہی اتنے برس پریکٹس میں بھی رہا۔ اسلام کا معاشی نظام کہاں ہے؟ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہیں ہے۔ مولویوں کو بغلیں نہیں بجانی چاہئیں کہ روس سمٹ گیا ہے' روس کا نظام برباد ہو گیا ہے۔ تباہ ہو گیا ہے۔ انہیں اپنی شکل وصورت دکھانی چاہیے کہ متبادل نظام اسلام کا یہ ہے کہ اور ہم اس سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ اب آپ کہیں کہ پاکستان میں اسلام کا نظام رائج ہے تو یہ غلط ہے کیونکہ لوگ مہنگائی سے تنگ ہیں۔ صحت اور تعلیم سے بے بہرہ ہیں' انصاف سے محروم ہیں' پولیس کا جبر ہے۔ یہاں حقوق انسانی ہی میسر نہیں ہے۔ میں نے ایک نظم لکھی تھی۔

جو پہنو ہم کو پہناؤ پھر اسلام کی بات کرو
گھر گھر جیون دیپ جلاؤ پھر اسلام کی بات کرو
کوٹھی میں کتالوں کی اور نیچے ایک بچارو بھی
ہم کو سائیکل ہی دلواؤ پھر اسلام کی بات کرو
دیکھو تو کچھ رہ بھی گیا ہے اپنے دیس خزانے میں
کھاؤ لیکن تھوڑا کھاؤ پھر اسلام کی بات کرو
نبی اکرم ﷺ کے گن گانا جشن منانا بجا مگر
کچھ تو ان کا رنگ دکھاؤ پھر اسلام کی بات کرو
اپنی تنخواہیں نہ بڑھاؤ اے خود غرض نمائندو
آٹے دال کا بھاؤ گھٹاؤ پھر اسلام کی بات کرو
سفر کریں پی آئی اے سے لوگوں کے بس کی بات نہیں
ڈاکوؤں سے ریلوں کو بچاؤ پھر اسلام کی بات کرو
توڑو یہ کشکول گدائی' اترو قرض کی سولی سے
امریکہ سے جان چھڑاؤ پھر اسلام کی بات کرو

دوسرے صوبے پنجاب کی بیوروکریسی کی دھونس سے متنفر ہیں۔ سندھ کا علاقہ کیسے پاکستان سے ملحق رہ سکتا ہے۔ جب کوئی سندھی جرنیل ہی نہیں' بلوچی بھی جرنیل نہیں ہے تو پھر اسلام آباد ان کو کھلتا ہے' ان کو زہر لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اقتدار میں شامل نہیں ہیں۔ ان کے اوپر خوف کی تلوار لٹکی ہوئی ہے۔ البتہ اقتدار میں پٹھان ضرور شامل ہیں۔ ولی خان اس لیے اہم آدمی ہو جاتا ہے کہ فوج میں بھی اس کے لوگ موجود ہیں۔ اس لیے وہ حکومت میں اپنے حق کے لیے موجود ہیں۔ ہم سیاسی اخلاقیات کی جوبات کرتے ہیں اس کے تحت ہم ولی خان سے متفق نہیں ہیں کہ ہمیں جس رستے پر لگایا گیا تھا' وہ تو مکمل جمہوریت کا تھا۔ باچا خان کہتے تھے کہ "تم سیاسی لوگ ہو ہم تمہارے ساتھ متفق نہیں۔ جو تعمیر کی بات کرے گا' ہم اس کی بات سنیں گے۔" جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ یہاں دفن نہیں ہوا' جلال آباد میں دفن ہوا ہے تو یہ بھی اس کی ایک ادا تھی کہ جہاں سامراج کے سائے مسلط ہیں اس نے اس سرزمین میں دفن ہونا پسند نہیں کیا۔ بقول

اجمل خٹک ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس طرح باچا خان پاکستان اور افغانستان کے درمیان پل کی شکل بن گیا ہو۔'' باچا خان ساری زندگی سامراج کے خلاف لڑتا رہا۔ افغانستان میں بھی اس نے امریکہ کا ساتھ نہیں دیا۔ اپنے نقطہ نظر کے مطابق اس نے امریکہ کی سوچ کو غلط ہی قرار دیا تھا۔ اس لڑائی کو باچا خان افغانوں کی آپس میں لڑائی کہہ کر کہتا تھا کہ آپس میں صلح کرلو۔ یہ جو تمہاری پشت پناہی کر رہے ہیں' یہ ایک دن تمہیں چھوڑ جائیں گے۔ تمہیں لڑوا کر برباد کردیں گے اور اب تک وہ جنگ ختم نہیں ہورہی ہے۔ وہ جنگ اب تک کس کی جنگ رہی' پہلے بھی مسلمان ہی مرے تھے' امریکن کوئی نہیں مرا۔ چند ایک روس کے لوگ مرے اور زیادہ بھی افغان مرے ہیں۔

دبئی

دبئی میں ہمارے ایک دوست سلیم جعفری ہیں۔ ایک اعتبار سے وہ ہمارے عزیز بھی ہیں۔ ایشیاٹک آپٹیکل کے فضل حسین کے بھائی کے وہ داماد ہیں۔ سلیم جعفری نے مجھے کئی خطوط لکھے اور دبئی بلانے کی کوشش کی تھی لیکن پاسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے وہاں نہ جا سکا۔ ایک بار پاسپورٹ ملا تو دبئی جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ ہمیں ائیرپورٹ پر ہی روک لیا گیا تھا۔ وہاں مشاعرہ تھا۔ جمیل الدین عالی' جون ایلیا اور مجاہد بریلوی بھی جارہے تھے۔ مجھے روکا گیا تو مجاہد بریلوی نے بھی جانے سے انکار کردیا۔ ہم نے ہائیکورٹ میں رٹ کی تو پھر دوسری بار جانے میں کامیاب ہوگئے۔ جنرل ضیاءالحق کا زمانہ تھا۔ ملک سے باہر جو لوگ تھے وہ خوفزدہ ہی تھے' پھر بھی ہمارے اعزاز میں ہونے والی تقریب میں کافی Gathering ہوگئی تھی۔ دبئی میں ایک فوٹوگرافر علی ارشد رہتے ہیں۔ انہوں نے بہت سارے فنکاروں کو سونے کے تمغے دیئے تھے۔ انہوں نے دلیپ کمار کو بھی سونے کی تلوار دی تھی۔ انہوں نے مجھے سونے کا تمغہ اور عربی لباس تحفے میں دیا تھا اور اس لباس میں فریدہ خانم کو بھی میرے ہاتھوں ایوارڈ دلوایا تھا۔ سلیم جعفری کا یہ خیال تھا کہ شاعر حضرات جو مشاعروں میں آتے ہیں' ان کو سیر کرادینا ہی کافی ہوتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے اکثر شعراء کو بغیر معاوضے کے ہی بلایا تھا مگر جب وہ ہمیں خط لکھا کرتے ہیں تو اس میں بڑی حوصلہ افزا باتیں لکھا کرتے تھے کہ ہم آپ کی سب سے زیادہ خدمت کریں گے لیکن وہاں پہنچے تو ان کا رویہ قطعی مختلف تھا' وہ ہمیں سیر پر ٹرخا دینا چاہتے تھے اور یہ بات ہمیں منظور نہیں تھی۔ دبئی میں ہمارے کچھ صحافی دوست بھی تھے۔ ''خلیج ٹائمز'' کے ایڈیٹر سلیم عاصی جو آج کل کراچی پریس کلب کے صدر ہیں اور احسان ایڈووکیٹ تھے۔ جب انہیں یہ کیس معلوم ہوا کہ سلیم جعفری ہمیں سیر پر ٹرخا رہے ہیں تو انہوں نے اس پر دباؤ ڈالا۔ انہوں نے جو ہمارے مشاعرے کے ٹکٹ بیچے تھے۔ اس میں سے کچھ معاوضہ ہمیں دے دیا' جو ہماری توقع کے مطابق تو نہیں تھا لیکن ہمیں نقصان

بھی نہیں ہوا۔ یہ تجربہ ضرور ہوا کہ پہلے معاہدہ کر کے ہی جانا چاہیے۔ بیرونی ممالک میں اکثر جگہوں پر ہم مایوس ہوئے کیونکہ ہم پیشہ ور شاعر تو نہیں نہیں اس لیے زیادہ دکھ نہیں ہوا۔ دبئی کے دورے میں صحافیوں نے ہماری بہت پذیرائی کی اور دوسرے لوگ بھی ہم سے ملنے کے لیے آئے اور ہمیں تحائف وغیرہ دیئے۔

میں ضرور آؤں گا اک عہد حسیں کی صورت
دکھ میں ڈوبے ہوئے دن رات گزر جائیں گے
کوئی تحقیر کی نظروں سے نہ دیکھے گا ہمیں
پیار کے رنگ ہر اک سمت بکھر جائیں گے
پیار اگائے گی نگاہوں کو سکوں بخشے گی
یہ زمیں خلد بریں کی صورت
میں ضرور آؤں گا اک عہد حسیں کی صورت

ایسے الفاظ نہ اوراق لغت میں ہوں گے
جن سے انسان کی توہین کا پہلو نکلے
ایسے افکار بھی زندہ نہ رہیں گے جن سے
چند لوگوں ہی کی تسکین کا پہلو نکلے
خوں نہ روئے گا کبھی درد کی تنہائی میں
دل کسی خاک نشیں کی صورت
میں ضرور آؤں گا اک عہد حسیں کی صورت

کسی لہجے سے نہ مجروح سماعت ہو گی
جہل کے ناز اٹھانے نہ پڑیں گے ہم کو
یاس انگیز اندھیرا نہ کبھی چھائے گا

آس کے دیپ بجھانے نہ پڑیں گے ہم کو
غم کے ماروں کی ہر اک شام چمک اٹھے گی
صبح فرخندہ جبیں کی صورت
میں ضرور آؤں گا اک عہد حسیں کی صورت

آنے والا زمانہ ہے تیرا
تیرے ننھے سے دل کو دکھوں نے
میں نے مانا کہ ہے آج گھیرا
آنے والا ہے تیرا

تیری آشا کی بگیا کھلے گی
چاند کی تجھ کو گڑیا ملے گی
تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے
ختم ہو گا ستم کا اندھیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

درد کی رات ہے کوئی دم کی
ٹوٹ جائے گی زنجیر غم کی
مسکرائے گی ہر آس تیری
لے کے آئے گا خوشیاں سویرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

سچ کی راہوں میں جو مر گئے ہیں

فاصلے مختصر کر گئے ہیں
دکھ نہ جھیلیں گے ہم منہ چھپا کے
سکھ نہ لوٹے گا کوئی لٹیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

◆◆◆